هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُم مَّا فِی الْأَرْضِ جَمِیْعا (سورہ البقرہ۔آیت 29)

اللہ وہ ہے جس نے اس زمین کی تمام پیداوار و وسائل کو تم سب انسانوں کے لیے مشترکہ طور پر پیدا کیا۔

THE ECONOMIC SYSTEM OF QURAN

قرآن کا معاشی نظام

دنیا سے غربت و افلاس ختم کرنے کا قرآنی نسخہ

معاشی ناہمواریاں دور کرنے کے سخت احکامات پر مشتمل خدا کا وہ حقیقی دین جسے روزِ ازل سے انسان انسان سے چھپاتا رہا، لیکن خدا برابر اسے نازل کرتا رہا۔

FIRST EDITION

ALQURANIC POWER

فہرستِ ابواب

	پیش لفظ	
1	ملکیت کا قرآنی تصور	8
2	معاوضہ اور اس کی مختلف صورتیں	44
3	قرآن کے معاشی نظام کا قیام: ریاست کا کردار اور ایمان کے حقیقی تقاضے	60
4	زیادہ سے زیادہ کمانے کے بعد کم سے کم پاس رکھ کر باقی ضرورتمندوں کو دے دینے کا قرآنی جذبہ محرکہ اور انسانی ذات کی نشوونما کے اصول	74
5	پستی سے بلندی تک: (قرآنی نظام کے قیام تک سفر کے مختلف مراحل)	89
6	انفرادی سے اجتماعی زندگی تک سفر کے دوران افراد کی ذہنی تربیت کے لیے قرآنی ہدایات	123
7	الرباء اور زکوٰۃ (مروجہ نظریات اور قرآنی مفہوم)	144
8	اللہ کے دشمن: ملوکیت، سرمایہ داریت اور مذہبی پیشوائیت (شیطانی مثلث)	163
9	عہدِ رسالت ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں ملکیتِ اراضی کا نظام	188
10	ملکیتِ زمین کا تصور اور ہمارے علماء کرام کے اعتراضات	217
11	قرآن کے معاشی نظام کے شواہد خارجی کائنات سے	228
12	قرآن کا معاشی نظام بالآخر قائم ہو کر رہے گا۔	240
13	ایک اور قارون۔۔۔۔۔۔۔قرآن کے نام پر قرآن دشمنی	252
	منتخب کلام	354

رنگ و نسل ،مذہب اور قومیت سے بالاتر ہوتے ہوئے

یہ کاوش

دنیا بھر کے ان بھولے اور بے خبر غرباء و مساکین کے نام

جو اپنی مفلسی اور محرومی کو اپنی تقدیر اور ''خدا کی تقسیم'' سمجھتے ہوئے صبر کے ساتھ فاقہ کشی پہ مجبور ہیں اور اس کائناتی حقیقت سے لاعلم ہیں کہ غریبی اور مفلسی انکی قسمت نہیں بلکہ انکے رزق کے لٹیرے اور عالمگیر وسائلِ زمین کے چور (سرمایہ دار اور اسکی دستِ راست مذہبی پیشوائیت) کی عیاری و مکاری کا پھیلایا ہوا ایک جال اور فریبِ نفس ہے۔

پیش لفظ

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے۔اپنے رزق کے سرچشمہ یعنی ماں کے دودھ کی جانب لپک کر جاتا ہے۔اور جب یہ اس دنیا میں اپنا آخری سانس لیتا ہے،تب بھی اس کے منہ میں کچھ ڈالا جاتا ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ توانائی مل سکے۔اور جب انسان اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ''جی اس کا رزق ختم ہو گیا تھا''۔

پس رزق کا مسئلہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی پہلی سانس سے آخری سانس تک کسی بھی لمحہ لاتعلق نہیں رہ سکتا۔یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔انسانی عمر اسی رزق کے انتظام میں گزر جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو با آسانی اور با افراط کھانے پینے کو مل جائے،اسکی زندگی بڑی خوشحال اور کامیاب سمجھی جاتی ہے۔وہ خود بھی اپنی ہر ایک سانس میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ ''اس نے اسے روٹی کے لیے کسی کا محتاج نہیں کیا''۔ایسے شخص کی ہر کوئی عزت کرتا ہے۔اور جو بیچارہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے،غربت وافلاس میں گزارہ کرے،اسے اکثر ناکام یا نااہل تصور کیا جاتا ہے۔لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہ تو انفرادی زندگی کا احوال ہے۔اگر ہم بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں تو تاریخ اقوام عالم ایسی جدوجہد، جنگ و جدل اور لڑائیوں سے بھری پڑی ہے جن میں سب سے بڑا جذبہ محرکہ رزق تھا۔اقوام عالم کے درمیان شروع دن سے جو باہمی نزاع وکشمکش موجود رہی ہے،اس کی وجوہات بنیادی طور پر معاشی ہیں۔تہذیبوں کا تصادم،مذاہب کی لڑائیاں،انبیاء کرام کا مفاد پرستوں سے تصادم اور دور حاضر کی عالمی کشمکش،ان سب کے پیچھے معاشی محرکات کارفرما رہے ہیں۔

ازمنہ قدیم میں فارس وروم کا دنیا پر تسلط،نمرود وفرعون کی بادشاہت،مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین لڑی جانیوالی صلیبی جنگیں،دو عالمی جنگیں،مختلف ممالک کے درمیان ہونے والی لڑائیاں،پھر ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کا ڈرامہ اور اسکی آڑ میں عراق اور افغانستان جیسی سونے کی چڑیاؤں پر استعماری قبضہ،بلوچستان کی جانب بڑھتے ہوئے خونی استعماری ہاتھ۔۔۔۔الغرض ہر مسئلہ،جنگ،جھڑپ،تصادم اور کشمکش کی ظاہری وجہ خواہ کچھ بھی بتائی جائے یا نظر آئے،اسکی اندرونی

اور بنیادی وجہ عالمی وسائل رزق پر قبضہ کا خواب ہے۔جو استعماری قوتیں روزِ ازل سے دیکھتی چلی آئی ہیں۔اور جس مقصد کے لیے خدا کے بھیجے ہوئے دین کو مٹا دیا جاتا تھا اور صحائفِ آسمانی میں ردو بدل کر کے انہیں دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جاتا تھا۔

آج انسان انسان سے سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے۔مفاد پرستیاں اور ہوس اپنے عروج پہ پہنچ چکی ہے۔ہمدردی،رحمدلی اور ایثار و اخوت کے جذبات اب شاید قصہ پارینہ بن چکے ہیں اور نئے دور میں نا قابلِ عمل سمجھے جا رہے ہیں۔اس پرفتن دور میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ سسکتی اور بلکتی ہوئی انسانیت کے زخموں پہ ایک موثر مرہم رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے اس دین کی پھر سے تجدید کی جائے جو قرآن کی کامیاب حفاظت کے باوجود روایات کی شکل میں انسانیت کی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔

ویسے تو روز ازل سے معاشی مسئلہ انسانی زندگی کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے ساتھ چلا آ رہا ہے،لیکن دورِ حاضر میں اس نے زیادہ ہی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ہر جانب وسائلِ رزق پر قبضہ کے لیے کشمکش جاری ہے۔دو عالمی طاقتیں امریکہ اور سوویت یونین جن کا باہمی اختلاف بھی معاشی نظام کا تھا،ایک عرصہ تک دنیا میں سرد جنگ میں الجھی رہنے کے بعد افغانستان میں برسرِ پیکار ہوئیں اور امریکہ نے سوویت یونین کو تباہ کر ڈالا۔اسکی وجہ بھی معاشی تھی۔کہ دنیا سوشلزم کی جانب نہ مڑ جائے اور سرمایہ داریت یونہی بے لگام آگے چلتی جائے۔لیکن پھر بھی دنیا بھر میں شعور اجاگر ہو رہا ہے،خصوصاً قرآن کے معاشی نظام کی روشنی آہستہ آہستہ دنیا بھر میں پھیل رہی ہے اور سرمایہ داریت کے ایوانوں کو اس سے شدید خطرات لاحق ہیں۔

اسلام کا دعویٰ ہے کہ یہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل لیے ہوئے ہے۔اسی دعویٰ کے پیشِ نظر سب سے پہلا اور اہم ترین سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے انسان کا روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کیا نظام پیش کیا ہے؟ ہماری مذہبی پیشوائیت اس سوال کا جواب دینے سے مکمل طور پر قاصر ہے۔اس کی بجائے وہ سرمایہ داری نظام کو ہی اسلامی کہہ کر پیش کرتے نظر آتے ہیں جس میں رزق کے انبار لگانا عین جائز ہے۔

یہ دعویٰ درست نہیں۔اور یہ کتاب بھی اسی مقصد کے لیے تحریر کی گئی ہے کہ واضح کیا جا سکے کہ اسلام انسان کا روٹی کا مسئلہ حل کرتا ہے یا نہیں۔اگر اسلام نے اس مسئلہ کا یہی حل پیش کرنا تھا جو ہماری مذہبی پیشوائیت بتاتی ہے تو پھر اس دین کے انسان کی نجات کا ضامن ہونے اور قرآن کے ''خیر (یعنی فلاح ہی فلاح) ہونے کا دعویٰ تو محلِ نظر قرار پاتا ہے۔

ہم جب انسان معاشی مسئلہ کے حل کے لیے مذہب (انسانوں کا خودساختہ مذہب) سے رجوع کرتے ہیں تو مذہب یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا ہے کہ ''میرا مقصد تو انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔اس دنیا کے مسائل سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔یہ دنیا مادی ہے۔کثافت وغلاظت کی آماجگاہ ہے۔اس لیے خدا کے نیک بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں۔اور جہاں تک ہو سکے،اس سے بھاگیں۔

لیکن مذہب کی یہ بات بھی کھلا دھوکا ہے۔انسان دنیا سے کتنا ہی دور کیوں نہ بھاگے،وہ جب تک زندہ ہے،اسے بھوک پیاس لگتی رہے گی،یہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بسیرا بھی کر لے تو روٹی کے مسئلہ سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔کھائے پیے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔بھوک امیروں کو بھی لگتی ہے اور غریبوں کو بھی۔دنیا داروں کو بھی لگتی ہے اور ملاؤں کو بھی۔پیروں فقیروں کو بھی لگتی ہے اور ان کے مریدوں کو بھی۔صوفیوں،ولیوں کو بھی لگتی ہے اور انکے پیروکاروں کو بھی۔'' چنانچہ مذہب کا یہ کہنا کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی سروکار نہیں،محض فریبِ نفس اور حقائق کو جھٹلانے والی بات ہے۔مذہب کے نمائندوں اور مذہبی پیشوائیت کو انسان کی روٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔اس لیے نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام تو دوسرے لوگ کرتے ہیں۔اگر خود کچھ کرنا پڑے تو پھر دیکھیں یہ مذہب،یہ خانقاہیں،مدرسے، مسجدیں اور مزارات کہاں جاتے ہیں اور ان حضرات کا کیا بنتا ہے۔

اسلام مذہب نہیں،بلکہ دین ہے۔یہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے اور جو ضابطہ حیات پیش کرتا ہے،وہ انسانی زندگی کے چپے چپے کی رہنمائی کا مدعی ہے۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام انسان کی روٹی کے مسئلہ کا حل پیش نہ کرے؟ یہ انسانوں کو بھوکا پیاسا مرتا دیکھتا رہے۔قرآن کریم ن اس مسئلہ سے آنکھیں بند نہیں کیں۔اس نے اس مسئلہ کو پوری اہمیت دی ہے،بلکہ سچ پوچھیں تو تمام اسلامی عبادات ہی اس معاشی نظام کے گرد گھومتی ہیں۔اسلام کا مقصد ہی انسان کو معاش کی فکروں سے آزاد کر کے اسے اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کے ذریعہ اس دنیا کے حسن میں اضافہ کرنے اور انسانیت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے اور یوں اگلی زندگی کے لیے اپنی ذات کو ارتقاء کی بلندیوں پر پہنچانا ہے۔

قرآن کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے،اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو،سمجھو اس پہ اللہ کا انعام ہے۔اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو،اس پر اللہ کا قہر ہے۔سورہ نحل میں ہے کہ:وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (سورہ النحل۔آیت 112)۔خدا تمہیں ایک مثال دے کر بات سمجھاتا ہے کہ:

مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَداً مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّهِ فَأَذَاقَهَا

(سورہ النحل۔آیت 112)

ایک بستی تھی جو نہایت امن واطمینان کی حالت میں تھی۔اسے کھانے پینے کا سامان خوب مل رہا تھا۔لیکن اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی (یعنی غلط استعمال کیا)۔

تو اس جرم کی پاداش میں:

فَأَذَاقَهَا اللّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُواْ يَصْنَعُون (سورہ النحل۔آیت 112)

اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔اور یہ سب انکے اعمال کا نتیجہ تھا۔

مذہبی حلقوں میں عموماً اس قسم کے فقرے سننے میں آتے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ اللہ کے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیے، جو ایسا نہ کرے، اس پہ اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔لیکن اگر ایسی باتیں کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں آگ میں وہ گناہوں کا مزہ چکھتا رہتا ہے۔

موت کے بعد جنت اور جہنم سے انکار ممکن نہیں، لیکن قرآن میں اللہ نے اپنے قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تو اسی دنیا میں عذاب بتایا ہے۔وہ کہتا ہے کہ:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكا (سورہ طٰہٰ۔آیت 124)

جو کوئی میرے قوانین سے روگردانی کرے گا، اسکی روزی تنگ ہو جائیگی۔(یعنی وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو جائیگا)۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کے قوانین ونظام حیات ترک کرنے کا نتیجہ رزق کی تنگی اور بھوک وافلاس ہے۔اور یہ سزا انفرادی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر اقوام کو دی جاتی ہے۔

اسی طرح ہمارے مذہبی حلقے اکثر یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو عذاب میں ڈالتا ہے، انہیں طرح طرح کے

مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔وہ روٹی، کپڑا اور مکان سے محروم رہتے ہیں، مفلسی و تنگدستی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔وہ اس دنیا میں بڑی ہی بدحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن ان کی آخرت اتنی ہی خوشگوار اور کامیاب ہوتی ہے۔ان کا اجر آخرت میں ہے۔

لیکن قرآن اس تصور کی بھی سختی سے تردید کرتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ بات اگر چہ درست ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مثلاً جنگی حالت اور قحط وغیرہ۔اس میں تو بڑی بڑی خوشحال قومیں بھی مبتلا ہو جایت ہیں۔لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں، جو آتے اور گزر جاتے ہیں۔لیکن مفلسی اور بدحالی اگر کسی قوم کا معمول بن جائے تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خدا کے نیک بندے نہیں، وہ نظام دین سے سرکشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ یہ دنیا تو چند روزہ ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، وہاں ہی ساری خوشیاں ملیں گی۔اس لیے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ ''جو ہمارے قوانین سے روگردانی کرے گا، اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی''، اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ:

وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى (سورہ طٰہٰ۔آیت 124)

اور ہم اسے قیامت کے روز بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوانین خداوندی اور دین کے نظام کو ترک کر دینے کا نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی دونوں صورتوں میں برآمد ہوتا ہے۔

دور حاضر میں ہم مسلمان زیادہ تر مذہبی پیشوائیت کے زیر اثر ہیں جو ہمارے سامنے اسلام کی درست تصویر نہیں آنے دیتے۔کیونکہ اس سے انکے مفادات کو شدید زک پہنچتی ہے۔لیکن معاشی مسئلہ اتنا سنگین ہو چکا ہے کہ اس کا دینی حل بھی لوگوں کے سامنے لانا ناگزیر ہو چکا ہے۔

دور حاضر میں جہاں غربت و افلاس نے جگہ جگہ ڈیرے ڈال رکھے ہیں، لوگوں کو اسلام کی ایک غلط تصویر دکھا کر صرف پوجا پاٹ پہ لگا کر خود ساری دنیا کے وسائل پہ قبضہ کیا جا رہا ہے، لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں، ہر جگہ اندوہناک مناظر اور کہانیاں ہمیں غمزدہ کیے ہوئے ہیں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر لائی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اسلام انسان کا روٹی کا مسئلہ کس خوبی سے حل کرتا ہے اور اسے معاشی فکر سے آزاد کر کے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور فلاحی

استعمال کرنے پہ زور دیتا ہے۔قرآن اس معاملہ میں خاموش نہیں۔اس نے ایک ایسا نظامِ معیشت پیش کیا ہے جو آج تک دنیا بھر کے دانشور اور مفکرین تخلیق نہ کر پائے۔یہ نظام اس کرہ ارض کو ہر ذی روح کے لیے جنت بنانے کی ضمانت دیتا ہے۔بدقسمتی سے اس نظام کو انسان شروع دن سے انسان سے چھپاتا رہا ہے۔لیکن خدا بھی برابر اسے نازل کرتا رہا۔حتیٰ کہ اس دین اور نظامِ معیشت پر مشتمل آخری ہدایت نامہ (قرآن) مکمل ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کا ذمہ بھی اسی نے لیا۔اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کونسا نظام منتخب کرتا ہے۔دین کے اس نظام پر عمل انسانیت ہی کے مفاد میں ہے اور اسے ترک کیے رکھنے کا بھیانک نتیجہ بھی انسان ہی بھگتے گا۔

یہ کتاب اسی نیک مقصد یعنی قرآنی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے تحریر کی گئی ہے تاکہ سرمایہ داریت کے خون آشام پنجوں میں جکڑی ہوئی مظلوم انسانیت کو اس درندے سے نجات کے لیے الہامی ضابطہ حیات اور اسلامی نظامِ معیشت سے روشناس کرایا جاسکے۔انہیں اس غلط فہمی سے نکالا جائے کہ مفلسی اور خوشحالی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔اور اس دنیا کی خوشگواریاں مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ ''کفار'' کے لیے ہیں،اور سرمایہ داریت کے کرتوت ان کے سامنے لاتے ہوئے ایک درست اور فلاحی معاشی نظام پیش کیا جاسکے جس پہ عمل انسانی زندگی کو دوبارہ اسی طرح خوشگوار کردے جیسے عہدِ آدم میں تھی۔

انسانیت غربت،افلاس، بدحالی کے ہاتھوں خودکشی پہ مجبور ہے۔آج غریب آدمی کا کوئی حال نہیں،مہنگائی، بیماری، فاقہ کشی،غربت وافلاس،محنت، مشقت،اولاد کا بوجھ،کنبہ کی ذمہ داریاں اور دیگر پریشانیوں نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔وہ نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ایک مخصوص مفاد پرست طبق کے ہاتھوں کل انسانیت کی یہ معاشی بدحالی اور افلاس دل بہت زیادہ دکھاتی ہے۔جگہ جگہ غریب آدمی کا استحصال ہوتا دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ایسی صورتحال میں لوگوں کی قرآن کے معاشی نظام کی جانب رہنمائی کرنا انتہائی ضروری کام ہے۔خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی،ہم نے اسکے دین کی حقیقتوں کو سمجھا اور اب اپنی زندگی اس مشن کے لیے وقف کردی ہے۔جب تک زندگی ہے،تب تک مذہب وملت سے بالاتر ہوکر انشاءاللہ دوسروں تک اس پیغام کو پہنچاتے چلے جائیں گے۔تاکہ دنیا کے ہر انسان کو دینِ اسلام کی جانب درست رہنمائی ملتی چلی جائے اور انسانیت جلد سے جلد اس پوزیشن میں آجائے کہ یہ نظام دوبارہ قائم کرسکے۔

امید ہے کہ تاریخ انسانی کے اس انتہائی اہم اور نازک ترین مسئلہ پر میری یہ حقیر سی کاوش پڑھنے والوں کے قلوب واذہان پر

نہایت مثبت اثرات مرتب کرتے ہوئے انہیں دینِ حقیقی کو سمجھنے کی میں مدد دے گی اور ساتھ ہی آخرت میں میرے اپنے رب کے حضور سرخرو ہونے کا باعث بنے گی کہ میں نے بھی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس دینِ حقیقی کی اشاعت میں اپنا کردار ادا کیا۔

القرآنک پاور

1 ملکیت کا قرآنی تصور

بنی نوع انسان کی کل متاع یہ زمین ہے جس پر ہم انسان شروع دن سے رہ رہے ہیں ۔انسانیت کا رزق یہیں پیدا ہوتا ہے،اوراسی زمین سے نکلتا ہے،اسی پر زراعت ہوتی ہے،اسی پہ فیکٹریاں لگائی جاتی ہیں،اسی کے سینے پر بڑے بڑے تجارتی بحری جہاز چلتے ہیں،اسی کے قلب سے انتہائی قیمتی معدنیات اورایندھن نکلتا ہے۔یہ زمین انسان کا اثاثہ ہے جواللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کورہنے کے لیے مفت میں عطا کی گئی ہے۔

لیکن انسان کی روش کیا ہے؟یہ اس پر بلاشرکتِ غیرے قبضہ وتصرف کا خواہاں ہے۔یہ کہتا ہے کہ یہ میری ملکیت ہے،فلاں کی ملکیت ہے،اتنی میری اوراتنی تیری ہے۔لیکن(زمین کا پیدا کرنے والا) اللہ انسان سے پوچھتا ہے کہ یہ زمین تیری ملکیت کیسے ہوگئی ؟یہ تو اس روز بھی موجود تھی جب تم یہاں آئے ہی نہیں تھے۔جب اس کائنات میں انسان نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔یہ تو ہماری تخلیق ہے۔تم نے یہاں آنے کے بعد کیا ہم سے خریدی تھی؟قیمت دے کر؟یا پھر پٹہ لکھوایا تھا۔یہ جو انسان حد بندی کرکے کہنے لگتا ہے کہ یہ میری ہے،یہ تیری ہے۔کس بناء پر کہتا ہے؟نہ زمین انسان کی پیدا کی ہوئی،نہ اس میں موجود خزانے انسان کے بنائے ہوئے ،نہ پانی اس کا برسایا ہوا،نہ ہوااس کی،نہ سورج کی روشنی اس انسان کی پیدا کردہ جواس زمین پر پڑتی اورخوراک پیدا کرتی ہے،تو پھر زمین پر انسان ملکیت جتانے والا کون ہے؟یہ زمین صرف اللہ کی ملکیت ہے۔اس پر کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ۔اوراللہ کی ملکیت سے مراد یہ ہے کہ یہ زمین تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر کھلی ہے۔اس لیے کہ وہ رب العالمین (سورہ الفاتحہ۔آیت 1) ہے۔اس نے تمام جہان کو پالنا ہے۔کوئی فرد واحد ،جماعت،گروہ یا طبقہ اس کے وسائل پر بلاشرکت غیرے قابض نہیں ہوسکتا۔کوئی کسی کا معاشی استحصال نہیں کرسکتا۔تمام انسان اس زمین اوراسکی پیداواروو سائل کے مشترکہ طور پر وارث ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِیْ الْأَرْضِ جَمِیْعًا (سورہ البقرہ۔آیت 29)

اللہ وہ ہے جس نے اس زمین کی تمام پیداواروو سائل کوتم سب انسانوں کی مشترکہ میراث یا ملکیت ٹھہرایا۔

روز ازل سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ بات سمجھاتا آیا ہے اور انسان اس سے ہمیشہ ہی بغاوت کرتا آیا ہے۔انسان الہامی صحائف تک کو تبدیل کرڈالتا تھا کہ کہیں دنیا اس حقیقت کو پا نہ لے۔لیکن اللہ پھر نئی کتب نازل کرتا اور انسانوں کو یہ حقیقت یاد دلاتا کہ دنیا کے تمام وسائل تمام انسانوں اور مخلوقات کے لیے یکساں طور پر کھلے رکھو۔لیکن انسان برابر سرکشی کرتا رہا۔حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو آخری شکل دیتے ہوئے قرآن نازل کیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اپنے ہاتھ لیا تاکہ اب کی بار اس حتمی اعلانِ دین کو کوئی انسانی ہاتھ مٹا نہ سکے۔یہ قیامت تک انسان کو یہ رہنمائی دیتا رہے کہ:

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورہ الشوریٰ۔آیت 49)

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (سورہ النور۔آیت 42)

اللہ تعالیٰ ہی اس ارض وسماء کا مالک ہے۔

وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (سورہ آل عمران۔آیت 180)

اور اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں یہ ارض وسماء۔

عربی زبان میں ''ل'' کا سابقہ ملکیت کے معانی میں آتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ نفع کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں یہ اللہ کے لیے آئیگا،وہاں اس سے مراد ملکیت ہوگی۔اور جہاں انسانوں کے لیے آئیگا،وہاں مراد نفع ہوگی۔یعنی فائدہ اٹھانا۔

انسان کے لیے اس نے کہا ہے کہ تم صرف ان اشیاء سے فائدہ اٹھا سکتے ہو،تمہاری ملکیت نہیں بن سکتیں۔کیونکہ ملکیت اللہ کے سوا اور کسی کی نہیں۔

اللہ نے سورہ البقرہ میں فرمایا ہے کہ

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشاً وَالسَّمَاء بِنَاء وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُواْ لِلّهِ أَندَاداً وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 22)

''اس پر ملکیت صرف اللہ کی ہے۔تمہیں صرف استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔پس ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنادو۔اگر تم نے ایسا کیا تو یہ دانستہ شرک ہوگا۔''

قرآن کی رو سے زمین یا اس کے وسائل پر کسی کے ذاتی حق ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان اور دیگر مخلوقات کو اس کرہ ارض پر پیدا کیا تو ان کی پیدائش سے بھی پہلے ان اسباب و ذرائع کو پیدا کر دیا جو ان کی زندگی کے لیے ضروری تھے۔ زمین پر پانی، ہوا، آگ، معدنیات اور وہ ذرائع جن سے خوراک پیدا ہوتی تھی، سب وافر مقدار میں پیدا کر دیے۔

اب زمین پر دو طرح کی مخلوق آباد ہے۔ حیوانات اور انسان۔ حیوانات چونکہ تمدنی زندگی بسر نہیں کرتے، اس لیے ان کے لیے کسی خارجی نظام کی ضرورت نہیں تھی جو ان رزق کے سرچشموں کا انتظام ایسے انداز میں کرے کہ ہر ذی روح کی ضروریات پوری ہوتی جائیں۔ لیکن اس کے برعکس انسان کو زمین پر تمدنی زندگی بسر کرنا تھی، اس لیے اس کے لیے ایک خاص نظام کی ضرورت تھی جسے نظام مملکت کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ زمین کا انتظام ایسے انداز میں کرے جس سے اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اس پیداوار کی تقسیم اس انداز میں ہو کہ کوئی انسان اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہ جائے۔

وما بکم من نعمة فمن الله

(ہر نعمت اللہ کی عطا کردہ ہے، تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں)

قارئین دنیا کا کوئی بھی معاشی نظام ہو، اس میں دو بنیادی ستون کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک وسائل پیداوار اور دوسرا وہ انسانی صلاحیتیں جو ان وسائل پیداوار سے سامانِ رزق پیدا کرتی ہیں۔ یہی وہ دو ستون ہیں جن کی وجہ سے وہ نظام یا تو صحیح نتائج دے سکتا ہے یا غلط۔ اب دیکھیں قرآن یہاں ایک محور تجویز کرتا ہے جس کے گرد یہ تمام مشینری گردش کرتی ہے۔ وہ محور کیا ہے؟ اس ایک آیت پر ایمان کہ:

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰه (سورہ النحل۔ آیت 53)

جو بھی نعمت ہے وہ خدا کی جانب سے ہے۔ (تمہاری اپنی نہیں)

اسے اگر آسان ترین زبان میں سمجھنا ہو تو یوں کہہ لیجیے کہ دنیا میں جتنے بھی وسائل پیداوار اور انسانی صلاحیتیں ہیں، وہ میری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ کچھ بھی میرا اپنا پیدا کردہ نہیں ہے، سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ ہے۔ اور میں نے ان کا استعمال اسی کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق کرنا ہے۔ یہی ایمان کا بنیادی جزو ہے۔

نعمت کا مفہوم

دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ نہ ہو۔اس ضمن میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کی رو سے نعمت میں کیا کیا شامل ہے؟

لفظ نعمت کے لغوی معنی ہیں ہر وہ چیز جو آنکھوں کو ٹھنڈک، تسکین اور دل کو راحت بخشے۔مال و دولت، آسودگی، خوشحالی، آسائش، سربلندی، کامیابی یہ سب اصطلاحات نعمت کے زمرے میں آتی ہیں۔جب نعمت کا لفظ بولیں تو اس میں سب کچھ آجاتا ہے جو ایک انسان خواہش کرتا ہے۔

ایک مومن جب اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ جو کچھ بھی مجھے میسر ہے، وہ میرا اپنا نہیں، اس میں میرے اپنے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ ہے اور مجھے اسی کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق اسے استعمال میں لانا ہے تو وہ اپنے ایمان کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

اس مقام پر ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ:

جس چیز کو خدا اپنی ملکیت کہتا ہے۔اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس چیز پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور اسے اللہ ہی کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ساری مخلوق کے لیے کھلا رکھا جائیگا۔

اور

جن امور کو خدا اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے، وہ دراصل اس نظام کی ذمہ داری ہوتی ہے جو انسانوں کی دنیا میں اللہ کے ان قوانین کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے وجود میں آئے۔جسے ہم مملکت یا ریاست (State) کہتے ہیں۔

لفظ نعمت کا مفہوم یہاں آپ پر واضح ہو چکا ہوگا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کن کن اشیاء کو نعمتیں کہہ کر اس فہرست میں شامل کیا ہے:

(1) رزق (خدا کی نعمت)۔سب سے پہلے اس فہرست میں رزق کو لیجیے۔اس میں وہ تمام چیزیں آتی ہیں جن پر انسانی زندگی کی بقاء کا دارومدار ہے۔اس بارے میں قرآن میں واضح ارشاد دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (سورہ الفاطر۔آیت 3)

اے لوگو۔ اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے اس نے تمہیں نوازا ہے۔ وہ تمہیں آسمانی فضا اور زمین کی زرخیزی، دونوں کے ذریعہ رزق فراہم کرتا ہے۔

جب یہاں ارض وسماء کا ذکر ہوا تو وہ تمام چیزیں آ گئیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔

سورہ النحل میں ہے کہ اللہ نے تمہارے فائدہ کے لیے سمندر کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا تا کہ تم اس سے تروتازہ غذا اور سامانِ زیبائش حاصل کرو۔ پھر زمین کو دیکھو کہ اس میں سے کیا کچھ نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو اللہ کی نعمتوں کی دو چار مثالیں ہیں۔ وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَةَ اللّهِ لاَ تُحْصُوهَا (سورہ النحل آیت 18)۔ اگر تم ان کا شمار کرنا چاہو تو کبھی احاطہ نہ کر سکو گے۔ یہ اس قدر بے حساب ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْماً طَرِيّاً وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (سورہ الفاطر آیت 12)

پھر قرآن نے متعدد مقامات پر کشتیوں، جہازوں کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعے سامان رزق ادھر سے ادھر لیجایا جاتا ہے۔ یہ سب اللہ کی جانب سے تمہارے فائدہ کے لیے ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَن يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (سورہ الروم۔آیت 46)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ۔(سورہ لقمان۔آیت 31)

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (سورہ الشوریٰ۔آیت 33)

پھر مویشیوں کا ذکر کیا۔ ان سے دودھ پیدا ہوتا ہے، کھال سے اون اور لباس بنتا ہے، باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب انسان نے نہیں بنایا بلکہ اللہ نے بنایا ہے جو انہیں پالتا ہے۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (سورہ الزخرف۔آیت 12)

پھر کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں موجود ہر ایک چیز اللہ کی جانب سے ہے۔ جسے اللہ نے انسان کی خدمت کے لیے لگا رکھا ہے اور سب کچھ ہمارے لیے تسخیر کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ (20)وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءنَا أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَى عَذَابِ السَّعِيرِ ۔ (سورہ لقمان ۔آیت 20-21)

غرض یہ تمام نعمتیں اور وسائل اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہیں۔ کسی انسان نے از خود تخلیق نہیں کر لیے۔ نہ یہ انسان کی ملکیت ہیں۔ یہ سب اللہ کی ملکیت ہیں اور انسان کو مفت میں بلا معاوضہ عطا ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی تقسیم بھی مالک کی ہی مرضی سے ہوگی۔

قابل غور نکتہ

اب یہاں جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں ''لکم'' یا ''لھم'' استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ خدا کی نعمتیں اور سامانِ رزق جو مفت میں ملا معاوضہ عطا ہوا ہے، کسی ایک خاندان، فرد، گروہ یا طبقہ کی ملکیت نہیں، بلکہ پوری نوع انسانی کے فائدہ کے لیے عطا ہوا ہے۔ یعنی

سَوَاء لِّلسَّائِلِينَ (سورہ حٰم السجدہ۔آیت 10)

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعاً قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّماوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (سورہ الزمر۔آیت 67)

تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر سامانِ رزق ہے۔ اور

وَمَتَاعاً لِّلْمُقْوِينَ (سورہ الواقعہ۔آیت 73)

ہر بھوکے کے لیے خوراک کا سامان۔ لہٰذا

وَمَا كَانَ عَطَاء رَبِّكَ مَحْظُوراً۔ (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 20)

جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے انسانوں کی پرورش کے لیے عطا ہوا ہے، کسی کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے آگے حد بندی کرے، اپنے لیے سمیٹ لے۔اس کے آگے رکاوٹیں ڈالے۔اور کہے کہ ''یہ میری ملکیت ہے، یہ تیری ہے''۔یہ سب اللہ کی ملکیت ہے۔جو سب انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

سورہ النحل میں اس حقیقت کو مزید واضح کیا گیا ہے۔پہلے ان اشیاء کا ذکر کیا گیا جو انسانی زندگی کی پرورش کے لیے ضروری ہیں اور زمین کی سطح پر بکھری پڑی ہیں۔پھر بتایا گیا کہ یہ سب نعمائے خداوندی تم سب انسانوں کے لیے عطا کر دی گئی ہیں۔

اب تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم فطرت کے قوانین کے مطابق انہیں حاصل کرو اور اللہ کی جانب سے نازل کردہ احکامات کے مطابق انہیں بنی نوع انسان کے مفادِ عامہ کے لیے استعمال کرو۔یہی چیز اللہ تعالیٰ کے احکامات کے آگے سر تسلیم خم کرنا کہلاتی ہے۔یعنی اسلام قبول کرنا۔

پھر اس کے بعد نبی ﷺ سے کہا کہ ''فَإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلاَ غُ الْمُبِيْنُ (سورہ النحل۔آیت 82)۔اگر یہ حقیقت کہ یہ سب سامانِ رزق تمام انسانوں کے لیے مشترکہ طور پر ہے، یہ لوگ سرکشی کریں تو تم نے ان تک درست بات پہنچا دی اور نہایت واضح طور پر پہنچا دی۔اب اگر یہ تسلیم نہیں کرتے تو اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے۔

پھر فرمایا کہ ''يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللّهِ ثُمَّ يُنكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ'' (سورہ النحل۔آیت 83)

یہ لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا ہیں کہ یہ تمام وسائل پیداوار رب کی جانب سے بطور نعمت عطا کیے گئے ہیں۔مفت اور بلا معاوضہ ہیں۔لیکن یہ عملی طور پر اس سے انکاری ہیں اور ان پر یوں سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے یہ انہوں نے اللہ سے خریدے ہوں۔یہ کفرانِ نعمت اور رب کا صریح انکار ہے۔یہ اسلام نہیں، کفر ہے۔

اقوامِ عالم پر فضیلت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں شامل ہے۔

اس نعمت کا ایک اور بہت بڑا پہلو ہے، جس کے بارے میں سورہ البقرہ میں بنی اسرائیل کو آگاہ کیا گیا ہے۔

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ (سورہ البقرہ۔آیت 47)

اے بنی اسرائیل، یاد کرو رب کی اس نعمت کو جب اس نے تمہیں اپنی ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کی تھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہمعصر اقوام پر فضیلت بھی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔بنی اسرائیل کو یہ نعمت تب حاصل تھی جب

انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کو خدائی احکامات کے قالب میں ڈھالا ہوا تھا۔

یہ نعمت صرف اسی صورت حاصل ہوسکتی ہے جب ایسا نظام قائم کیا جائے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے نفع بخش ہو۔ جب مومنین سے کہا گیا کہ:

وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (سورہ آل عمران۔آیت 139)

یعنی تم ہی غالب اور برتر رہو گے جب تک مومن رہو گے۔ تم پر کوئی قوم غالب نہیں آسکے گی۔

يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجاً (سورہ النصر۔آیت 2)

درحقیقت جو قوم اس نظام کو قائم کردے جس میں کوئی انسان کسی کا محتاج یا محکوم نہ ہو تو انسان خوش ہو کر جوق در جوق اس جماعت کا حصہ بنتے چلے جائیں گے (کیونکہ سب کو اپنی دنیاوی و اخروی بہتری اسی میں نظر آرہی ہوگی)۔

اور یوں اس قوم کو ایسی فضیلت اور برتری حاصل ہو جائیگی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی جانب آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ پائے گی۔ جو بھی مدمقابل آئیگا، منہ کی کھائے گا۔

ابھی تک یہاں بنیادی نکتہ رزق کے اللہ کی نعمت ہونے کے متعلق چل رہا تھا۔ لیکن انسان کے بنائے ہوئے معاشی نظام کی اصل مشکل اس سے آگے چل کر سامنے آتی ہے۔ آپ جانتے ہونگے کہ مارکس نے کہا تھا کہ سوشلزم میں تو تم اتنا کرلو گے کہ قوت اور تشدد کے ذریعہ وسائل رزق لوگوں کی انفرادی ملکیت سے نکال کر ریاست کی تحویل میں دے دو گے۔ لیکن اس مسئلہ کا کیا حل ہوگا کہ ان وسائل سے رزق حاصل کرنے میں لوگوں میں مختلف صلاحیتیں ہونگی۔ جس میں رزق پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوگی، وہ زیادہ مانگے گا، اور اسے زیادہ دینا بھی پڑے گا۔ تو پھر طبقاتی فرق تو ختم نہیں ہو پائیگا، کوئی امیر ہوگا تو کوئی غریب۔ لہٰذا سوشلزم میں بھی یہ تفریق بدستور قائم رہے گی اور سرمایہ داری نظام میں بھی۔

دراصل بات یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد جیسا کہ مضمون کے ابتدائی صفحات میں بھی واضح کیا گیا، ہی اس صلاحیتوں اور استعداد (Earning Capacity) کے فرق پر ہے۔ قرآن نے بھی نظام سرمایہ داری کے نمائندہ کے طور پر قارون کی ذہنیت کا حال پیش کیا جب اس نے کہا تھا کہ

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ عِندِي (سورہ القصص۔آیت 78)

جب اس نے کہا تھا کہ جو میں نے کمایا ہے، سب میری ہنرمندی اور صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس لیے کوئی کون ہوتا ہے کہ اس میں دخل

اندازی کرے؟ قرآن نے دوسرے مقام پر کہا کہ یہ ذہنیت قارون کی نہیں، بلکہ ہر انسان کی ہے جو وحی کی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔وہ یہی کہتا ہے۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (سورہ الزمر۔آیت 49)

یہی حقیقی معنی میں فتنہ وفساد کی جڑ ہے اور نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں (وہ اسے بڑی معقول دلیل اور حقیقت سمجھ لیتے ہیں)۔

یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کی بناء پر سوشلزم اور سرمایہ داری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔یہ ذہنیت دونوں نظاموں کی بنیاد میں موجود رہتی ہے۔اور اسی دلیل کی حقیقت جاننے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ دلیل قرآنی نکتہ نظر سے فریبِ نگاہ ہے، میں مضمون میں آگے مفصل قرآنی دلائل پیش کروں گا۔

انسانی جسم کے حواس خمسہ بھی اللہ کی ہی عطا کردہ نعمتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف جہاں وسائل پیداوار یعنی زمین کو بنیادی حیثیت دی ہے، اسی طرح اس نے انسانی جسم میں موجود حواس خمسہ (قوتِ سماعت، بصارت، قوتِ تفہیم، قوتِ فیصلہ وغیرہ) کو بھی ویسی ہی بنیادی حیثیت دے کر انہیں بھی اپنی ہی عطا کردہ نعمتیں قرار دیا ہے۔حواس خمسہ انسان کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں جن کی مدد سے پھر ذہن کسی نتیجہ تک پہنچ کر فیصلہ کرتا ہے۔

ان صلاحیتوں کے متعلق قرآن متعدد مقامات پر واضح کر چکا ہے کہ یہ نہ انسان کی اپنی خریدی ہوئی ہیں نہ ہی اس کی پیدا کردہ ہیں۔یہ اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہیں۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا (سورہ النحل۔آیت 78)

جب تم پیدا ہوتے ہو علم سے بالکل کورے۔ناواقف۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (سورہ النحل۔آیت 78)

خدا نے تمہیں پھر ذرائع معلومات اور قوتِ فیصلہ عطا کی۔

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (سورہ علق۔آیت 4)

یعنی زبان کے ذریعہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا طریقہ۔نیز لکھنے کی صلاحیت بخشی۔

عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (سورہ علق۔آیت 5)

اوراس طرح انسان اس قابل ہوگیا کہ جن امور کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا،ان کا علم حاصل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے تو صحیح الدماغ ہونے کو بھی اپنی ایک نعمت قرار دیا ہے۔جب مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا کہ:

مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ (سورہ القلم۔آیت 2)

یہ اللہ کی نعمت ہے کہ تو پاگل نہیں بلکہ صحیح الدماغ ہے۔

ایک جگہ اللہ نے وسائل پیداوار اور انسانی صلاحیتوں کے بنیادی ذرائع کا اکٹھا ذکر کیا ہے جہاں کہا کہ:

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ (سورہ یونس۔آیت 31)

ان سے پوچھو کہ کون ہے جو زمین و آسمان سے سامان رزق عطا کرتا ہے؟اور تمہارے ذرائع معلومات (سمع وابصار) پر اس کا مکمل کنٹرول ہے۔

اس کے بعد اللہ فرماتا ہے کہ تم دیکھ لینا:

فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ (سورہ یونس۔آیت 31)

لوگ یہ بات تسلیم کریں گے کہ ایسا ہی ہے۔

وہاں تو یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ خارجی دنیا میں اللہ کا قانون ہی کارفرما ہے۔لیکن حالت یہ ہے کہ اپنی اس روزمرہ کی معاشی دنیا میں اللہ کے قانون کو تسلیم کرنے اور ماننے پر تیار نہیں۔وہاں یہ اپنے ہی خود ساختہ قوانین کے تحت تقسیم رزق کرتے پھرتے ہیں۔اسے ہی خدا کا انکار کہا جاتا ہے۔دہریت (Athiesm) یہی ہوتی ہے۔

اجتماعی نظام کی ضرورت انسان کے لیے کیوں محسوس ہوئی؟

عام مشاہدہ ہے کہ حیوانات اس کرہ ارض پر پیدا ہوتے ہیں،کھاتے پیتے،بچے پیدا کرتے اور پھر مر جاتے ہیں۔ان امور کے سوا ان کی زندگی کا قطعاً کوئی مقصد نہیں ہوتا۔پھر انہیں اللہ تعالیٰ نے دیگر کائنات کی طرح اپنے قوانین کا پابند کیا ہوا ہے۔وہ کھانے کے وقت صرف اتنا کھاتے ہیں جس سے ان کا پیٹ بھر جائے۔جب پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر وہ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔باقی خوراک ذخیرہ نہیں کرتے،نہ پیٹ بھر جانے کے بعد دوسروں کو کھانے سے روکتے ہیں۔جیسے ہی پیٹ بھرا،ایک

طرف ہٹ گئے اور پھر دوسرا حیوان آ کر وہاں سے کھانے لگ جاتا ہے(چیونٹیوں کی کچھ انواع خوراک ذخیرہ کرتی ہیں۔لیکن تحقیقات نے یہ واضح کیا ہے کہ وہ ایسا کسی لالچ یا حرص کی بناء پر نہیں کرتیں، بلکہ وہ جبلی طور پر خوراک ذخیرہ کرتی ہیں۔یعنی محض یہ ان کی جبلت ہے)۔

یہ تو ہے اللہ تعالیٰ کا وہ قانون جوان حیوانات کو جبلی طور پر عطا کر دیا گیا ہے اور جس سے روگردانی کا انہیں اختیار نہیں۔ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اگر کتاب اللہ سے سمجھنے میں دشواری ہو تو جانوروں کے اس چال چلن کو دیکھ لیجیے اور اندازہ لگا لیجیے کہ اللہ کا قانونِ معیشت کیا ہے؟

اب دوسری جانب انسان ہے۔یہ حیوانات سے بالکل مختلف ہے۔حیوانات کو اللہ نے اپنے قانون کا پابند بنایا ہے۔انہیں اختیار وارادہ نہیں دیا گیا۔لیکن انسان کو اللہ نے صحیح اور غلط دو راستوں کو حسب منشاء منتخب کرنے کا اختیار دیا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دو اور منفرد چیزیں عطا کی ہیں جن سے دیگر حیوانات محروم ہیں۔ایک اس کی عقل۔اور دوسرا اس کے اندر موجود ایک 'ذات' جو اللہ نے بذریعہ 'نفخ فیہ روحنا'' کے ذریعہ داخل کی تھی۔جس کی بناء پر یہ حیوانات سے یکسر الگ ہو گیا اور ''تم'' کہہ کر پکارے جانے کے قابل ہوا۔اور اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی قرار پایا۔ظاہر ہے اپنے عمل کا ذمہ دار وہی ہو سکتا ہے جسے کسی کام کا اختیار وارادہ دیا گیا ہو، جسے اختیار ہی نہیں دیا گیا، وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

ذات کے علاوہ انسان کو جو دوسری چیز ''عقل'' دی گئی تھی اس کے پیش نظر انسان کی اپنی داخلی زندگی میں کچھ تضادات رونما ہونا شروع ہو گئے۔یہ اپنے فطری میلان سے یکسر ہٹ گیا اور عقل کو اپنا رہنما بنا لیا۔اب انسانی عقل صرف اس انسان کے ہی مفاد کے لیے سوچ سکتی ہے جس کی وہ عقل ہو۔اسے دوسروں کے مفاد سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔

اس مضمون میں انسانی زندگی کے دو نظریات پر کچھ گفتگو مطلوب ہے۔انسانی زندگی کا ایک نظریہ تو وہ ہے جس کے پیش نظر ہر انسان اپنے اپنے مفادات کا تحفظ چاہتا ہے۔اسے دوسروں کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کی جانب لپکتا ہے۔اس کی عقل اسے مجبور کیے رکھتی ہے کہ وہ ہر وقت صرف اپنا ہی مفاد سوچے۔یہ عقل چونکہ آزاد ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین پر نہیں چلتی بلکہ اسے خارجی رہنمائی کے ذریعہ ان قوانین پر از خود چلانا پڑتا ہے۔اسی آزاد عقل کو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کہہ کر پکارا ہے جو خدائی رہنمائی کی بجائے اپنا ذاتی مفاد پیش نظر رکھتی ہے۔یہ عقل انسان کو ہر دم سرگوشیاں کرتی دکھائی دیتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کر لو۔اگر تم نے اپنی محنت کی کمائی کسی دوسرے کو دے دی تو تمہارا کیا

ہوگا ؟ممکن ہے تم تنگدست اور بدحال ہو جاؤ۔اور ایک وقت پر ضرور پچھتاؤ گے ۔اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں بنتا۔سب مطلبی ٹٹو اور کھانے کے یار ہیں۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاء (سورہ البقرہ۔آیت 268)

شیطان تمہیں محتاجی وفقیری کے خوف سے ڈراتا ہے اور تم سے بخل (کنجوسی) کا مطالبہ کرتا ہے۔

آیت بالا میں الْفَقْرَ اور فَحْشَاء کا مشترک استعمال قابل غور ہے۔عربوں کے ہاں کنجوسی اور بخل کو بھی فَحْشَاء سے تعبیر کیا جاتا تھا۔چونکہ بخل کی وجہ سے انسان میں سب کچھ اپنے پاس ذخیرہ کر لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے جو ایسا نظریہ زندگی ہے جو بعد میں متعدد برائیوں اور گندی خصلتوں کو جنم دیتا ہے ۔کشادہ دل عربوں کے ہاں یہ عادت شرافت کے یکسر منافی تھی۔چنانچہ ان کے ہاں یہ بخل بھی فَحْشَاء کے زمرے میں آتا تھا۔

یہی بخل بعد میں انسان کے مال ودولت حتیٰ کہ اولاد کے معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگ جاتا ہے۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 64)

اور اس طرح انسان کی نکیل پکڑ کر اسے جہاں چاہے لیے پھرتا ہے۔

لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 62)

قرآن کہتا ہے کہ اپنی عقل کو صرف اپنا مفاد سوچنے کی بجائے کل عالم کا مفاد سوچنے والی بناؤ۔

یہ مرحلہ اتنا مشکل، کٹھن اور ہمت طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ کو ایک بہت دشوار گزار بلند چوٹی پر چڑھنے کے مماثل قرار دیتا ہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (10)

ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھادئے ہیں

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ (11)

اس میں سے ایک راستہ اسے بہت آسان نظر آتا ہے (صرف اپنا مفاد سوچنا)،وہ اس پہ چڑھنے لگ جاتا ہے،دوسرا دشوار ہوتا ہے (دوسروں کا مفاد بھی سوچنا)،اس پہ چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ (12)

کیا تم جانتے ہو کہ یہ مشکل راستہ کونسا ہے؟ یہ تمہیں اللہ سے بہتر کوئی نہیں سمجھا سکتا۔سنو۔

فَكُّ رَقَبَةٍ (13)

یہ وہ راستہ ہے جس میں انسانوں کو غلامی اور محکومی کی زنجیروں سے آزاد کروایا جاتا ہے۔

أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ (14) يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (15) أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ

(سورہ البلد۔آیات 10تا16)

یا معاشی بدحالی کے دور میں ان غریبوں اور مساکین کی روٹی کا انتظام کرنا جو معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کریں۔یا ان مزدوروں کی فلاح و بہبود کا انتظام کرنا جنہیں ہمیشہ مٹی میں لت پت رکھا جاتا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما رکی رہے۔وہ جو ہمیشہ سرمایہ داروں کے محتاج رہتے ہیں۔

انسانی عقل کی قوانین خداوندی سے بغاوت

اب یہاں انسانی عقل اللہ کے اس حکم کے آڑے آنے کی کوشش کرتی ہے۔یہ کہتی ہے کہ میں دوسروں کا مفاد کیوں اور کیسے سوچوں؟ مختلف انسانوں میں کمائی کرنے کی صلاحیتوں اور کام کی استعداد میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔کچھ لوگ زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں،اس لیے وہ زیادہ کماتے ہیں، کچھ لوگ کم باصلاحیت ہیں،پس ان کی آمدن کم ہوتی ہے۔کمانے کی صلاحیت (Earning Capacity) میں تو واضح فرق ہے۔تو پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روزانہ ایک ہزار روپیہ کمانے والے ایک شخص کی آمدنی میں سے چھ سو روپیہ اس سے چھین کر دوسرے غرباء کو دے دینا جن کی آمدنیاں روزانہ دو تین سو روپیہ سے زائد نہیں۔یہ تو سراسر ظلم ہے۔دنیا کا کونسا قانون ایسا ہے جو حق اور انصاف کی بات کرتا ہو لیکن ساتھ ہی ایسا ''ظالمانہ'' حکم بھی دے۔آپ آخر کسی سے اس کی محنت کی کمائی کیسے چھین سکتے ہیں؟

ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں اپنی مرضی سے اپنی کمائی سے کچھ رقم ضرورت مندوں اور غریبوں کو خیرات کر دوں۔لیکن آپ مجھ سے میری محنت کی کمائی چھین ہرگز نہیں سکتے۔میری ملکیت میں تصرف نہیں کر سکتے۔

یہ ہے سرمایہ داری نظام کی بنیادی دلیل

مندرجہ بالا تصریحات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں قائم نظام سرمایہ داری کی بنیاد اسی سوچ پر قائم ہے۔ذاتی مفاد پرستی اور سرمایہ داری نظام کی تمام تر عمارت اسی ایک ''دلیل'' پر قائم ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھی اس سوچ کا ذکر کیا ہے جب وہ بنی اسرائیل کے ایک انتہائی دولت مند شخص قارون کو سرمایہ داری نظام کا نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے۔قارون بھی یہی دلیل دیتا تھا۔وہ کہتا تھا کہ:

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ عِندِي (سورہ القصص۔آیت 78)

میں نے جو کچھ کمایا ہے، اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔

اس لیے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ میری ملکیت میں دست اندازی کرے؟

قرآن بتاتا ہے کہ یہی دلیل ہر مفاد پرست گروہ اور سرمایہ دار روز ازل سے دیتا چلا آرہا ہے۔اور یہی دلیل اصل فتنہ وفساد کی جڑ ہے۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّجِعْتُ إِلَى رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلْحُسْنَى فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (سورہ حٰم السجدہ۔آیت 50)

اور نقصان کے بعد اگر ہم پھر اسے رزق کی فراوانی عطا کر دیتے ہیں (جس کے متعلق اس نے سمجھ لیا تھا کہ اسکی اب کوئی امید نہیں) تو وہ کہنے لگ جاتا ہے کہ یہ سب میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔اسلیے میں اس پر اکیلا ہی حقدار ہوں، میں اسے دوسروں کو کیوں دوں؟ایسا شخص دراصل قانون مکافات کو جھٹلاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کوئی انقلاب آئے گا۔اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جاتا ہے اور مجھے رب کے حضور جانا پڑتا ہے تو میرے لیے وہاں بھی خوشحالی ہی ہوگی (کیونکہ میں اگر خدا کی نظر میں اتنا برا ہوتا تو مجھے دنیا میں اتنا کچھ کیوں ملتا)؟

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (سورہ المومن۔آیت 83)

اور جب انکے پاس اللہ کے رسول واضح احکاماتِ خداوندی لے کر آئے تو انہوں نے ان قوانین کو جھٹلاتے ہوے اپنے علم وہنرمندی پر غرور کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے، اسنے انہیں آدبوچا

فَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (سورہ الزمر۔آیت 49)

اور انسان تو ایسا ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، اور جب ہم اسے نعمتوں سے نوازتے ہیں تو

کہنے لگتا ہے کہ یہ سارا میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے (خدا کون ہوتا ہے؟) حالانکہ یہ اسکی کھلی گمراہی اور بیوقوفی ہے۔ اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ جو کچھ انہیں ملتا ہے، اس میں کچھ حصہ تو انکی محنت کا ہوتا ہے جبکہ زیادہ تر حصہ ان اسباب و وسائل کا ہوتا ہے جو خدا کی جانب سے مفت میں ملتے ہیں۔ انسانوں کے خود ساختہ تصورِ حیات کی بنیاد اس غلط سوچ پر ہے کہ جو کچھ انسان کو ملتا ہے، وہ سارا اسکی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے استعمال اور تصرف میں اسے کوئی روک ٹوک نہیں کی جاسکتی (یہ غلط تصورِ حیات ہے)۔

قرآن نے اس دلیل کو باطل قرار دے کر سرمایہ داریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

اللہ تعالیٰ نہایت خوبی سے اس ''دلیل'' کا تجزیہ کرتا ہے اور حقائق معیشت کو انتہائی بہترین انداز میں انسان کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس دلیل کی کمزوری کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق اب آپ کی توجہ کے طلبگار رہیں۔

ذرا غور کیجیے۔ آپ صبح سے شام تک کام کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ایک مزدور بھی صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔ آپ کا دن بھر کا کام اتنا پیدا کرتا ہے جس کا معاوضہ پانچ سو روپے ہے۔ دوسری طرف مزدور دن بھر کی محنت سے صرف ڈیڑھ سو روپیہ کماتا ہے۔ (یہ قیمتیں بھی خود معاشرہ کی ہی متعین کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور طلب و رسد کے قانون سے ان کا تعین ہوتا ہے۔ اس بات پر بعد میں گفتگو کی جائیگی کہ کس طرح یہ معاوضوں کا تعین بھی غیر منصفانہ اور ظالمانہ طریقے سے کیا جاتا ہے)

دونوں کی کمائی میں تین عناصر شامل ہیں۔ (1) محنت (2) کمانے کی استعداد میں فرق (3) وسائل پیداوار (زمین)

پہلا عنصر تو آپ دونوں میں مشترک ہے۔ محنت آپ نے بھی کی اور اس مزدور نے بھی۔ فرق کہاں ہے؟ دوسرے عنصر میں۔ اور یہی دوسرا عنصر ہے جس کی وجہ سے آپ نے مزدور سے 350 روپے زیادہ کمائے۔

اب آپ کہتے ہیں کہ میری یہ اضافی صلاحیت میری اپنی ہے۔ اس لیے اس صلاحیت سے پیدا شدہ آمدنی بھی میری اپنی ہونی چاہیے۔ اسی دلیل کی بناء پر آپ اپنی اس اضافی کمائی کو اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔ اس سے آپ کے پاس سرمایہ جمع ہونے لگ جاتا ہے۔ پھر اس جمع شدہ سرمایہ سے آپ بہت سی اشیاء خرید کر اپنی ملکیت میں لے آتے ہیں۔ مثلاً زمین، فیکٹریاں، مکانات، دوکانیں اور دیگر وسائل پیداوار۔ ان سے آپ کی آمدنی مزید بڑھ جاتی ہے۔ پھر آپ کی وفات ہو جاتی ہے اور آپ کی اولاد کو آپ کے یہ سب اثاثے وراثتاً مل جاتے ہیں۔ جس کے لیے انہیں نہ محنت کرنا پڑتی ہے نہ کمانے کی استعداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ بغیر کام کیے ان اثاثوں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔

یہی سرمایہ داری نظام ہے کہ جس شخص میں بھی کمانے کی استعداد زیادہ ہوگی، اسے اپنی کمائی پر پورا پورا حق ملکیت حاصل ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ قرآن میں کہتا ہے کہ تم ان دونوں چیزوں (تمہاری ذہنی استعداد اور سرمایہ کے ذریعے خریدے جانے والے وسائل پیداوار) کا تجزیہ کرو۔اور پھر دیکھو ان میں تمہارا حصہ کس قدر ہے؟

سب سے پہلے ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کا تجزیہ کرتے ہیں کہ وہ کس کی دی ہوئی ہیں۔

ذہنی استعداد

ایک انسان کی ذہنی استعداد کو مندرجہ ذیل عناصر تخلیق کرتے اور پروان چڑھاتے ہیں۔

(1) دماغی ساخت (Brain Structure) یہ ہر انسان میں پیدائشی ہوتی ہے۔

(2) ابتدائی ماحول

(3) تعلیم و تربیت

(4) ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کے مناسب مواقع

آخری دو عناصر کا تعلق اس معاشرہ سے ہوتا ہے جن میں بچہ جنم لیتا ہے۔

ہر انسان کی صلاحیتوں اور استعداد میں یہی چار عناصر شامل ہوتے ہیں۔ان پر غور کیجیے اور بتایئے کہ ان میں کونسا عنصر ایسا ہے جو انسان کا اپنا پیدا کردہ ہے؟ یا اس کی پیدائش میں انسان کے اپنے کسب و ہنر کا ہاتھ ہے۔

اگر آپ کا دماغ اچھا ہے تو یہ بھی آپ کا پیدا کردہ نہیں بلکہ خالصتاً پیدائشی اور اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہے۔اگر اس نے آپ کو اچھا دماغ نہ دیا ہوتا تو۔۔۔؟؟؟ آپ کیا کر لیتے ؟

اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (سورہ علق۔آیت 5)

ہم نے ہی انسان کو علم دیا۔یہ تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ۔۔أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ (سورہ علق۔آیت 7-6)

لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ یہ خود کو وحی کی رہنمائی سے مستثنیٰ سمجھ کر اپنا ہی مفاد پرستی کا نظام قائم کر لیتا ہے۔اور یوں اللہ کے نظام پرورش عامہ سے بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے۔

إِنَّ إِلَى رَبِّكَ الرُّجْعَى (سورہ علق۔آیت 8)

لیکن یہ کتنی ہی نافرمانی کیوں نہ کرے؟ اسے ایک روز اسی اللہ کے نظام کی جانب لوٹ کر آنا پڑے گا۔(اسی میں اس کی مشکلات کا حل ہے)۔

اسی طرح آپ کی تربیت اگر اچھے ماحول میں ہوئی ہے تو اس میں بھی آپ کی ذاتی کاریگری تو ایک طرف، آپ کے اختیار و ارادہ کو بھی کوئی دخل نہ تھا۔اگر بالفرض آپ کے گردو پیش کا ماحول خراب ہوتا اور اسی میں آپ کی خراب پرورش ہوتی تو آپ کیا کر لیتے؟

پھر اسی طرح آپ کی تعلیم کے لیے اچھے تعلیمی ادارے موجود تھے اور آپ کو میسر آئے تو اس میں بھی آپ کی ذاتی ہنر مندی کا کوئی دخل نہیں۔اگر اس علاقہ میں جہاں آپ پیدا ہوئے ہیں، کوئی سکول ہوتا ہی نہ یا پھر سکول میں نظام تعلیم اچھا نہ ہوتا تو آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی۔تب بھی آپ کیا کر سکتے تھے؟

وسائل پیداوار

اب ان وسائل پیداوار کو لیتے ہیں جنہیں آپ اپنے سرمایہ سے خرید کر ان کے مالک بلکہ اجارہ دار بن جاتے ہیں۔ان میں سب سے بنیادی وسیلہ پیداوار زمین ہے۔ جسے الارض کہا جاتا ہے۔قرآن نے معاشی زندگی کے لیے بھی ''الارض'' کی اصطلاح استعمال کی ہے کیونکہ تمام معاشی وسائل کی ماں یہ زمین ہی ہے جس سے سب کچھ پیدا ہوتا ہے۔زراعت پیشہ معیشت کے علاوہ ہر طرح کی معیشت میں اس زمین کا عمل دخل ہے۔حتیٰ کہ فیکٹریاں اور صنعتیں بھی لگتی ہیں تو وہ بھی اس زمین کے سینے پر۔ان فیکٹریوں میں اشیاء کی تخلیق کے لیے خام مال کی شکل میں لوہا، معدنیات، پانی وغیرہ جاتا ہے تو وہ بھی اس زمین سے حاصل شدہ۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ انسان سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ یہ جو زمین کو پیدا کیا گیا، اس کی سطح پر اور اس کے اندر (ہوا، پانی، روشنی، حرارت، معدنیات، جنگلات وغیرہ کی شکل میں) جو وسائل پیداوار رکھے گئے جن سے رزق کی پیدائش ہوتی ہے، اس میں تمہاری ہنر مندی کا دخل ہے یا میری ہنر مندی کا؟

کھیتی باڑی کا معاملہ

قرآن ایک دلفریب انداز میں پوچھتا ہے کہ یہ جس زمین کی فصل کے تم واحد مالک بننا چاہتے ہو اس میں تمہاری ہنر مندی کا

دخل کتنا ہے؟ ذرا غور کرو۔

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ (سورہ الواقعہ۔آیت 63)

تم تو صرف اتنا ہی کرتے ہو کہ بیج ڈال کر ہل چلا دیا اور پانی دے دیا۔

أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (سورہ الواقعہ۔آیت 64)

کیا اس کے بعد تمہارے پاس یہ قوت بھی موجود ہے کہ تم اس بیج سے پودا یا درخت نکال لو؟ اور پھل پھول لے آؤ؟ کیا یہ کام تم کرتے ہو یا ہمارا قانون کرتا ہے جس پر تمہیں کوئی اختیار نہیں؟

اگر ہم اس فصل کو پکنے سے پہلے ہی تباہ کر دیں تو تمہارا کیا بنے؟ فصل کو اتار کر اپنی ملکیت میں لانا تو ایک طرف، تمہیں تو الٹا نقصان ہو جائے، تمہاری محنت اور بیج وغیرہ کا مالی نقصان تمہیں بھگتنا پڑ جائے۔

کھیت سے آگے بڑھتے ہوئے ذرا اس پانی پر غور کرو جو تم اسے دیتے ہو۔ اسی پانی سے تمہاری فصل کے پکنے اور تمہاری اپنی زندگی کی بقاء کا دارومدار ہے۔

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ (سورہ الواقعہ۔آیت 68)

کیا اس پانی کو تم زمین پر برساتے ہو یا ہمارا قانون؟

أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ (سورہ الواقعہ۔آیت 69)

فرض کرو کہ ہم کچھ ایسا انتظام کرتے کہ سورج کی روشنی عمل کشید کے ذریعے صاف پانی کو سمندر سے اٹھا کر اوپر بادلوں کی صورت نہ لے آتیں اور وہ نمک جو سمندروں کے پانی میں ہوتا ہے، جس سے نہ زراعت ہو سکتی ہے نہ وہ پانی پینے لائق ہوتا ہے، تو تم کیا کر لیتے؟

آگ

اب اس حرارت یعنی آگ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے کھانے پینے کی اشیاء پکتی ہیں اور یہ بھی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس میں موجود گرمی تمہاری پیدا کردہ ہے یا ہماری اپنی؟

أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ (سورہ الواقعہ۔آیت 71)

أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ (سورہ الواقعہ۔آیت 72)

کیا یہ درخت تمہاری ہنرمندی سے پیدا ہوئے ہیں یا اللہ کی ہنرمندی سے؟جن سے آگ روشن کی جاتی ہے۔

تو انسان کو دعوت فکر ہے کہ وہ ذرا سوچے کہ اس سارے کاروبار زندگی میں اس کی اپنی ہنرمندی یا صلاحیت کا کتنا عمل دخل ہے؟اور اللہ تعالیٰ کے قانون ربوبیت کا کتنا حصہ ہے؟

انسان کی صرف محنت ہے،باقی سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں ہیں

اسی لیے ان نعمائے خداوندی کے ذریعے پیدا شدہ رزق کی تقسیم بھی رب کے ہی دیے ہوئے طریقہ پر ہوگی

اللہ فرماتا ہے کہ یہ سب اسی کے قانون کے تحت عمل میں آتا ہے۔اس میں انسان کی صرف محنت ہوتی ہے۔باقی سب کچھ اللہ کا۔یعنی اسے کچھ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک شراکت کی بنیاد پر ایک کاروبار ہے جس میں انسان کی محنت ہے اور اللہ کا سرمایہ۔پس اس کاروبار کے منافع کو اسی نسبت سے تقسیم کرنا ہوگا۔یعنی انسان اپنی محنت کا معاوضہ لے گا اور سرمایہ کا منافع اس سرمایہ کے اصلی مالک اللہ کے پاس جائیگا۔اب آگے اللہ تعالیٰ اس حصہ کا کیا کریں گے؟ اللہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنا یہ حصہ تمام انسانیت کی پرورش عامہ کے لیے وقف کردیا ہے پس اسے ان تک پہنچا دو۔

نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعاً لِّلْمُقْوِينَ (سورہ الواقعہ۔آیت 73)

اسے ہم نے محتاجوں اور ضرورتمندوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

ایک جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنی خوراک پر غور کرو جس پر تمہاری زندگی کا انحصار ہے۔اور سوچو کہ اس میں تمہاری ہنرمندی کا کتنا حصہ ہے اور ہمارے قانون کا کتنا حصہ ہے؟

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَى طَعَامِهِ (سورہ عبس۔آیت 24)

یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ربوبیت (اپنی مخلوق کو پالنے کا قانون) ہی ہے جو زمین پر بارش برساتا ہے۔پھر زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے پودے نکلتے ہیں۔پھر ان میں دانے اور پھل لگتے ہیں۔اسی طرح تمام سبزیاں،پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔اور یہ سب سبزہ و پھل وغیرہ کس کے لیے ہیں؟

مَّتَاعاً لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (سورہ عبس۔آیت 32)

تم اور تمہارے جانوروں کے لیے

قدرت کا وسیع و عریض نظام آب پاشی

سورہ ق میں ہے کہ:

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ تَبْصِرَةً وَذِكْرَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكاً فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ (سورہ ق۔آیت 9-7)

ہم نے زمین کو پھیلا دیا اور اس پر پہاڑ پیدا کر دیے اور نظام آب رسانی کے ذریعے قسم قسم کی اشیاء اگا دیں۔اس نظام میں جو بھی صاحب غور و فکر ہوگا اس کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔ہم بادلوں سے بارش برساتے ہیں جن سے بڑے بڑے باغات اگتے اور فصلیں ہری بھری ہوتی ہیں۔نیز کھجوروں کے تہہ بہ تہہ خوشے۔

رِزْقاً لِّلْعِبَادِ (سورہ ق۔آیت 11)

یہ سب کچھ تم سب انسانوں کی پرورش کے لیے ہے۔

ان حقائق کو سامنے لانے کے بعد اللہ ایک سوال کرتا ہے۔وہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ یہ سارے وسائل معیشت کس کے پیدا کیے ہوئے ہیں؟

أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَرْزُقُكُم (سورہ الملک۔آیت 21)

إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ (سورہ الملک۔آیت 21)

اس کے بعد وہ پوچھتا ہے کہ اگر وہ اس رزق کو روک لے تو تم اس کا کیا بگاڑ لو گے؟

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْراً فَمَن يَأْتِيكُم بِمَاءٍ مَّعِينٍ (سورہ الملک۔آیت 30)

مثلاً اگر وہ پانی کو زمین کے بہت نیچے لے جائے، اور اوپر سطح ارض پر نہ آنے دے تو اے انسان تم کیا کر لو گے؟

رب تعالیٰ کہتا ہے کہ ذرا سوچو یہ معاملہ کس قدر واضح ہے کہ میں نے اس زمین کو پھیلایا، اس پر سمندر قائم کر دیے۔پھر ان سمندروں میں سورج کی حرارت کی مدد سے بخارات بلند کیے، اور ان سے بادل تشکیل دے کر ان سے تمہاری زمینوں پر بارش برسائی۔جس میں سے غلہ، سبزیاں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔(یہ جو پانی نہروں کی شکل میں انسانی ذرائع آبپاشی کی بدولت زمینوں کو سیراب کرتا ہے، یہ بھی اللہ کے قانون کی بدولت پہاڑوں پر جمی برف کے پگھلنے سے بہنے والے پانیوں سے

بننے والے دریاؤں سے ہی آتا ہے۔اس میں بھی انسانی کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔اگر اللہ پہاڑوں پر برف جمانا بند کر دے اور یوں دریاؤں کا بہنا بند ہو جائے تو انسان کیا کر لے گا؟ پھر یہ سمندر سے بھی پانی نہیں لے سکتا۔کیونکہ سمندر کا پانی بہت کھارا ہے جسے وسیع پیمانے پر صاف کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔یہ پانی صرف بخارات کی شکل میں ہی صاف کیا جا سکتا ہے اور یہ عمل صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قانون سر انجام دے رہا ہے)

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (سورہ حٰم السجدہ۔آیت 10)

"اور اس نے اس زمین کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دئے (تا کہ آب رسانی کا نظام درست انداز میں کام کرے)۔اور زمین میں وافر مقدار میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔اور چاروں موسموں میں اس کی پیداوار کے اندازے مقرر کر دئے۔اسے تمام ضرورتمندوں کے لیے یکساں طور پر کھلا رکھا جائے۔"

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (سورہ الحجر۔19-20)

اور اس زمین کی پیداوار کو تمہارے لیے ذریعہ معاش بنایا، تمہارے لیے بھی اور انکے لیے بھی جنہیں تم رزق مہیا نہیں کرتے

پھر اللہ فرماتا ہے کہ یہ سب کچھ میں اس لیے کرتا ہوں کہ تم سب کے لیے رزق پیدا ہو۔تم سب کو کھلاؤں۔اور یہ جو رزق پیدا کیا گیا ہے تم اسے میرے قانون ربوبیت کے مطابق استعمال میں لاؤ۔یہ تم پر میری جانب سے عائد کردہ فریضہ ہے۔لیکن تم ہو کہ میرے قوانین کی بجائے اپنے ہی قوانین بنا کر بیٹھ جاتے ہو اور رزق کی تقسیم اپنی مرضی سے کرنے لگتے ہو۔

فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 22)

اس کاروبار میں تم اپنی مرضی کی تقسیم نہیں کر سکتے۔

سرمایہ صرف میرا تھا اس لیے یہ تقسیم میری مرضی کے مطابق ہو گی۔

پس اپنا حصہ اپنے پاس رکھو، اور میرا حصہ مجھے دو۔

اللہ مندرجہ بالا تصریحات کے بعد فرماتا ہے کہ اس کاروبار میں تمہارا حصہ صرف محنت کا ہے، جو تم نے کی۔جبکہ ہم نے جو

سرمایہ لگایا، پیداوار میں جتنا کام میں نے کیا، وہ حصہ مجھے دو۔

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (سورہ الانعام۔آیت 141)

اس پیداوار میں اپنی ضرورت کے بقدر اپنے پاس رکھو، اور جو حصہ اللہ کا ہے، وہ اسے دے دو۔

وَلَا تُسْرِفُوا

اور اپنی ضرورت سے زائد ایک آنے کی بھی فضول خرچی نہ کرنا۔ کیونکہ:

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ

اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بے جا فضول خرچی اور عیاشی کرتے ہیں۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ:

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (سورہ الحجر۔آیت 20)

اس ساری پیداوار میں صرف تمہارے لیے ہی سامان رزق نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے بھی ہے جنہیں تم اپنے تئیں سمجھتے ہو کہ ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (سورہ الرحمٰن۔آیت 10)

ہم نے اس سامان معیشت کو تمام مخلوقات کے لیے پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔

(8)وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (سورہ الرحمٰن۔آیت 9)

اس کے ساتھ ہی وہ میزان بھی بھیجا ہے جس کی رو سے اللہ کے قوانین کے تحت رزق کی درست تقسیم ہوتی ہے اور معاشرہ کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اس میزان کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو۔ اور کسی کے حصہ میں کمی بیشی نہ کرو۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ تمام وسائل پیداوار اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اسی کی جانب سے انسانوں کو دیے ہوئے ہیں جن کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) ہے۔ اس لیے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کی حد بندی کر کے انہیں اپنی ملکیت میں لے لے۔

وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 20)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے عطا ہوا ہے اس کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔

زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں

وہ وسائل پیداوار جو اللہ کی جانب سے مفت عطا ہوئے ہیں ان میں زمین کی حیثیت بنیادی ہے۔اس لیے اللہ نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اسے تمام ضرورتمندوں کے لیے یکساں کھلا رکھا جائے۔ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہوا، پانی، حرارت، روشنی، معدنیات، جنگلات، دریا، سمندر، ندیاں، پہاڑ یہ سب انسان کی زندگی کی پرورش کے ذرائع ہیں جو سب انسانوں کے لیے مشترکہ طور پر عطا کیے گئے ہیں۔انہیں انسانوں کی پرورش کے لیے کھلا رکھنا چاہیے۔

دیکھو تم صرف اپنے گھر کے رب ہو، جبکہ میں پوری کائنات کا رب ہوں

اللہ نے قرآن میں ''ربك العظيم'' اور ''ربك الاعلیٰ'' کی اصطلاحات سے اپنا تمام کائنات کا پالنے والا ہونا ثابت کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنی اور اپنے اپنے بال بچوں کی پرورش کی فکر کرتا ہے۔یہ بھی ربوبیت ہے۔اس ربوبیت میں انسان اور جانور سب شامل ہیں۔لیکن یہ ربوبیت ادنیٰ ہے۔اس ربوبیت کی سطح بہت نیچی ہے۔اس کا دائرہ کار بہت محدود ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ''ربوبیت اعلیٰ'' ہے۔اس کی جانب سے پرورش کی ذمہ داری میں تمام بنی نوع انسان اور کائنات شامل ہے۔وہ رب العالمین ہے۔اس لیے اس کی ربوبیت زیادہ اعلیٰ ہے۔البتہ وہ یہ کام خود نہیں کرے گا۔اس نے اس کام کے لیے تمہیں پیدا کیا ہے۔کہ تمہیں اللہ کا یہ فریضہ سرانجام دینا ہے۔یہ ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے۔اس سے مراد تمہیں دیکھنا ہے کہ تم اللہ کی صفات ربوبیت کے کس قدر مظہر بنتے ہو۔زمین سے باہر خارجی دنیا میں اللہ کے قوانین از خود کارفرما ہیں۔لیکن اس زمین پر اللہ کے قوانین پر عمل انسانوں کے ذریعہ کروانا مقصود ہے۔زمین پر اللہ کی ربوبیت اور عملداری انسان قائم کرتا ہے۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (سورہ الواقعہ۔آیت 74)

اللہ کے نظام پرورش عالم کے قیام میں سرگرم رہو۔

جیسے تم اپنے گھر میں اپنے چھوٹے بچوں کو رزق کمانے سے قاصر ہونے کے باوجود روٹی کما کر فراہم کرتے ہو۔اسی طرح میں بھی پوری کائنات کا رب ہوں۔میں بھی اپنی تمام مخلوق کو یکساں انداز میں پالتا ہوں۔تمہارا یہ اصول کہ جو جتنا کما پائے گا، اس قدر ہی لے گا، تمہارے اپنے گھر میں ہی نہیں چل سکتا تو باہر پوری ریاست یا دنیا میں کیسے یہ اصول کارفرما ہو سکتا ہے؟ یا تو پہلے اپنے محنت کر کے کما نہ سکنے والے بچوں کو پالنا بند کرو۔ورنہ یہ تسلیم کرو کہ یہ اصول غلط ہے۔اور اللہ

پوری کائنات کا خالق ہے جس نے انسان کو اپنی صفات کا مظہر بنانے کے لیے دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی مستقل اقدار کے تحت نظام ربوبیت قائم کر کے دکھائے۔ انسان کی اس دنیا میں انسانوں کو چونکہ بااختیار بنا دیا گیا ہے، اس لیے اللہ کے قوانین انسانوں کی اس حکومت کے ہاتھوں نافذ ہوتے ہیں جنہیں ہم ریاست (State) کہتے ہیں۔

ایک انسان کی کمائی میں تین عناصر شامل ہوتے ہیں:

مضمون کے اولین حصہ میں واضح کیا گیا کہ انسان کی کمائی میں تین بنیادی عناصر شامل ہیں:

(1) ذہنی استعداد

(2) وسائل پیداوار

(3) انسانی محنت

ذہنی استعداد کے متعلق پیچھے دلائل سے واضح کیا گیا کہ یہ انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے دی گئی ایک نعمت ہے۔ اسی طرح وسائل پیداوار (زمین، ہوا، پانی، آگ، جنگلات، معدنیات، دریا، سمندر، پہاڑ وغیرہ) بھی انسان کے اپنے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ نعمت ہیں۔ تیسری چیز انسان کی محنت ہے جو وہ اپنی کوششوں سے ان وسائل پیداوار کو اپنی ذہنی و جسمانی استعداد کو استعمال میں لاتے ہوئے پیدائش رزق کرتا ہے۔ اور مضمون کے اس حصہ میں اسی نکتہ پر مزید وضاحت پیش خدمت ہے۔

انسان کی کمائی میں شامل مندرجہ بالا عناصر میں یہاں سرمایہ (Capital) کو شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ وہ انہی تین عناصر سے حاصل شدہ کمائی کا نام ہوتا ہے۔

محنت کا معاوضہ

محنت سے مراد ہے اپنی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے کسی عائد کردہ ذمہ داری کو سرانجام دینا۔ اس کیٹگری میں تین طرح کے لوگ آتے ہیں:

(1) وہ افرادِ معاشرہ جو اپنے اوپر عائد فرائض و ذمہ داریوں کو پوری صلاحیت اور رغبتِ دل کے ساتھ سرانجام دیں۔

(2) وہ لوگ جو صلاحیت و استعداد کے باوجود محنت نہ کریں۔

(3) وہ لوگ جو بڑھاپے، کسی پیدائشی نقص یا حادثہ کی وجہ سے معذور ہو کر کام کاج سے قاصر رہ جائیں۔

ان افراد پر غور کیجیے۔ پہلی قسم کے تمام لوگ محنت کے معاوضہ میں یکساں ہونگے۔ فرق صرف کمائی کی صلاحیتوں کا ہوگا (جس کا ذکر بعد میں کیا جائیگا)۔ انہیں ایک دوسرے پر کسی قسم کی کوئی برتری یا فضیلت نہیں ہوگی۔ ایک مزدور اپنی استعداد کے مطابق باہر میدان میں آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے اور ایک انجینئر اندر میز پر بیٹھا اپنی صلاحیت کے مطابق آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے۔ تو جہاں تک محنت کا تعلق ہے، اس میں تو یہ دونوں برابر ہیں۔ پس دونوں اپنی محنت کے اعتبار سے یکساں معاوضہ کے مستحق ہونگے۔

اب آتی ہے دوسری قسم جو باوجود صلاحیت و وسعت کے کسی قسم کی محنت نہیں کرتے۔ یہ لوگ کسی معاوضہ کے مستحق نہیں۔ اگر وہ کام کی استعداد و صلاحیت ہونے کے باوجود کم محنت کرتے ہیں تو وہ کم معاوضہ کے مستحق ہونگے۔ اس لیے کہ

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (سورہ النجم۔ آیت 39)

کے تحت معاوضہ صرف بمقدار محنت ہوگا۔ اور یہ ایک اٹل قانون ہے

جس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص استطاعت کے باوجود محنت نہ کرے اور اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسرے اٹھائیں۔

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (سورہ النجم۔ آیت 38)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا (یہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے)۔

قرآن کے معاشی نظام میں ان مفت خوروں (مترفین) کے لیے کوئی جگہ نہیں جو صلاحیت کے باوجود محنت نہ کریں اور دوسروں کی محنت پر گزارہ کرنا چاہیں۔

رہا اب مسئلہ تیسری قسم کے لوگوں کا۔ تو اگر تو عین عدل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ لوگ بھی کسی معاوضہ کے مستحق نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کسی معذوری کے سبب محنت نہیں کر پا رہے۔ لیکن قرآن کے معاشی نظام میں عدل کے ساتھ ساتھ ''احسان'' بھی ہے۔ احسان کے معنی ہیں معاشرہ میں کہیں کوئی نقص یا کمی (Deficiency) دیکھ کر اسے دور کر دینا تاکہ معاشرہ کا حسن و توازن برقرار رہے۔ پس ایسے لوگوں کو اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عدل کی رو سے نہیں بلکہ احسان کی رو سے دیا جائیگا۔ ''وبالوالدین احساناً'' کے حکم پیچھے یہی حکمت کارفرما ہے۔ کہ کمانے کی صلاحیت کم ہو جانے اور خودمختاری کی عمر گزر جانے کے بعد اپنے والدین کو ایسا بہترین سہارا دیا جائے جیسا انہوں نے آپ کو بچپن میں دیا۔ ان کی کمی کو پورا کرتے

ہوئے ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔یہی احسان کہلاتا ہے۔

محنت کے معاوضہ کی مختلف صورتوں کی وضاحت کے بعد اب انسان کی اکتسابی استعداد (کمائی کرنے کی صلاحیت) پر کچھ روشنی ڈالی جائیگی:

اکتسابی استعداد اور ضروریاتِ زندگی (Earning Capacity and Necessities)

اس کیٹگری کے لحاظ سے بھی افراد معاشرہ تین اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں۔

(1) ایسے لوگ جو اپنی استعداد کی زیادتی کی وجہ سے اپنی ضروریات سے زیادہ پیدا کرتے ہیں۔

(2) ایسے لوگ جو استعداد میں کمی کی بناء پر اپنی ضروریات سے کم پیدا کر پائیں۔(سائل)

(3) ایسے لوگ جو استعداد کی عدم موجودگی کی بناء پر کچھ بھی نہ پیدا کر سکیں۔(محروم)

(ایسا طبقہ جو استعداد کی موجودگی کے باوجود کچھ بھی محنت نہ کرے، موضوع سے خارج ہے)

اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ یہ استعداد کی زیادتی تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔اس کے اسباب و ذرائع تو تمہارے اختیار و ارادہ کی حدود سے بھی باہر تھے۔

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰه (سورہ النحل۔آیت 53)

اس لیے اس پیداوار کے مجموعی طور پر تم اکیلے مالک نہیں ہو سکتے۔تمہیں حصول رزق کی صلاحیت میں ایک دوسرے پر جو فوقیت حاصل ہے، وہ تو میری طرف سے ہے۔اس لیے اس اضافی استعداد سے پیدا ہونے والی پیداوار کا مالک بھی میں ہی ہوں۔اس لیے جس چیز کا مالک میں (اللہ) ہوں، وہ میرے قانون ربوبیت (مخلوق کی پرورش کا نظام) کے تحت صرف کی جائیگی۔اور جو چیز میری ہے وہ میں نے کس کے لیے وقف کر رکھی ہے؟؟؟ اس دوسری اور تیسری قسم کے لوگوں کے لیے جنہیں اوپر ''سائل اور محروم'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔

وَفِيٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (سورہ الذریات۔آیت 19)

اور ان کے مال میں سائل اور محروم دونوں کا حق ہوتا ہے۔

سائل اسے کہتے ہیں جو کم استعداد کی بناء پر اپنی ضروریات کے مطابق پیدا نہ کر پائے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مزید مالی امداد درکار ہو۔جنہیں ہم عام زبان میں غریب، متوسط طبقہ کہتے ہیں۔

دوسری طرف محروم وہ طبقہ کہلاتا ہے جو بیچارے استعداد اور صلاحیت نہ ہونے کے باعث کچھ بھی نہ پیدا کر پائیں۔ وہ لوگ جو عام زبان میں فقیر، نادار، معذور، بے بس لوگ کہلاتے ہیں۔

اللہ کہتا ہے کہ میں رب کائنات ہوں۔ پس میری دی ہوئی صلاحیتوں اور میرے دئے ہوئے وسائل سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے، جو رزق پیدا ہوتا ہے، اس کی تقسیم میرے دئے ہوئے اصولوں کے مطابق کرو۔ اور وہ اصول یہ ہے۔

وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (سورہ الذریات۔ آیت 19)

لفظ ''حق'' کی وضاحت

ان کے مال میں سائل اور محروم دونوں کا حق ہے۔ حق کے لفظ پر غور کیجیے۔ یعنی یہ لوگوں کو دیا جانیوالا کوئی چندہ خیرات یا بھیک نہیں ہے۔ یہ ان کا حق (Legitimate Right)۔ وہ لوگ اسے آپ سے بطور استحقاق طلب کر سکتے ہیں۔ بطور خیرات نہیں۔ آپ سے تقاضا کر سکتے ہیں کہ ہمیں ہمارا یہ حق دو۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا کہ یہ

مال اور نعمتیں جو وسائل پیداوار سے حاصل ہوئیں، سب اللہ کی ملکیت ہیں۔ اور خدا نے اپنی ملکیت کو سائلین اور محرومین کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ کیسا عظیم ہے ہمارا رب۔ جو ہمیں ماں کی طرح پالتا ہے۔

وسائل پیداوار

اب رہ گیا تیسرا اور آخری عنصر جو ایک انسان کی کمائی میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی وسائل پیداوار۔ تو پیچھے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ سب نعمائے خداوندی ہیں۔ اللہ کی نعمتیں جن پر کسی کی ذاتی ملکیت یا حد بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب کے لیے یکساں طور پر کھلی ہیں۔ اسی لیے قرآن پوچھتا ہے کہ تم ان تمام نعمتوں کو ربوبیت عامہ کے لیے کھلا کیوں نہیں رکھتے ؟

وَمَا لَکُمۡ اَلَّا تُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (سورہ الحدید۔ آیت 10)

کیونکہ

وَلِلّٰہِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (سورہ الحدید۔ آیت 10)

زمین و آسمان کی تمام ملکیت اللہ ہی کی ہے۔ (تمہاری نہیں)

اب سرمایہ داری نظام کی جانب سے پیش کی جانیوالی اس ''دلیل'' کو سامنے لائیں جو میں نے مضمون کے آغاز میں پیش کی تھی۔ یعنی جن لوگوں میں کمانے کی صلاحیت زیادہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ سب ہماری ذاتی ہنر مندی کا نتیجہ ہے۔ ''انما اوتیتہ

علی علمٍ عندی'' ۔اس لیے ہم اس کے بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔اور چونکہ ہم اسی سرمایہ سے زمینیں خرید کر جائیداد بناتے ہیں،اس لیے ہم ان کے بھی مالک ہیں۔جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ سرمایہ داری نظام کی ساری بنیاد اسی ایک دلیل پر قائم ہے۔اوراسی دلیل کو سامنے رکھتے ہوئے جو تفصیلی وضاحت یہاں گزشتہ سطور میں آپ کے سامنے پیش کی گئی،وہ آپ کے سامنے ہے۔

انسانی جسم کے حواس خمسہ بھی منجانب اللہ

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف جہاں وسائل پیداوار یعنی زمین کو بنیادی حیثیت دی ہے،اسی طرح اس نے انسانی جسم میں موجود حواس خمسہ (قوتِ سماعت،بصارت،قوتِ تفہیم،قوتِ فیصلہ وغیرہ) کو بھی ویسی ہی بنیادی حیثیت دے کر انہیں بھی اپنی ہی عطا کردہ نعمتیں قرار دیا ہے۔حواس خمسہ انسان کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں جن کی مدد سے پھر ذہن کسی نتیجہ تک پہنچ کر فیصلہ کرتا ہے۔

ان صلاحیتوں کے متعلق قرآن متعدد مقامات پر واضح کر چکا ہے کہ یہ نہ انسان کی اپنی خریدی ہوئی ہیں نہ ہی اس کی پیدا کردہ ہیں۔یہ منجانب اللہ ہیں۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْءٍ(سورہ النحل۔آیت 78)

جب تم ماؤں کے پیٹوں سے نکلتے ہو تو علم سے بالکل کورے ہوتے ہو۔ناواقف۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ(سورہ النحل۔آیت 78)

خدا نے تمہیں پھر ذرائع معلومات اور قوتِ فیصلہ عطا کی۔

يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ(سورہ النحل۔آیت 83)

یہ لوگ رب کی دی ہوئی نعمتوں کو پہچانتے ہیں۔پھر بھی ان کا انکار کرتے ہیں (اللہ کی امانت سمجھنے کی بجائے ذاتی ملکیت سمجھ لیتے ہیں)۔یہی کفر کا وہ شیوہ ہے جسے اکثر لوگ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ(سورہ العلق۔آیت 4)

یعنی زبان کے ذریعہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا طریقہ۔نیز لکھنے کی صلاحیت بخشی۔

عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ(سورہ العلق۔آیت 5)

اور اس طرح انسان اس قابل ہو گیا کہ جن امور کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا،ان کا علم حاصل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے تو صحیح الدماغ ہونے کو بھی اپنی ایک نعمت قرار دیا ہے۔ جب مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا کہ:

مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ (سورہ القلم۔آیت 2)

یہ اللہ کی نعمت ہے کہ تو پاگل نہیں بلکہ صحیح الدماغ ہے۔

ایک جگہ اللہ نے وسائل پیداوار اور انسانی صلاحیتوں کے بنیادی ذرائع کا اکٹھا ذکر کیا ہے جہاں کہا کہ:

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ (سورہ یونس۔آیت 31)

ان سے پوچھو کہ کون ہے جو زمین و آسمان سے سامانِ رزق عطا کرتا ہے؟ اور تمہارے ذرائع معلومات (سمع و ابصار) پر اس کا مکمل کنٹرول ہے۔

اس کے بعد اللہ فرماتا ہے کہ لوگ یہ بات تسلیم کریں گے کہ ایسا ہی ہے (یہ سب اللہ کا ہی دیا ہوا ہے)۔

فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ (سورہ یونس۔آیت 31)

وہاں تو یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ خارجی دنیا میں اللہ کا قانون ہی کارفرما ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اپنی اس روزمرہ کی معاشی دنیا میں اللہ کے قانون کو تسلیم کرنے اور ماننے پر تیار نہیں۔ وہاں یہ اپنے ہی خود ساختہ قوانین کے تحت تقسیمِ رزق کرتے پھرتے ہیں۔ اسے ہی خدا کا انکار کہا جاتا ہے۔ دہریت (Athiesm) یہی ہے۔

ذہنی صلاحیتوں اور استعداد میں فرق کیوں ہوتا ہے؟

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اپنی ذہنی استعداد سے پیدا شدہ رزق کا انسان اکیلا مالک نہیں تو پھر انسانوں میں اس قدر ذہنی فرق رکھا ہی کیوں گیا؟ سب کو یکساں معاشی استعداد کیوں نہ دے دی گئی؟ تاکہ معاشی ناہمواریوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ قرآن اس سوال کا بھی جواب دیتا ہے۔

دیکھیں۔ دنیا میں دو مخلوقات آباد ہیں۔ انسان اور حیوانات۔ اگر ہم حیوانات کو دیکھیں تو ان کی کسی بھی نوع کے جانوروں میں استعداد کا باہمی فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً تمام ہرن، شیر، چیتا، گھوڑا اور ہاتھی ایک جیسی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اس لیے ان میں معاشی ناہمواریوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ان حیوانات کی زندگی کا مقصد سوائے پیدا ہونے، کھانے پینے، افزائش نسل کرنے اور پھر مر جانے کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے؟ وہ جس حالت میں دنیا میں آتے ہیں، اسی حالت میں دنیا کو چھوڑ کر مر

جاتے ہیں۔روزِ ازل سے آج تک یہی صورتحال جاری ہے۔

اس کے برعکس انسان کو لیجیے تو اللہ نے اسے قوتِ تخلیق عطا کی ہے۔یہ دنیا میں آتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے دنیا کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔یہ جو آج دنیا لاکھوں سال پہلے کی نسبت اتنی خوبصورت نظر آتی ہے، یہ اسی انسان کی وجہ سے ہی ہے۔ انسان فطرت کی طرف سے خام مال (معدنیات، مٹی، پانی، تیل، گیس وغیرہ) کو لیتا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی مدد سے اس خام مال کو ایک نئی دنیا میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس تمام تخلیقی عمل میں کس قدر مختلف نوعیت کے کام درکار ہوتے ہیں، اس بات کا خود ہی اندازہ لگا لیجیے۔کوئی بھی کام لے لیجیے، اس میں دو امور کی ضرورت ہوگی۔

منصوبہ بندی (Planning)

اس منصوبے پر عمل درآمد (Execution)

پہلا مرحلہ منصوبہ بندی یعنی تدبیر کا ہوتا ہے۔اب ظاہر ہے اس کے لیے قوتِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا مرحلہ عمل درآمد کا ہوتا ہے یعنی اسی سوچے ہوئے منصوبے پر عمل درآمد۔اس کے لیے ظاہر ہے جسمانی قوتوں کی ضرورت ہوگی۔کام دونوں یکساں ہیں۔اگر تمام انسانوں کی صلاحیتیں یکساں ہو جائیں گی، تو پھر تقسیمِ کار (Division of labor) ناممکن ہو جائیگی۔یہی وہ مقصد ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا گیا ہے۔

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيًّا (سورہ الزخرف۔آیت 32)

ہم نے درجات کا یہ اختلاف اسی لیے رکھا کہ اس سے معاشرہ میں مختلف نوعتوں کے کام مختلف لوگوں سے لیے جاسکیں۔

قرآن کہتا ہے کہ صلاحیتوں کا یہ اختلاف ہی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں تقسیمِ کار ممکن ہوئی ہے اور یہ انسانی دنیا میں نت نئے شاہکاروں کی تخلیق کا ضامن ہے۔سوچنے والے نہ ہونگے تو عمل درآمد کرنے والے کچھ نہیں کر پائیں گے۔اور اگر عمل درآمد کرنے والے نہ ہونگے تو سوچنے والوں کی منصوبہ بندی محض کاغذوں تک ہی محدود رہے گی۔اس دنیا میں ذہنی اور جسمانی دونوں قوتوں کی ضرورت ہے اور دونوں محنت کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ان میں تقسیم صرف تخصیص کار کے مقصد سے ہے، نہ کہ معاشی مقصد سے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے تو اس سے یہ نظریہ بھی کسی صورت قائم نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن انسانوں میں ہندووں کی طرح کسی پیدائشی تقسیم کا قائل ہے۔ ہرگز نہیں۔ اللہ کی تعلیم اس کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے لحاظ سے ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ سب بچوں کا ایک ہی طبقہ ہوتا ہے۔ اس لیے سب انسانی بچوں کی تعلیم وتربیت یکساں خطوط پر ہونی چاہیے۔ یہی ربوبیت کہلاتی ہے۔ ہاں اس کے بعد وہ اپنے اپنے شوق، ذہنی رجحان، اور استعداد کے لحاظ سے جس جس کام کے لیے مناسب ہوتے جائیں، وہی ان کے سپرد کیا جاتا رہے۔ جو بہتر انداز میں زیادہ پڑھ لکھ جائیگا، وہ ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ بن جائیگا، اور جو پڑھنا نہ چاہے گا، جسمانی کام کی جانب رجحان رکھتا ہوگا، وہ جسمانی کام کے لیے منتخب کرلیا جائیگا۔ اس پر پیدائش کا کچھ بھی اثر نہیں ہوگا کہ فلاں بچہ کسی غریب کسان یا مزدور کے گھر پیدا ہوا، پس اسے مزدور ہی رکھا جائیگا۔ اگر چہ وہ کتنا ہی ذہین اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اور فلاں بچہ ڈاکٹر یا انجینئر کے گھر پیدا ہوا اس لیے اس کا حق ڈاکٹری یا انجینئرنگ کا پیشہ ہی ہے۔ چاہے وہ کیسا ہی کند ذہن کیوں نہ واقع ہوا ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ قرآن کی تعلیم نہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ یہ دونوں بچے ابن آدم ہیں۔ انہیں ریاست کی جانب سے تعلیم وتربیت کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ اگر مزدور کا بچہ قابل نکلا تو وہ آگے پڑھتا جائیگا، اور انجینئر بن جائیگا اور اسے منصوبہ بندی، تدبیر اور فکری کاموں کے لیے منتخب کرلیا جائیگا۔ اور اگر انجینئر کے بچے کا پڑھائی کی جانب دھیان نہ ہوا، اور کند ذہن ہونے کی وجہ سے وہ پڑھائی کی بجائے جسمانی محنت کے لیے زیادہ موزوں ہوا تو پھر اسکے سپرد جسمانی محنت کے کام کیے جائیں گے۔ لیکن محنت کے اعتبار سے دونوں یکساں معاوضہ کے مستحق ہونگے۔ ان کی تفریق صرف تقسیم کار ہی کے لیے ہوگی، معاشی تقسیم مقصد نہیں۔

انسانی معاشرہ میں درحقیقت جو چیز خرابی اور مسائل کا باعث بنتی ہے وہ یہی ہے کہ مختلف گھرانوں میں پیدا ہونے والے سب بچوں کو یکساں تعلیم وتربیت کے مواقع بہم نہ پہنچانا۔ اس میں ان کی مختلف صلاحیتوں کا کردار نہیں۔

قرآن پیدائشی تفریق کا قائل ہی نہیں۔ وہ تمام بنی آدم کو یکساں تصور کرتا ہے۔ اور ان کے لیے یکساں مواقع فراہم کرنے کی ہدایت کرتا ہے کہ ہر ایک کی مضمر صلاحیتیں اپنے اپنے انداز میں نشوونما پاسکیں۔ اور ایسا صرف اسی معاشرہ میں ممکن ہے جہاں قرآن کا بتایا ہوا نظام ربوبیت قائم ہو۔

پھر یہاں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جب کسی معاشرہ میں تعلیم وتربیت کے مواقع سب کو یکساں طور پر فراہم کیے

جاتے ہیں تو ان کی ذہنی صلاحیتیں بھی بلند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔لیکن پھر بھی اپنی اپنی ذہنی استعداد، صلاحیتوں اور طبیعت کے رجحان میں فرق بہر حال برقرار رہے گا۔یعنی اس سے معاشرہ کی ذہنی سطح بلند ہونا ضرور شروع ہو جاتی ہے۔لیکن انسانوں میں انفرادی صلاحیتوں اور خصلتوں میں فرق تب بھی کسی حد تک برقرار رہے گا۔یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔دنیا میں جو معاشرے بھی نسبتاً ترقی یافتہ ہیں اور وہاں معیار زندگی دوسرے مما لک کی نسبت بلند ہے، وہاں بھی بہر حال کند ذہن، کم صلاحیتوں والے اور جسمانی محنت کے لیے موزوں انسان پائے جاتے ہیں۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب کم اور زیادہ صلاحیتیں اللہ کی جانب سے محض دنیا میں تقسیم کار ممکن بنانے کے لیے عطا کی ہوئی ہیں۔اس میں انسانی کسب وہنر کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔اسے معاشی تفریق کی وجہ نہیں بنایا جا سکتا۔اسی لیے ان صلاحیتوں سے پیدا ہونے والا رزق بھی اللہ کی مرضی سے ہی تقسیم کیا جائیگا۔نہ کہ انسانوں کے بنائے ہوئے ذاتی معیارات سے۔

اب رہی یہ بات کہ مختلف انسانوں میں صلاحیتوں کا فرق آخر ہوتا کیسے ہے تو اس مسئلہ پر اہل مغرب کے ہاں کافی ریسرچ کی جاتی رہی ہے۔

ماہرین حیاتیات کا کہنا ہے کہ مختلف انسانوں میں عقلی فرق ان کی دماغی ساخت کی بناء پر ہوتا ہے۔پھر بعد میں ہر کسی کا متضاد ماحول اس فرق کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔اگر چہ اس پر تحقیقات جاری ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں معاشرہ ترقی کرتا ہے، انسانوں کا یہ فرق کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگوں کی ذہنی استعداد میں زیادہ فرق برقرار نہ رہے۔اب ظاہر ہے جب انسان اس حد تک ترقی کر جائیگا تو یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس دور کا معاشی نقشہ ہمارے اس دور جیسا نہ ہو۔عین ممکن ہے انسان ایک ایسی سٹیج پر پہنچ جائے جہاں دنیا کے ہر کام کے لیے مشینیں ایجاد کر لی جائیں اور زیادہ تر انسان صرف فکری منصوبہ بندی کا کام ہی سرانجام دیں۔اس وقت اگر چہ جسمانی کام کاج کرنیوالوں کی ضرورت شاذ و نادر ہی ہوگی۔لیکن اس وقت مشینوں کا استعمال پیداوارِ رزق کو اتنا زیادہ بڑھا دے گا کہ ہر انسان کو وافر مقدار میں سامانِ رزق میسر آ رہا ہوگا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اس وقت بھی انسانوں کی استعداد و صلاحیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور برقرار رہے گا۔کیونکہ انسان ایک جیتا جاگتا، بااختیار وارادہ کی حامل ذی روح مخلوق ہے جو مختلف عناصر سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔کوئی لوہے سے تیار کردہ مشین نہیں کہ تمام مشینیں ایک ہی جیسا کام سرانجام دیں گی اور ان کی پیداوار میں کوئی فرق نہ

ہوگا۔

انسان کی غلط سوچ

قرآن کہتا ہے کہ انسان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے استعداد کے فرق کو معاشی تقسیم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ کہ جو کچھ جتنا کماتا ہے، اتنے کا ہی حقدار ہے۔ زیادہ کمانے والا اسے کیوں دے؟ انسان کی اس غلط سوچ نے اس دنیا کو جہنم بنا کر رکھ دیا۔ انسان کی یہ حماقت ہے کہ وہ اس جہنمی معاشرہ کے وجود کے لیے اسے بطور دلیل پیش کرتا ہے کہ اگر زیادہ استعداد کے مالک اپنی زیادہ کمائی کو کم استعداد والوں کی جانب منتقل کر دیں گے تو ایسے تو سب برابر ہو جائیں گے۔ یہ اس کی بھول ہے۔ استعداد کی زیادتی انسان کی اپنی پیدا کردہ ہے ہی نہیں۔ یہ تو اسے خدا کی جانب سے مفت ملی ہے۔ اس لیے اس استعداد سے کی جانیوالی کمائی پر بھی ان کا نہیں، خدا کا حق ہے۔ اور خدا نے اپنا حق ان غریبوں کے لیے رکھ دیا ہے جن کی اپنی کمائی سے ''پوری نہیں پڑتی''۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ اختلاف صرف کاموں کی تقسیم (Division of Labour) کے لیے ہے، تقسیمِ رزق کے لیے نہیں۔ رزق کی تقسیم صرف ضرورت کے لحاظ سے ہی کی جائیگی۔ جو لوگ زیادہ صلاحیت کی بناء پر زیادہ کماتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس ساری کمائی پر صرف انہی کا حق ہے۔ ان کی کمائی میں زیادہ تر وہ عناصر شامل ہیں جن پر ان کا کچھ بھی اختیار ارادہ نہ تھا۔ اس لیے وہ ان عناصر سے پیدا شدہ رزق میں صرف اپنی ضرورت کے مطابق ہی لینے کے مجاز ہیں۔ باقی سارا ان لوگوں کا حق ہے جو کم استعداد کے حامل اور ان کی زیرِ ہدایت کام کرتے ہیں۔

> وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ (سورہ النحل۔ آیت 71)
>
> اللہ نے تم میں سے بعض کو اکتسابِ رزق کی استعداد میں برتری دی ہے۔ جنہیں یہ استعداد زیادہ ملی ہے، وہ زیادہ رزق کو ان لوگوں کی جانب نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ کہ ''ایسے تو گدھا گھوڑا برابر ہو جائیں گے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ انہیں استعداد کی زیادتی اللہ کی جانب سے بطور نعمت ملی ہے، ان کے ذاتی ہنر یا اختیار و ارادہ کی حاصل شدہ نہیں۔

اللہ کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (سورہ النحل۔ آیت 53)۔ جو کچھ انہیں بطور نعمت ملا

ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے۔اور جو کچھ ان سب ذرائع سے حاصل ہوتا ہے، وہ بھی اللہ کا ہی ہونا چاہیے۔نہ کہ انسان کی ذاتی ملکیت۔

قارئین آپ نے دیکھا کہ قرآن نے اس مسئلہ کو کتنی خوبصورتی سے حل کر کے رکھ دیا۔وہ مزید کہتا ہے کہ جو لوگ رزق کمانے کی صلاحیت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے دین اور نظام ربوبیت کی تکذیب کرتے ہیں۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ (سورہ الماعون۔آیات 1تا3)

کیا تو نے ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو دین (قانون ربوبیت) کو جھٹلاتا ہے؟ (اس کی حالت اور کردار پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ) یہ شخص تنہا اور بے سہارا رہ جانیوالے افراد معاشرہ کو دھکے دیتا ہے۔اور مساکین کی پرورش کی جانب راغب نہیں ہوتا۔

شکر ہے رزق ابھی زمین سے ایک حساب کتاب سے نکلتا ہے۔اگر ایک دم سارا نکل سکتا تو یہ ''ذہنی استعداد کے مالک'' نہ جانے سارا سمیٹ کر کدھر لے جاتے۔

اللہ فرماتا ہے کہ ابھی تو باعثِ غنیمت ہے کہ زمین سے رزق ایک اندازے سے نکلتا ہے۔اور یہ انسانی بس کی بات نہیں کہ زمین کے تمام مخفی خزانے ایک دم باہر نکال لے۔ورنہ اگر اس کو اس امر پر بھی اختیار ہوتا تو نہ جانے یہ ''ذہنی استعداد کے مالک'' کیا کچھ کر گزرتے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ (سورہ الشوریٰ۔آیت 27)

انسان کا حق صرف بقدر محنت

مندرجہ بالا وضاحت سے یہ حقیقت کھل کر واضح ہو گئی کہ انسان اپنی کمائی میں سے صرف بقدر محنت ہی لے سکتا ہے۔ذہنی صلاحیتوں کی زیادتی یا وسائل پیداوار اور سرمایہ کی ملکیت کی بناء پر کچھ نہیں لے سکتا۔یہ سب خدا کا حصہ ہے اور خدا کا یہ حصہ اسی کی جانب سے تمام نوع انسانی کی یکساں پرورش کے لیے عام کر دیا گیا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ سرمایہ داری نظام کی یہ دلیل کہ ہر شخص جو اپنی صلاحیت کی زیادتی کی بناء پر زیادہ کما سکتا ہے، وہ اپنی کمائی کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، مبنی بر حقیقت نہیں بلکہ محض نگاہ کا فریب ہے۔

یہودی ذہنیت کی مالک مذہبی پیشوائیت :سرمایہ داریت کا دایاں بازو

سرمایہ داری نظام اس دلیل کو نہ صرف خود پیش کرتا ہے بلکہ مذہب کے علمبرداروں (مذہبی پیشوائیت) سے بھی پیش کرواتا ہے جو خود اسی سرمایہ داری نظام کے پیدا کردہ ایجنٹ ہوتے ہیں۔اور وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی کمائی سے خرید کردہ جائیداد پر پورا پورا حق ہے اور یہی حق ملکیت اسے وراثتاً ملتا ہے۔پس اسے اس حق سے محروم کرنا ''شرعاً'' ناجائز ہے۔''شرعاً'' سے ان کی مراد وہ شریعت ہوتی ہے جو ان کے دور ملوکیت کی پیدا کی ہوئی چلی آ رہی ہے۔نہ کہ اللہ کی جانب سے نازل کردہ۔وہ شریعت جس کی ایک ایک شق کتاب اللہ قرآن کے خلاف ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ دلیل پیش کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ اگر معاشرہ میں تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی چلی گئیں تو غریبوں اور محتاجوں کا وجود ہی ختم ہو جائیگا۔اور اس طرح صدقہ اور خیرات کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہے گی۔یعنی ان کے نزدیک غریبوں اور محتاجوں کا باقی رہنا بہت ضروری ہے تا کہ امیر لوگ انہیں صدقہ خیرات دے کر ''ثواب'' حاصل کر سکیں۔

پھر مذہبی پیشوائیت یہ بھی کہتی ہے کہ اگر ذاتی ملکیت نہ رہے تو وراثت کے احکامات کی گنجائش نہیں رہتی۔یہ تو ذرا آگے چل کر واضح کیا جائیگا کہ صدقہ، خیرات اور وراثت کے احکامات کا دراصل مقصد کیا ہے۔لیکن فی الوقت اس دلیل کے ''بودھے پن'' کو ملاحظہ فرمائیں:

اگر ایسی بات ہے کہ غریب اور محتاج باقی نہ رہیں تو صدقہ خیرات کے احکامات کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔اور اگر ذاتی ملکیت نہ رہے تو پھر ترکہ کے احکاماتِ قرآنی کس کے لیے ہیں؟ پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ لوگوں کو اپنی صحت کا بھی کوئی خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ایسی کوئی کوشش کرنی جائز نہیں جس سے انسان تندرست و توانا رہے۔کیونکہ اگر انسان تندرست رہا اور بیمار نہ ہوا تو ہسپتال بند کرنا پڑیں گے۔دوائیوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ڈاکٹرز بیکار ہو جائیں گے۔

مذہبی پیشوائیت کے اس دھوکہ کا پردہ چاک کرنے کے لیے قرآن میں اللہ نے یہودیوں کی ایک ذہنیت کا ذکر کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ پہلے اپنے کمزور اور نادار لوگوں کو گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔پھر اگر فریق مخالف انہیں گرفتار کر لیتا تو فدیہ دے کر چھڑوا لیتے تھے۔یہودیوں کے ہاں قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑوانا ثواب کا کام تھا۔یعنی وہ ''ثواب'' کے حصول کی خاطر ایک ایسا طبقہ پیدا کر لیتے تھے جو قیدی ہو جائیں۔پھر چندے جمع کر کے انہیں آزاد کروایا

جاتا۔جیسے داتا دربار میں چڑیاں پکڑ پکڑ کر چھوڑی جاتی ہیں۔

یہی ذہنیت اس گروہ کی ہے جو ایک طبقہ اپنے اندر مستقل طور پر محتاجوں اور محروموں کا رکھنا چاہتا ہے۔تا کہ انہیں خیرات دے دے کر ثواب حاصل کرے۔اللہ کہتا ہے کہ اس ذہنیت کا نتیجہ حال اور مستقبل دونوں کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

فَمَا جَزَاء مَن يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنكُمْ إِلاَّ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 85)

تم ایسے قول واقرار کے بعد بھی آپس میں خونریزیاں کرتے ہو اور اپنے غریب بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو۔اور بجائے اس کے کہ تمہارا معاشرہ تم مجرموں کے خلاف کوئی کاروائی کرے،تم الٹا ان غرباء پر ظلم واستبداد میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہو۔کمزوروں کو کمزور بنانے اور ظالموں کی حوصلہ افزائی کے ذریعہ۔اور ستم ظریفی یہ کہ جب ان گھروں سے نکالے ہوئے غریب لوگوں کو دوسرے پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم بڑے خداترس بنتے ہوئے آگے بڑھتے ہو اور ان کا زرفدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے ہو۔اور سمجھتے ہو کہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے۔حالانکہ تم نے خود ان لوگوں کو گھروں سے نکال کر سب سے بڑا جرم کیا تھا۔سو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم قانون خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے کا انکار کرتے ہو۔جس طرح زندہ انسانی جسم کے ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے،اسی طرح قانون خداوندی کو بھی حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔اسے مانا جائے گا تو مکمل طور پر مانا جائیگا،اور اگر کسی ایک بھی شق کا انکار پورے ضابطہ حیات کے انکار کے مترادف ہوگا۔

غور کیجئے کیا آج ہم مسلمانوں کی یہی حالت نہیں؟؟

کیا آپ جانتے ہیں؟

56 کروڑ 70 لاکھ افراد پر مشتمل 41 مقروض ممالک کی مجموعی GDP (خام ملکی پیداوار) دنیا کے 7 امیر ترین افراد کی مجموعی دولت سے کم ہے۔

(The World Bank Group:Voice of the Poor. Statistics as of June 2 011)

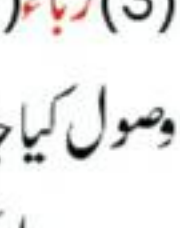

معاوضہ اور اس کی مختلف صورتیں

معاشی زندگی میں ایک انسان دوسروں سے جو کچھ لیتا ہے، اس کی مندرجہ ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں۔

(1) عطیہ (Donations): اس میں نہ محنت کرنا پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفہ کے طور پر دے دیتا ہے۔ اسی لیے اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی صورت ''صدقہ'' کی ہے جسے کسی ضرورتمند کو واپسی کے خیال کے بغیر دے دیا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے ضرورتمند اس امداد کو اپنے استحقاق کے طور پر معاشرہ سے طلب کرسکتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(2) اجرت (Wages): یہ انسان کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی سرمایہ نہیں لگایا جاتا۔ صرف فکری یا جسمانی محنت ہوتی ہے۔

(3) رباء (Usury): اس میں کسی دوسرے کو کچھ سرمایہ دیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ بعد اس سرمایہ سمیت اصل رقم سے زائد وصول کیا جاتا ہے۔ یعنی سرمایہ + سرمایہ کا معاوضہ۔ اس میں سرمایہ دینے والا کوئی محنت نہیں کرتا بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کرتا ہے۔

(4) تجارتی منافع (Trade Profit): اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(5) جوا، سٹہ (Gambling): اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

عطیات و تحفہ جات کے علاوہ مندرجہ بالا فہرست میں ایسی جو بھی شکلیں جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، قرآن کی رو سے ناجائز ہیں۔ قرآن کا اصول ہے کہ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ ''لیس للانسان الا ماسعی''۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ انہیں اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ تجارت (بیع) کے منافع اور ربوٰ میں کیا فرق ہے۔

ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے۔ ساتھ ہی دوسرا شخص سو روپے کسی کو قرض دے کر اس سے

ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔اسے بھی اصل رقم پر دس روپے زائد مل جاتے ہیں۔تو جب دونوں صورتوں میں اصل زر پر زائد رقم مل رہی ہے تو ان میں فرق کیا ہے؟

بیع اور الرباء میں فرق

قرآن کہتا ہے کہ

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا (سورہ البقرہ۔آیت 275)

وہ بیع اور رباء کو ایک جیسا سمجھتے ہیں۔

یہ ان کی بھول ہے۔قرآن کہتا ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں ہوتے ہیں۔سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس مل جاتا ہے۔اور دوکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔جو حلال ہے۔لیکن رباء میں صرف سرمایہ ہی لگتا ہے۔محنت کوئی نہیں ہوتی۔پس ربٰوا میں جو بھی زائد ملتا ہے،وہ سرمایہ ہی کا معاوضہ ہوتا ہے پس حرام ہے۔اس لیے کہ قرآن کے اصول کی رو سے

(1) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے اور

(2) سرمایہ پر زائد لینا حرام

اگر تجارت یعنی بیع میں بھی اگر کوئی شخص اپنی محنت سے زائد لیتا ہے تو وہ بھی حرام ہی کے زمرے میں آئے گا۔کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا،محنت کا نہیں۔اس بات کا تعین صرف معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے؟اور وہ اس منافع سے زائد نہیں لے سکتا۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ بیع میں انسان رسک (Risk) لیتا ہے۔یعنی تجارت میں نفع و نقصان دونوں کا مساوی احتمال ہوتا ہے۔جبکہ رباء میں رسک فیکٹر نہیں ہوتا۔لیکن حلت و حرمت کے یہ معیار درست نہیں۔اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط صرف رسک ہو تو پھر جوا اور قمار بازی تو عین حلال ہونی چاہیے تھی۔کیونکہ اس کے تو ہر داؤ میں رسک ہوتا ہے۔

بیع اور ربٰوا میں فرق وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔بیع میں راس المال اور محنت کا معاوضہ شامل ہوتا ہے۔اور ربٰوا میں راس المال اور راس المال کا ہی معاوضہ واپس ملتا ہے۔محنت کا معاوضہ حلال ہے اور راس المال کا معاوضہ حرام۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں رباء کی بہت سی ایسی شکلیں موجود ہیں جنہیں قرآن تو حرام قرار دیتا ہے مگر ہماری خود ساختہ

''شریعت'' اسے حلال سمجھتی ہے۔مثلاً کاروبار میں ایسی پارٹنرشپ جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔زمینوں کو بٹائی پر دینا،مضاربت وغیرہ۔یا تجارت میں جس قدر منافع بھی لیا جاسکے وغیرہ۔ہمارے اربابِ شریعت کو اپنی غلطی تسلیم کرنا برداشت ہی نہیں۔اس لیے وہ گھما پھرا کر ربوٰا کی ایسی تعریف کریں گے جس سے مندرجہ بالا شکلیں ربوٰا میں نہ آئیں۔ہمارے ہاں سرمایہ دار اوران کے ایجنٹ مذہبی پیشوائیت نامی مفت خور طبقہ بلامحنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ محنت کے تصور سے ہی انہیں پسینہ آنے لگتا ہے۔

معاوضہ صرف محنت کا

کرہ ارض پر موجود وسائل پیداوار جنہیں اللہ تمام انسانوں کے لیے اپنی جانب سے عطا کردہ نعمتیں قرار دیتا ہے۔

ہوا،روشنی،حرارت،پانی،آگ وغیرہ ایسی نعمتیں ہیں جو ہر انسان کے لیے ہر دم کھلی ہیں۔جو مرضی جہاں چاہے وہاں ان تیار شدہ (Ready made) نعمتوں سے استفادہ کرے۔لیکن زمین کا معاملہ ان سے تھوڑا مختلف ہے۔زمین میں جو بھی رزق اللہ نے معدنیات ونباتات وغیرہ کی شکل میں رکھ دیا ہے،وہ سب تیار حالت میں نہیں۔ان کو تیار حالت میں لانے کے لیے محنت (Processing) کرنا پڑتی ہے۔مثلاً خوراک کو مٹی سے نکالنا پڑتا ہے۔معدنیات بھی نکالی جاتی ہیں۔ان سے پھر مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔جنگلات کے ذریعے سامانِ رزق اور روزمرہ استعمال کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔انسان یہ سب خود کرتا ہے۔اوراس پر محنت صرف ہوتی ہے۔

بس سمجھ لیجیے کہ انسان اسی محنت کے ہی معاوضہ کا حقدار ہے۔باقی جو سرمایہ روشنی،حرارت،پانی،آگ اور معدنیات و جنگلات کی شکل میں اللہ نے لگایا تھا۔اس سرمایہ کی کمائی اللہ کو واپس لوٹانا ہوگی۔اس حقیقت کو ایک دنیاوی مثال کے ذریعہ آپ کو ذرا مزید بہتر انداز میں سمجھا دوں:

مثال کے طور پر ہم کسی زمیندار سے زمین بٹائی پر لے کر اس میں کاشتکاری کرتے ہیں۔پھر اس کی پیداوار سے ایک حصہ خود رکھتے اور ایک زمیندار کو دے دیتے ہیں۔صرف اسی لیے کہ زمین کا مالک وہی زمیندار تھا جس پر ہم نے کام کیا۔بالکل یہی صورتحال اللہ نے انسانوں پر واضح کی ہے کہ زمین اور وسائل پیداوار میرے ہیں،پس ان سے رزق پیدا کرو۔اپنی محنت کا حصہ خود رکھو اور میرے سرمایہ کا حصہ مجھے دو۔قرآن میں ارشاد ہے کہ:

''اس مقصد کے لیے تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس میں تمہاری پرورش ہوتی ہے۔اور سوچو کہ یہ سب

تمہارے قوانین کے مطابق ہو رہا ہے یا میرے؟ مثلاً یہ جو کھیتی باڑی تم کرتے ہو، اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہے اور ہمارا کتنا ہوتا ہے؟ تم تو ہل چلا کر بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ یہ کام تم کرتے ہو یا ہمارا قانون کرتا ہے؟" (سورہ الواقعہ۔ آیات 63 تا 74)

پھر کہا:

"پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہارے کھیت کا ہی نہیں، خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانون برساتا ہے؟"

یہ جو سمندر کے پانی سے بادل بنتے ہیں، یہ کون بناتا ہے؟ اگر یہ کام ہم نہ کرتے، اور سمندر کا پانی ویسے ہی کھارا سمندر ہی میں پڑا رہتا تو تم کیسے اسے صاف کر لیتے اور دنیا بھر میں اس کی رسائی کو ممکن بنا لیتے؟ تمہاری حالت یہ ہے کہ چند گیلن سمندری پانی تم نے فلٹر کرنا ہوتا ہے تو تم سمندر کنارے بیٹھے سوچتے رہتے ہو۔ ننھی منی مشینیں بناتے ہو۔ پھر کہیں جا کر چند گیلن پانی تم صاف کر پاتے ہو۔ مگر ہمارا قانونِ پرورش مفت میں کروڑوں گیلن پانی روزانہ سمندر سے اٹھا کر بادلوں کی شکل میں تم تک پہنچاتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس قدر غور و فکر کے بعد بھی تم نہیں سمجھتے کہ یہ سب نعمتیں میری جانب سے ہیں۔ تم خدا کے نشو و نما اور پرورشِ عامہ کے قانون کو سمجھتے ہی نہیں۔

پھر آگ دیکھ لو۔ جس سے تم دنیا کے بے تحاشا کام لیتے ہو۔ کھانا پکاتے ہو۔ یہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت اور احتراق کو یوں سمیٹ کر رکھ دینا تمہاری کاریگری ہے یا میری؟

اس سارے کاروبار میں محنت تمہاری ہے اور سرمایہ (وسائل پیداوار) ہمارا۔ پس تم اس سارے کاروبار میں اپنی محنت کا معاوضہ اپنے پاس رکھ لو اور میرے سرمایہ کی آمدن مجھے دو۔ اب پوچھو گے کہ آپ کا حصہ آپ کو کیسے دوں؟ تو پڑھو یہ آیت۔

وَمَتَاعاً لِّلْمُقْوِينَ (سورہ الواقعہ۔ آیت 73)

ہم نے اپنے اس حصہ کو بھوکوں اور محروموں کے لیے سامانِ رزق بنایا ہے (یہ میرا حصہ ان تک پہنچا دو۔ سمجھو مجھ تک پہنچ گیا)۔

أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ (سورہ الملک۔ آیت 21)

ان سے پوچھو کہ اگر اللہ زمین سے رزق پیدا ہونے کی صلاحیت کو اگر کسی طرح روک لے تو۔۔۔؟؟؟

کون ہے جو تمہیں رزق دے گا؟

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْراً فَمَن يَأْتِيكُم بِمَاء مَّعِينٍ۔ (سورہ الملک۔آیت 30)

اس وقت تو اللہ کے قانون کے مطابق پانی زمین کی پستیوں سے اوپر تک آتا ہے۔لیکن دیکھو اگر یہی پانی زمین سے اوپر آنے کی بجائے نیچے ہی نیچے زمین کے اندر چلا جائے تو تمہارا کیا بنے گا؟ پانی پر ہی تو تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔اس کے بغیر پھر تم کہاں جاؤ گے؟

اسی لیے بس یہی ایک بنیادی بات ذہن میں رکھو کہ جو رزق خدا ہی تمہیں دیتا ہے،اس کی تقسیم بھی اسی خدا کی ہی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔نہ کہ تمہاری ذاتی مرضی کے مطابق۔اور میری مرضی یہی ہے کہ میں نے یہ رزق تمام انسانوں اور جانوروں کے لیے یکساں طور پر اس کرہ ارض پر بکھیر دیا ہے۔ان سب کو یکساں طور پر یہ رزق پہنچاؤ۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَى طَعَامِهِ (سورہ عبس۔آیت 24)

پس اپنی خوراک پر ہی غور کرلو۔(کہ یہ تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر اللہ کی جانب سے مفت میں ملتی ہے)

مَّتَاعاً لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (سورہ عبس۔آیت 32)

اس میں تم اور تمہارے جانوروں سب کے لیے سامانِ رزق ہے(اور اس کا ایسا ہی شفاف استعمال رہنا چاہیے)

قرآن کریم کے ان احکامات کی روشنی میں اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھانا شروع کیا۔جو بڑے بڑے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے،ان کی ملکیت کی حد بندی کرنا شروع کردی۔اس وقت معیار یہی تھا کہ ایک شخص کے پاس صرف اسی قدر اراضی رہے جس کی پیداوار اسکی اور اس کے اہل خانہ کی پرورش کے لیے کافی ہو۔اس طرح زمین پر ذاتی ملکیت ختم کرنے کا آغاز کردیا گیا۔

سورہ الرعد میں ہے کہ رسول اللہ کے دل میں ایک بار خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کی ابتداء میں نے کی ہے، کیا وہ میری زندگی میں پورا ہو پائے گا بھی یا نہیں۔ارشاد باری تعالیٰ نازل ہوا کہ تم فکر نہ کرو۔تمہاری زندگی میں اس کی تکمیل ہو یا بعد میں،تمہارے ذمہ اس پیغام کو عام کرتے چلے جانا ہے۔یہ مکمل ہو کر رہے گا۔چاہے تمہاری زندگی میں یا تمہاری وفات کے بعد۔تم دیکھتے نہیں کہ:

”ہم کس طرح زمین کے ان رقبون کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمیٹتے اور سکیڑتے چلے جارہے ہیں۔یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ انکی ذاتی ملکیت ختم ہوکر رہے گی)۔اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کا رخ نہیں موڑ سکتی۔ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔(سورہ الرعد۔آیت 41)

معاوضہ کا تعین

سرمایہ داری نظام اور سوشلزم دونوں میں ایک محنت کش کے پاس یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی محنت کی اجرت خود مقرر کر سکے۔سرمایہ داری نظام میں وہ سرمایہ دار کا محتاج ہوتا ہے۔جو اجرت وہ مقرر کرے گا،اسی پر کام کرنا پڑے گا۔سوشلزم میں یہی اختیار سرمایہ دار سے اٹھا کر ایک خود ساختہ ریاست کو دے دیا جاتا ہے جو کسی قسم کی مستقل اقدار پر مبنی قوانین کی پابند نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کے ایک گروہ کو حکمران سمجھ کر انہیں ریاست کا نام دے دیا جاتا ہے۔اس نظام میں بھی ریاست معاوضہ مقرر کر دیتی ہے،چاہے اس میں مزدور کا گزارہ ہو یا نہ ہو۔انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔اس لحاظ سے سوشلزم سرمایہ داری نظام سے بھی بدترین نتائج دیتا ہے۔

کیونکہ سرمایہ داری نظام میں تو اگر ایک جگہ مزدور اور سرمایہ دار میں معاملہ طے نہ ہوسکا تو مزدور کے لیے دوسرے آپشنز کھلے ہیں۔اسے کم از کم اتنا اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ اگر یہاں اجرت اچھی نہ ملی تو وہ کسی اور جگہ چلا جائیگا۔لیکن سوشلزم میں تو یہ ذہنی اطمینان بھی چھن جاتا ہے۔وہاں تو وہ ایک قیدی پرندے کی مانند ہوتا ہے۔جہاں بھی جائیگا،معاوضہ ہر جگہ حکومت کی جانب سے طے کردہ ہوگا۔جس میں اس کی ضروریات اور محرومی کا کوئی خیال نہیں رکھا جائیگا۔

اب صلاحیتوں کے اختلاف کو دونوں نظام تسلیم کرتے ہیں۔دوسری جانب یہ بھی مانتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق اجرت ملنی چاہیے۔لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسا پیمانہ ہے جس کی مدد سے آپ یہ اندازہ لگا سکیں کہ فلاں کام کی اجرت اتنی ہو،فلاں کی اتنی ہونی چاہیے۔ایک انجینئر کی اجرت اتنی ہونی چاہیے اور ایک محنت کش کی اجرت اتنی۔

سرمایہ داری نظام ہو یا پھر سوشلزم،یہ فیصلہ بہر حال آجر (Employer) ہی کرے گا کہ فلاں کو اتنا ملنا چاہیے اور فلاں کی اجرت اتنی ہونی چاہیے۔جب فیکٹری کا مالک سیٹھ تھا تو اس بات کا فیصلہ وہ کرتا تھا۔جب حکومت نے وہی فیکٹری نیشنلائز کر لی تو یہی معاوضہ کا تعین برسر اقتدار طبقہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ملازم کو دونوں صورتوں میں ہی یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اپنی اجرت کا تعین خود کرے۔یہ جو آجکل مالکوں اور مزدوروں کے جھگڑے آئے روز اخبارات اور میڈیا کی زینت بنتے ہیں،اس

کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ مزدور اپنا حق زیادہ سمجھتے ہوئے زیادہ اجرت طلب کرتے ہیں، جتنی مالک یا حکومت نے مقرر کی ہو، لیکن مالک اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اکثر ہڑتال، ہنگامے، توڑ پھوڑ، کام کاج کا بائیکاٹ، یہ سب دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسی لیے کہ اجرتوں کی پیمائش کا پیمانہ ان میں کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ اس لیے نتیجہ فساد کی صورت برآمد ہوتا ہے۔ آپ تشدد، لاٹھی چارج کے ذریعے فساد کو وقتی طور پر دبا دیتے ہیں، لیکن پھر کیا ہوتا ہے۔ بعد میں مزدور دل لگا کر کام نہیں کرتا۔ اور یہ وہ چیز ہے جسے آپ مزدور سے زبردستی نہیں کروا سکتے۔ پھر یہ فساد مزید قوت سے ابھرتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی محرومی یا فساد کو طاقت کے استعمال سے آپ نہیں دبا سکتے۔

مزدور کی مزدوری مقرر کس طرح ہوتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ اجرتوں کا تعین کرتا کون ہے؟ یہ ''کام لینے والا'' مقرر کرتا ہے۔ یہی نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے (اور سوشلزم کی بھی)۔ مزدور کو دو سو روپے ملیں اور راج مستری کو چھ سو روپے۔ یہ کس نے طے کیا؟

کسان اپنی سارے سال کی محنت کی کمائی، غلہ منڈی میں، اپنی ٹرالی لا کر کھڑی کر دیتا ہے اور خود ایک طرف ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ لوگ وہاں آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کیا بھاؤ باہر آیا ہے؟ ''باہر آیا ہے'' کہنا کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی دوکان سے چوہا نکل کر باہر آتا ہے۔ جی بھاؤ کیا باہر آیا ہے؟

یہ بھاؤ بھلا کیسے باہر آتا ہے؟ ایک مثال سے واضح کرتا چلوں۔ ایک چور ہوتا ہے۔ اور اس کے ہمراہ چار پانچ رسہ گیر ہوتے ہیں۔ وہ ایک چادر کچھ اس طرح کر کے تان دیتے ہیں کہ نیچے ان کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ چادر لگائی۔ جی سات سو روپے من بھاؤ نکلا ہے۔ یہ زمیندار کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ کسان وہاں کھڑا ہے۔ ارے بھائی یہ بھاؤ کیسے نکلا؟ بولے چادر کے نیچے سے۔

اگر یہ بھاؤ ''وارا'' نہیں کھاتا تو اپنا غلہ گھر لے جاؤ (سرمایہ داری کی دھمکی)

اسی طرح اینٹیں ڈھونے والے ایک مزدور کی یومیہ اجرت دو سو روپے مقرر ہوئی۔ اب اگر اس میں اس کا گزارہ نہیں ہوتا تو یہ کسی کا کام نہیں کہ دیکھے کہ یہ کس کی ذمہ داری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو سو روپے ہے۔ لینے ہیں تو لو ورنہ بیٹھے رہو، ورنہ دوسرا مزدور تیار ہے۔ یہ تو ہے سرمایہ داری نظام کی صورت۔

لیکن اشتراکیت میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں بھی یہی کچھ ہے۔ سرمایہ داری نظام میں مزدور کی اجرت کام لینے والے سیٹھ صاحب

نے مقرر کرنی ہے تو اشتراکیت میں چند سیٹھوں پر مشتمل برسرِ اقتدار طبقہ نے۔یعنی سوشلزم خود اجرتیں مقرر کرے گا۔یہ بھی ایک بہت بڑا دھوکا ہے کہ اجرتیں کام کرنے والا مقرر کرتا ہے،مزدور نہیں۔کہیں نہیں کرتا۔نہ چین میں نہ روس میں۔سوشلزم میں اس کا حق ہی نہیں کہ کوئی اپنی اجرتیں خود مقرر کرے۔

لوگوں کو(To each according to his need)کے سنہرے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔اور دیا صرف ایک مقررہ حد تک ہے۔چاہے کسی کی ضرورت پوری ہو یا نہ ہو۔

طلب ورسد کے نظام کے ذریعہ اجرتوں کا تعین(Demand and Supply Rule)

ہمارے ہاں سرمایہ داری نظام اور فری مارکیٹ ایکانومی میں اجرتوں کا تعین طلب و رسد کے خودکار قانون کے تحت کیا جاتا ہے۔یعنی جس چیز کی طلب رسد سے زیادہ ہوگی،اس کا معاوضہ بھی زیادہ ہوگا،اور جسکی رسد طلب سے بڑھ جائیگی،اس کا معاوضہ کم ہوگا۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ نظام خودکار ہے۔لیکن معاشیات کو سمجھنے والے دانشور اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس قانون کو بھی ایک قوت چلا رہی ہے۔وہ قوت کیا ہے؟ ہمارے ہاں رائج استحصالی نظام۔

غیر قرآنی سرمایہ داری نظام حکومت میں ایسے حالات پیدا کردئے جاتے ہیں کہ مزدوروں کی رسد زیادہ رہے۔مزدور اور کم استعداد والے لوگ وافر مقدار میں دستیاب رہیں۔تاکہ ان کو معاوضہ زیادہ نہ دینا پڑے۔اس کے ساتھ ساتھ انجینئرز،ڈاکٹرز،وکیل،اساتذہ وغیرہ کی رسد کم سے کم رکھی جاتی ہے۔تاکہ ان کی طلب میں ہمیشہ اضافہ رہے اور ان کی اجرتیں بھی اسی حساب سے زیادہ ہوں۔

دیکھیے جب آپ ایک ایسا استحصالی نظام قائم رکھیں گے جہاں ریاست کے ہر بچے کو یکساں تعلیم وتربیت نہ مل سکے گی تو پھر ظاہری بات ہے کہ کم ہنر یافتہ افراد اور مزدوروں کی رسد ہمیشہ زیادہ ہی رہے گی۔اور یہ ایک دانستہ طور پر استعمال کیا جانیوالا حربہ ہے کہ نظام تمام افراد معاشرہ کو یکساں تعلیم وتربیت کی سہولتیں فراہم نہ کرے،تاکہ زیادہ لوگ پڑھ لکھ نہ جائیں۔ورنہ محنت مزدوری کون کرے گا۔یوں مزدوروں کی رسد ہمیشہ زیادہ رہتی ہے اور اسی لیے ان کو معاوضہ بھی کم ہی دینا پڑتا ہے۔

ایک سرمایہ دار اپنے بچے کو اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج دیتا ہے۔بچہ بے شک کند ذہن اور غبی ہے۔لیکن پیسے کے بل بوتے پر سرمایہ دار کا بچہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بن گیا۔اس کے برعکس ایک غریب متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والا مزدور اپنے بچہ کو مناسب تعلیمی سہولیات نہ دے پایا۔وہ بچہ سرمایہ دار کے بچے سے کئی گنا ذہین اور محنتی

تھا۔مگر باپ غریب تھا۔پس اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر پایا۔یوں ایک قابل جوہر جو موقع دیے جانے پر اپنی چکاچوند سے دنیا کو حیران کر دیتا،گرد سے چھپا دیا گیا۔یہ سب کس کا قصور ہے؟اسی نظام سرمایہ داری کا جس کی بدولت سرمایہ صرف چند لوگوں میں ہی گردش کرتا رہتا ہے اور اسے معاشرہ میں اس انداز میں گردش نہیں دی جاتی جیسے خون تمام جسم میں گردش کرتا ہے۔ایسا ہو بھی کیسے؟ جب کاروبارِ زندگی اور وسائل پیداوار ایک قرآنی سٹیٹ قائم کر کے اس کے ہاتھوں میں دینے کی بجائے انفرادی طور پر لوگوں کی ملکیت میں رہنے دیے جائیں گے تو پھر نتیجہ انہی ناہمواریوں کی صورت نکلے گا۔کہ مزدوروں کے بچے مزدور اور انجینئرز کے بچے انجینئرز بنتے چلے جائیں گے۔

مسئلہ کا حل:عدل کے ساتھ احسان بھی

اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ (سورہ النحل۔آیت 90)

بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

انسان کی زندگی کے دو بنیادی پہلو ہیں۔عدل اور احسان۔ہمارے ہاں ذہنِ انسانی نے آج تک اپنے سامنے جو بلند ترین تصور رکھا،وہ عدل (Justice) کا ہی رکھا۔صرف عدل کر کے ہی انسان خود کو اس قدر مطمئن محسوس کرتا ہے کہ کہیں اگر عدل ہوگا تو وہ کہتا ہے کہ سب ٹھیک ہوگیا۔بس کسی طرح عدل وانصاف ہو جائے۔ہم بے انصافی کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں۔لیکن باطل کے نظام میں اس عدل کی تکنیک ہوتی کیا ہے؟

شیخ سعدی نے ایک بار کہا تھا کہ ''کسی کو موت دو،تا کہ وہ راضی ہو جائے''۔واقعی آدمی راضی ہو جاتا ہے۔

ایک بار مہاجرین کا ایک گروہ دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آیا۔اس زمانہ میں لوگوں کے پاس رہنے کو جگہ نہ تھی۔لوگوں کی ایک کثیر تعداد فٹ پاتھوں پر گزارہ کیا کرتی۔سینے میں دردِ دل رکھنے والے لوگ انسانیت کی ایسی حفاظت پر خون کے آنسو روتے تھے۔ایک ایسے ہی فٹ پاتھ کے اوپر ایک چھ منزلہ عمارت قائم تھی۔اس عمارت کے اندر سونے والوں کے لیے صوفے،قالین اور کمخواب کے پردے،سب موجود تھا۔وہاں کچھ لوگ آسائش بھری نیند سوتے تھے اور اسی نوع کے انسان عمارت کے باہر فٹ پاتھ پر بھی سوئے نظر آتے تھے۔کتنا بڑا فرق تھا۔اس پہ ہر آنکھ اشکبار نظر آتی تھی۔

اتنے میں وہاں کی انتظامیہ کو ''ہوش آیا''۔انہوں نے کہا کہ یہ جو سڑکوں پر ٹھیلوں خوانچوں والے دن میں بیٹھ جاتے ہیں،

رات کو سو جاتے ہیں تو اس سے بڑا خلل واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ حکم ہوا کہ وہ فٹ پاتھ خالی کرایا جائے۔ یہاں کوئی خوانچے والا نہ نظر آئے اور نہ ہی رات کو یہاں کوئی سویا ہوا ملے۔ جانتے ہیں پھر کیا ہوا تھا؟

وہاں جلوس نکالا گیا اور اس جلوس میں کچھ ایسے بینرز بھی نظر آئے جن پر یہ لکھا تھا کہ ''ہمیں فٹ پاتھ سے نہ ہٹایئے''۔ کیا بات ہے۔ اسے کہتے ہیں ظلم و استبداد۔ جسے فریب کے حسین پردوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ یعنی پرندہ خود پکار اٹھے کہ ''مجھے پنجرے سے نہ نکالو''۔ یہ تھا ان کا مطالبہ۔

غور فرمایئے مطالبہ یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ جو ہمارے اوپر عالی شان محل کھڑا ہے، اس میں ہمارے رہنے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ بلکہ مطالبہ کیا تھا؟ یہی کہ ''ہمیں فٹ پاتھ سے نہ ہٹایا جائے''۔ بہت سے دردِ دل رکھنے والوں کو وہ بینر آج تک یاد ہے۔

ابلیسی نظامِ سیاست کی بالا دستی

تو یہ ہے ایک مثال اس ابلیسی نظامِ سیاست کی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بے عدلی کے ہاتھوں انسان اتنا زیادہ ستایا گیا ہے کہ اگر وہ کہیں سن لے کہ وہاں عدل ہوتا ہے تو وہ اس قدر خوش ہوتا ہے کہ جیسے انسانیت کا منتہیٰ سامنے آ گیا ہو۔ اگرچہ عدل کی تعریف بھی آج تک پیش ہی نہیں کی جا سکی۔ یہ جسے ہمارے ہاں ''قانونی عدل'' کہا جاتا ہے یہ کیا ہے؟ یعنی وہ قوانین جو آپ کے ہاں کی مجلسِ قانون ساز (Legislative authorities) تیار کریں۔ انہی قوانین کے مطابق وہاں کے جج کوئی فیصلہ کر دیں تو وہ قانونی فیصلہ قرار دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ وہ قوانین بھی تو انسانوں ہی کے بنائے ہوتے ہیں۔ بات تو وہیں دورِ قدیم کی ملوکیت، فرعونیت، نمرودیت کی آ گئی۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک انسان اپنے طور پر جو فیصلہ چاہتا تھا، اپنے ذہن سے کر کے اس کو اسی وقت (Enforce) کر دیتا تھا۔ یہ ملوکیت کہلاتی تھی۔ اسے ہی بادشاہت اور فرعونیت کہا کرتے تھے۔ کسی انسان کو کیا حق ہے کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلے تو وہ دوسرے انسانوں کے لیے قانون بن جائے۔

تو یہ عدل نہیں تھا۔ اس دور میں قانون کی تعریف ہی الگ تھی۔ وہ تو وحشت، بربریت، فرعونیت اور نمرودیت کا زمانہ تھا۔

اب خیر سے آزادی کا دور ہے۔ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟ دس بارہ نمرود اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جو ان کے منہ سے نکلتا جاتا ہے، اسی کا نام قانون رکھ دیا جاتا ہے۔ یعنی ''مجلسِ واضع قوانین''۔ جو وہ کہہ دیں، قانون بن

جائے۔وہ وہیں اس قانون کو اسی وقت نافذ نہیں کر دیتے۔وہ اسے آگے ایک ایجنسی کو دے دیتے ہیں جسے ہمارے ہاں ''عدالت'' کہا جاتا ہے۔وہاں پہنچ کر اگر اسی قانون کے مطابق کوئی فیصلہ ہو جائے تو لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ چلو جی انصاف ہو گیا۔عدل ہوا۔

اگر تجزیہ کیا جائے تو ڈھول کا پول اسی وقت کھل جاتا ہے۔فرعون کی ملوکیت اور قدیم بادشاہت کا ''عدل'' تو اسی وقت ہو جاتا تھا۔اس میں وہ بھرے دربار میں موقع پر ہی ایک فیصلہ سنا دیتے تھے۔لیکن آج کی اس جمہوریت نما ملوکیت اور فرعونیت میں ''قانون کے مطابق'' عدل لینے کے لیے مظلوموں اور لاچاروں کو وہ کچھ کرنا پڑتا ہے کہ پوچھیے مت۔ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔کہ ان قوانین کے مطابق کہیں سے ہمیں انصاف مل جائے۔فیصلہ ہو جائے۔اس عدل کی حالت وہی ہے کہ:

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات ومنات

یہ وہی لات ومنات ہیں۔انسان کے منہ کو انسان کا خون لگا ہوا ہے جو چھوٹتا ہی نہیں۔محض بھیس بدلتے ہیں، پردے بدلتے ہیں، روح وہی کارفرما ہوتی ہے۔

عدل سے احسان تک: ہمارے ہاں عدل کا تصور

بات ہو رہی تھی مزدور کی مزدوری کی۔ہمارے ہاں جو عدل کا تصور ہے، کہ کسی کو اس کا واجب الادا (Due) دے دینا۔یعنی مزدور کی مزدوری جو طے کی جائے، وہ چکا دینا عدل ہے۔چاہے جیسے بھی جتنی بھی طے ہوئی ہے۔یہ جتنے احتجاج ہمارے ہاں مزدوروں میں دیکھنے میں آتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہماری اجرتیں، ہمارا معاوضہ، ہمارے Dues کم ہیں، یہ زیادہ کیجیے۔اگر اضافہ کر دیا جائے تو وہ ان کا حق بن جاتا ہے۔اور جو حق انہیں دے دیا جائے تو یہ عدل کہلاتا ہے۔

فرض کیجیے کہ مہنگائی کی وجہ سے ایک مزدور کی یومیہ مزدوری میں ایک سو روپے کا اضافہ ہوا ہے۔وہ کہتا ہے کہ میرے ساتھی مزدور کے کنبہ میں ایک بیوی اور دو بچے ہیں، یہ سو روپے کا اضافہ ان کے لیے کسی حد تک اضافہ کہلائے گا، مگر میرے تو سات بچے ہیں۔میرے لیے یہ کیا ہے؟

اب اس عدل کو اس سے کیا واسطہ؟ کسی کا گزارہ ہو یا نہ ہو۔عدل کا تصور تو ہمارے ذہنوں میں یہی قائم کیا گیا تھا کہ ''جو طے کیا جائے، وہ دیدیا جائے''۔

عدل اور ذمہ داری میں فرق: عالمگیر فلاحی نظام کی ابتدا کا طریقہ

ایک مزدور کی مزدوری اگر دوسو روپے روزانہ ہے تو وہ اس کو اگر دیدی جاتی ہے تو عدل کا تقاضا پورا ہوا۔ اگر دس روپے میں اس کے سات بچے نہیں پلتے تو یہ عدل کی ذمہ داری یا تقاضا نہیں کہ وہ یہ بھی دیکھے۔

اللہ فرماتا ہے کہ اس نظام میں بات صرف اتنی ہی نہیں کہ یہ عدل ہے۔ اس نظام میں عدل کے ساتھ ایک دوسرا بہت اہم ترین پہلو بھی ہے۔ وہ ہے ''احسان''۔ یعنی معاشرہ میں کسی میں جو کمی رہ گئی ہے، وہ پوری کرنا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ اس نظام پر عمل کیسے ہوتا ہے؟ فرمایا کہ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى (سورہ النحل۔ آیت 90)۔ ابتدا ہی میں اس انسانی فلاحی نظام پرورش کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے اپنے قرب و جوار سے آغاز کیجیے۔ ذی القربیٰ سے مراد وہی نہیں کہ جو آپ کے رشتہ دار ہیں، وہی۔ بلکہ اکائیوں کی شکل میں سیکٹر بنا لیجیے تو یہ قابل عمل پروگرام بن جائیگا۔ اپنے گردوپیش پر نگاہ رکھی جائے کہ کس میں کوئی کمی ہے تو اسے پورا کیا جائے۔ یہ جو ہمارے ہاں جگہ جگہ مسجدیں تھیں، وہ اسی کام کے لیے تھیں۔ کہ یہ جو ذی القربیٰ ہیں، وہ اردگرد والے، وہاں بیٹھ کر جائزہ لیں کہ آیا عدل و احسان ہو رہا ہے یا نہیں؟ لیکن۔۔۔۔۔۔

جو کمانے کے قابل نہیں، ان کی ضروریات کون پوری کرے؟ گھرانے کی مثال:

سورہ النحل میں ارشاد ہے کہ:

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئاً إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ (سورہ النحل۔ آیت 70)

فرمایا کہ ذرا اپنے گھر پر ایک نظر دوڑاؤ۔ آج تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ابھی خود کمانے کے قابل نہیں۔ تو کیا تمہارا اصول یہ ہے کہ جو جتنا کمائے گا، اسے اتنا ہی ملے گا۔ جو نہیں کمائے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔ تو پھر یہ بچہ تو تمہیں پہلے دن ہی گلا گھونٹ کر مار دینا چاہیے۔ کیونکہ وہ تو کچھ بھی کمانے کے قابل نہیں۔

لیکن۔۔۔۔ دیکھو تم اس بچے کے لیے کیا کچھ کرتے ہو؟ اس کی سب ضروریات بخوبی پوری کرتے ہو۔ اس کی خوراک کا پورا پورا خیال رکھتے ہو۔ حتیٰ کہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ گھر والے فاقہ کشی کرتے ہیں، لیکن اس بچے کے لیے دودھ کا انتظام کرتے ہیں۔ اپنی ساری ضروریات پس پشت ڈال لیتے ہو۔ یہ تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے تو کھانے پینے کی چیزوں کے لیے ضد کرنے لگتا ہے۔ اور تم اس کی ہر خواہش اس کے منہ سے پوری بات نکلنے سے پہلے پوری کرتے ہو۔ وہ اگر آدھی رات کو بھی کسی چیز کے

لیے ضد کرے تو تم نیند سے اٹھ کر اسے کہیں نہ کہیں سے لا کر دیتے ہو۔

اب خود ہی دیکھ لو کہ جو نہیں کما رہا تم اس کی ضروریات کس انداز میں پوری کرتے ہو۔ کہاں گیا تمہارا وہ اصول کہ ''جو جتنی محنت کرے گا، اسے اتنا ہی ملے گا، جو محنت نہیں کر پائے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔'' اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری چونکہ تم نے اپنے ذمہ لی ہے، اس لیے تمہاری تمام تر توجہات کا مرکز یہی بچہ ہے۔ کہ اس بچے کی پرورش ہم نے کرنی ہے۔ یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کماتا کیا ہے؟ اور وہ تو کماتا ہی کچھ نہیں۔

پھر ایسا ہوتا ہے کہ تمہاری عمر پچاس کے پیٹے میں داخل ہو جاتی ہے۔ تم بہت زیادہ کمانے لگتے ہو۔ پھر تم بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھتے ہو اور تمہاری کمانے کی صلاحیتیں، استعداد کم ہو جاتی ہے۔ پھر بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہونا چاہیے؟ کیا تمہاری بھی ضروریات پوری کرنی چاہئیں یا پھر یورپ والوں کی طرح دھکا دے کر کہنا چاہیے کہ جاؤ جا کر اولڈ ہاؤس (Old House) میں اپنے دن پورے کرو۔

نہیں۔ ہرگز نہیں۔ قرآن نے والدین کے لیے بھی وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (سورہ البقرہ۔ آیت 83) کہا ہے۔ یعنی ان میں جتنی کمی آ گئی ہے، اس کمی کو پورا کرو۔ احسان کے ذریعہ۔ کما کر لانے والے افراد کے اوپر یہ دونوں ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں کہ وہ ''جو کما کر لائے، پہلے اس بچے کی کی پرورش کرے، جو کچھ نہیں کما رہا، پھر ان بوڑھوں کی پرورش کرے جو اب کمانے کے قابل نہیں رہے۔'' اور زیادہ سے زیادہ محنت کرے۔

اب یہ بتاؤ کہ جتنی زیادہ ذمہ داریاں بڑھتی ہیں، تم اتنا ہی زیادہ کام کرتے ہو یا نہیں؟ اچھا باپ تو اسی کو کہیں گے نا کہ جو گھر کی ذمہ داریوں کو پورا کر لینے جتنی محنت کرے۔ اکثر یہ سنتے ہیں کہ جناب۔ ملازمت تو میں کرتا ہوں، مگر اس سے گھر کے پوری نہیں پڑتی۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ گھر میں تین چھوٹے بچے اور بوڑھے والدین ہیں۔ اب میں نے اسی لیے ایک پارٹ ٹائم جاب (job) تلاش کی ہے۔

کرتے ہو نا اب یہ زیادہ سے زیادہ محنت۔۔۔؟؟؟؟ بتاؤ اس میں تمہارا جذبہ محرکہ کیا ہے؟ یہی نا کہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ کام بھی کرنا پڑے تو میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اور پھر صرف کام ہی نہیں کرتے، بلکہ اس میں سے خود کم سے کم لیتے ہو اور زیادہ سے زیادہ گھر والوں کو دیتے ہو، جن کی تم پہ ذمہ داری ہے۔ اور یہی پرورش کا تقاضا ہے جسے ''ربوبیت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ رب بن کر دکھانا۔

اس کے برعکس اگر تمہاری کیفیت یہ ہو کہ گھر میں بچے تو بھوکے مر رہے ہوں، بوڑھے والدین کو روٹی میسر نہ ہو، اور تم بازار میں بیٹھے دوستوں کے ساتھ دعوت اڑا رہے ہو، تو دنیا تمہیں کیا کہے گی؟ بھڑوا ہی کہے گی نا۔ یہ تو ربوبیت کا تقاضا ہی نہیں۔ تقاضا وہی ہے جو تم محنت کرو گے۔ زیادہ سے زیادہ۔

اب ذرا گھر سے نکل کر معاشرہ پر نظر دوڑاؤ۔

ابھی تک بات ایک گھر کی ہو رہی تھی۔ اب آپ ذرا اپنے اس گھر کی چار دیواری کو ادھر ادھر گرا دیں۔ بالفاظ دیگر ذرا کشادہ کر لیجیے۔ جسے قرآن نے ''البر'' کہا ہے۔ جسے کا ترجمہ ہمارے ہاں ''نیکی'' کیا جاتا ہے۔

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (سورہ البقرہ۔آیت 177)

نیکی اور کشادگی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی جانب کرتے رہو۔

''البر'' کے معنی ہیں کشادگی، نظروں اور ذہنیت کو ذرا کشادہ کر کے دیکھنا۔ دل کھلا رکھنا۔ اب جس گھر کی صورتحال پہلے پیش کی گئی، اس کی دیواریں گرا دو تو یہی معاشرہ ہو جائیگا۔

اب اللہ پوچھتا ہے کہ اپنے گھر تک تو تم اس اصول پر کاربند رہتے ہو، لیکن باہر معاشرہ میں اس اصول پر عمل کیوں نہیں ہوتے؟ اب اس سے ہی اگلی آیت کچھ یوں ہے کہ:

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (سورہ النحل۔آیت 71)

اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ جیسا کہ مضمون کے پہلے حصہ میں بھی واضح کیا گیا۔ یہ صلاحیتیں کسی میں کم ہیں کسی میں زیادہ۔ بچے میں تو ہوتی ہی نہیں۔ آیت پر ہی غور کرو، معاملہ صاف ہو جائیگا، ''واللہ فضل''۔ یہ سب صلاحیتیں اور فرق اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہے۔ اور جو چیز اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہے، اس کے ذریعہ حاصل کردہ رزق کی تقسیم بھی اللہ کی مرضی سے ہی ہوگی۔

فرمایا کہ یہ سب کچھ تم نے سمجھ لیا۔ بلکہ گھرانے کے اندر اس پر عمل بھی کرتے ہو۔ پھر تو تمہیں مان لینا چاہیے کہ یہ سب صلاحیتیں تمہاری نہیں، اللہ کی جانب سے ہیں۔ پھر اسی آیت میں آگے ارشاد ہوا کہ:

فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ

أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (سورہ النحل۔آیت 71)

پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جنہیں اکتسابِ رزق کی صلاحیت زیادہ حاصل ہے، جو زیادہ رزق پیدا کر سکتے ہیں، وہ زائد از ضرورت کما لیتے ہیں۔اس طرح جو ان کی ضرورت سے زائد ہو، جسے ہم ''فاضلہ'' کہتے ہیں، بنیادی مادہ تو اس کا بھی یہ ''فضل'' (آیت بالا کا) ہی ہے۔جس سے فضلہ بھی ماخوذ ہے۔پس یوں جو فاضلہ تمہارے پاس آ گیا ہے، یہ زائد از ضرورت آ گیا ہے۔تم اسے اپنے ماتحت اور زیرنگرانی کام کرنے والوں کو کیوں نہیں لوٹا دیتے؟

دوسروں کو دینا خیرات نہیں بلکہ یہ تو ان کی امانت ہے۔

آیت میں ایک لفظ ہے ''برادی''۔یہ جو چیز ہے کہ جو تمہارے لیے زائد از ضرورت ہے۔وہ اس بناء پر ہے کہ تمہیں خدا نے کمانے کی زیادہ صلاحیت دی ہے۔اس کی وجہ سے یہ زائد از ضرورت تمہارے پاس آیا۔اب ہمارے ہاں تو تصور یہ ہے کہ دوسروں کو دے دینا ''خیرات'' ہے۔بخشیش ہے۔عربی میں بھی اسے زیادہ سے زیادہ عطیہ کہہ دیا جاتا ہے۔

لیکن اللہ اسے کیا کہتا ہے؟ وہ خیرات نہیں کہتا۔اس نے اسے ''برادی'' کہا ہے۔جس کے معنی ہیں ''جس کی کوئی چیز ہو، اسی کو واپس لوٹا دینا''۔کہ یہ تمہاری امانت میرے پاس رکھی ہوئی تھی، یہ لو میاں اپنی امانت واپس لو۔'' یہ ہے برادی کا مفہوم۔کیا خوبصورتی سے وضح کر دیا اللہ نے۔

یہ جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں، انجینئرز اور مزدور وغیرہ۔فرق ہوتا ہے ان میں۔وہ کہتا ہے کہ یہ جو تمہاری زائد صلاحیت (Capacity) ہے، جس سے تم اتنا زیادہ حاصل کر جاتے ہو، تم ان کو لوٹا کیوں نہیں دیتے؟ یہ تمہارا تو ہے ہی نہیں۔یہ تو ان ہی کا ہے۔

لیکن تمہارے اندر کا جذبہ یہ کہتا ہے کہ ''فَهُمْ فِيهِ سَوَاء''۔ایسا کرنے سے تو گدھا گھوڑا برابر ہو جائیں گے۔ہم میں اور ان میں کیا فرق باقی رہا؟ یعنی جتنا میں نے کمایا، سب میرا ہے، اگر میں انہیں دے دوں تو ہم سب تو برابر ہو جائیں گے۔قرآن کہتا ہے کہ تیرا کیسے ہو گیا سب؟ ''فما بکم من نعمۃ فمن اللہ'' یہ جو تصور کہ یہ زائد ہے، یہ ان کو دے دیں جو کم کما رہے ہیں، جن کی استعداد کم ہے۔قرآن کہتا ہے کہ

أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (سورہ النحل۔آیت 71)

تم اس بات سے پھر انکار کرتے ہو؟ ضد کرتے ہو؟ کہ جو نعمت تمہیں حاصل ہے، وہ تمہاری ہے، خدا کی جانب سے نہیں۔یعنی اپنی ملکیت سمجھ کر اسے خدا کی ملکیت ہونے سے انکار کرتے ہو۔یعنی انکار کی بجائے یہاں بھی لفظ ''جحدون''

ہے۔کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ یہ جو تمہارا پہلا بنیادی ایمان ''فمن اللہ'' پر تھا۔تم اس سے انکار کرتے ہو کہ نہیں یہ میرا اپنا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

تقریباً آدھی دنیا یعنی تین ارب سے زائد لوگ روزانہ صرف اڑھائی امریکی ڈالرز سے بھی کم آمدن پہ گزارہ کرتے ہیں۔

(The World Bank Group:Voice of the Poor. Statistics as of June 2 011)

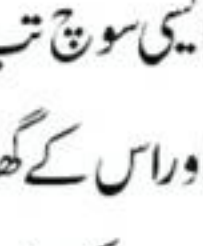

قرآن کے معاشی نظام کا قیام: ریاست کا کردار اور ایمان کے حقیقی تقاضے

مضمون کے اولین حصہ میں میں نے اس امر کی وضاحت کی کہ دنیا میں دو نظریات کارفرما ہیں۔ایک نظریہ زندگی کے تحت انسان اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دیتا ہے، جبکہ دوسرے نظریہ میں انسان خود پر اوروں کو ترجیح دیتا ہے۔ پہلا نظریہ انسان کی عقل بے باک کے تحت درست قرار پاتا ہے جبکہ دوسرے کے درست ہونے کی تصدیق اللہ کی جانب سے نازل کردہ قوانین پر مشتمل مستقل اقدار کرتی ہیں جنہیں ہم قرآن کہتے ہیں۔

چونکہ قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ اصلی نظریہ زندگی اپنے آپ کو ترجیح دینے کی بجائے دوسروں کو خود پر ترجیح دینا اور ان کی پرورش کی فکر کرنا ہے۔اس لیے قرآن صرف تلقین و نصیحت کرنے کی بجائے عملی طور پر اس بات کا انتظام کرتا ہے جس سے انسانی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ واقعی دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا ہی حقیقی نظریہ زندگی ہے۔اب ظاہری سی بات ہے کہ انسانی عقل ایسی سوچ تب تک نہیں سوچ سکتی جب تک وہ اس جانب سے کامل اطمینان حاصل نہ کر لے کہ ایسا کرنے سے خود اس کی اپنی اور اس کے گھرانے کی ضروریات پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔

اب دیکھنا یہی ہے کہ قرآن اس سلسلہ میں کیا پروگرام تجویز کرتا ہے؟ کیونکہ دین کی صداقت اور عملیت کا انحصار اسی پروگرام کے اطمینان بخش اور Practical ہونے پر ہے۔اس لیے یہ حصہ بہت ہی اہم ہے۔

جو لوگ وحی کی رو سے انسانوں کے لیے مستقل اقدار کی شکل میں ضابطہ حیات کے نزول پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب سے پہلے ایک معاشرہ قائم کرتے ہیں۔معاشرہ سے مراد ایک سوشل نظام ہے جس میں اللہ کا دیا ہوا ضابطہ حیات عملی طور پر نافذ ہوتا ہے۔کیونکہ دین نام ہی اجتماعیت کا ہے۔اس میں انفرادی زندگی کی کوئی گنجائش نہیں۔ایسا معاشرہ دورِ حاضر کی اصطلاح میں ریاست (State) کہلاتا ہے۔

ہر نظام کی طرح اس نظام مملکت میں بھی کچھ لوگ ایسے ہونگے جن کے ذمہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے فرائض

ہونگے ۔جبکہ باقی افراد معاشرہ ان فرائض کی انجام دہی میں ان کے دست بازو بنیں گے ۔لیکن ان کے درمیان حاکم ومحکوم کا تعلق قطعاً نہیں ہوگا ۔اس لیے کہ قرآن کی رو سے کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر اپنی حکومت چلانے کا اختیار نہیں ۔یہ وہ نظام ہوتا ہے جس میں ہر کوئی قوانین خداوندی کا مطیع ہوتا ہے ۔لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اطاعت چاہے قوانین الٰہیہ کی ہی کیوں نہ ہو، یہ بہر حال ایک عملی نظام کی شکل میں ہی ممکن ہے ۔یہی حکومت کی مشینری کہلاتی ہے ۔اور اس حکومت میں بھی ایک مرکزی اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے جو اللہ کے قوانین کو ریاست میں نافذ کرتی ہے ۔اور ایسی ہی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت اللہ کی عملی اطاعت کہلائے گی ۔افراد معاشرہ اس مرکز کے احکامات کی اطاعت کریں گے ۔اور یہ مرکز ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں ۔اور جن کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے ۔جن میں سب سے پہلی ذمہ داری فراہمی رزق کی ہے ۔

ایمان کیا ہے؟مسلمان کیسے ہوا جاتا ہے؟

ہمارے ہاں جو غیر مسلم کلمہ پڑھ کر داخل اسلام ہو جائے ،اسے ہم مسلمانوں کے گروہ کا ایک فرد سمجھنے لگتے ہیں ۔ہم پیدائشی مسلمانوں کے لیے اس کلمہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ۔لیکن قرآن کی رو سے مسلمان ہونے کے لیے شرائط کچھ اور ہیں ۔

ایمان صرف یہ نہیں کہ چند ان دیکھی چیزوں کو زبانی کلامی تسلیم کر لیا اور آپ صاحبِ ایمان ہو گئے ۔بلکہ ایمان دراصل ان بنیادی حقائق کو عقل وفکر اور دلائل و براہین کی بناء پر تسلیم کرنے کا نام ہے جنہیں مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے ۔ان کی خصوصیات یہ ہوتی ہے کہ یہ نا قابل تغیر وتبدل ہوتی ہیں اور بذریعہ وحی ہی انسانوں کو عطا کی جاتی ہیں ۔ان کی صداقتوں کا معیار خود ان پر عمل کے نتائج ہیں جو کہ خود بذریعہ وحی بتا دئے جاتے ہیں ۔اس لحاظ سے ایمان کے لیے ہم Faith کی بجائے Conviction کہہ کر پکاریں تو یہ زیادہ بہتر تعریف ہوگی ۔

ایمان کے تصورات میں پہلا تصور یہ ہے کہ انسان کے پاس خود اس کی عقل وحواس خمسہ کے علاوہ ایک ذریعہِ علم اور بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے ۔اور جو انبیاء کرام کے ذریعے انسان تک پہنچائی گئی ۔

اس کے بعد ایمان کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون کارفرما ہے ۔چاہے وہ انسان کی یہ داخلی دنیا ہو یا خارجی کائنات ۔اور وہی قانون جو خارجی دنیا میں از خود نافذ العمل ہے ،اسے انسانوں کی اس دنیا میں بھی کارفرما ہونا چاہیے ۔اور یہ کہ انسان وحی کے علاوہ کسی بھی دوسرے قانون کے تحت کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔یہ وحدتِ قانون کہلاتا

ہے،اوروحدت قانون کے معنی ہیں وحدتِ خالق۔اور پھر اسی سے وحدتِ مخلوق کا تصور ابھرتا ہے۔یعنی تمام نوع انسانی ایک عالمگیر برادری ہے۔قرآن نے اس تصور پر بہت زور دیا ہے اور تمام انسانوں کو ایک ہی نفسِ واحدہ سے پیدا شدہ بتایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (سورہ الاعراف۔آیت 189)

اسی رب نے تمہیں ایک جز واحدہ سے پیدا کیا۔(اسی لیے تمام انسان ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں،ایک ہی عمارت کی اینٹیں اور ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔اس لیے سب سے مساوی سلوک کیا جانا چاہیے)۔

ایمان کا تیسرا جزو یہ ہے کہ انسان کی زندگی محض اسی جسم اور اسی دنیا کے ساتھ وابستہ نہیں۔انسان کے جسم کے ساتھ ساتھ اسے ایک ذات بھی عطا کی گئی ہے۔جیسے جسم کی پرورش ضروری ہے،اسی طرح ذات کی پرورش کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔انسانی جسم کی پرورش (لینے) سے ہوتی ہے جب کہ ذات کی پرورش کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ دیتے کتنا ہیں؟آپ دنیا کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے کس قدر حصہ ڈالتے ہیں؟آپ نوع انسانی کو کتنا فائدہ پہنچاتے ہیں؟ انسانی جسم موت کے بعد فنا ہو جاتا ہے مگر انسانی ذات موت کے بعد فنا نہیں ہوتی اور اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔آگے وہی بڑھے گا جس نے اپنی ذات کو دنیا کے اندر متوازن انداز میں نشوونما دی ہوگی۔انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔اور اس کا اثر یا چھاپ اس کی ذات پر پڑتی ہے۔اچھے کاموں کا اچھا نتیجہ اور برے کاموں کا برا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔برے کاموں کے ذریعے تباہ ہو جانے والی ذات کو واپس اچھائی کی جانب موڑنے اور اس کی نشوونما کا عمل دوبارہ سے بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان وحی پر عمل شروع کر دے۔

انسانی ذات کی حقیقت اور پرورش سے متعلق تفصیلی گفتگو مضمون میں ذرا آگے جا کر کی جائیگی۔

المختصر یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جنہیں قرآن ایمان کے بنیادی تصورات کے طور پر انسان کو ذہن نشین کراتا رہتا ہے۔

قرآن کے معاشی نظام کا قیام

جیسا کہ ایمان کے اجزاء سے گزشتہ حصہ میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ قرآن کے پیش کردہ اسلام پر عمل درآمد کے لیے سب سے پہلے ایک ریاست تشکیل دی جائیگی۔ریاست کے قیام کے بعد پھر قرآنی نظام کے قیام کے لیے شہریوں اور مرکزی اتھارٹی کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جو اللہ نے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (سورہ

التوبہ۔آیت 111)

مفہوم:اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جان و مال کو خرید لیا ہے جنت کے بدلے میں۔

فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ (سورہ التوبہ۔آیت 111)

پس تم اپنی اس بیع (تجارت) پر جو اللہ نے تم سے کی ہے، خوش ہو جاؤ (کہ اب تمہیں زندگی کی ہر آسائش ملنے والی ہے۔جنت ملنے والی ہے)

اس معاہدہ کے چار اجزاء ہیں جو ہر بیع وشریٰ کے معاملہ میں ہونے چاہئیں۔

(1) خریدار (مشتری)۔۔۔۔۔اللہ تعالیٰ

(2) فروخت کنندہ (بائع)۔۔۔۔۔مومنین

(3) فروخت کی جانے والی چیز۔۔۔۔۔مومنین کے جان و مال

(4) قیمتِ فروخت۔۔۔۔۔جنت

مندرجہ بالا اجزاء میں دو (مومنین اور ان کی جان و مال) تو محسوس (Tangible) ہیں۔یعنی سب جانتے ہیں کہ یہ کون ہیں اور کیا ہیں۔لیکن دیگر دو اجزاء غیر محسوس (Intangible) ہیں۔اللہ اور جنت۔

اب یہ ظاہر ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ تب تک سمجھ نہیں آ سکتا جب تک ان دو غیر محسوس اجزاء کی حقیقت ہر کوئی سمجھ نہ لے۔کیونکہ فریقین کے درمیان معاہدہ ہمیشہ ہر جزو اور شق کو سمجھ کر ہی انجام پاتا ہے۔اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی جان و مال اللہ کے ہاتھوں بیچ رکھے ہیں تو یہ ذہنی یا اعتقادی بات ہوگی اور اس کی جان و مال اسی کے پاس رہیں گے۔اور اگر وہ یہ کہے کہ اللہ اس کے بدلے میں مجھے جنت عطا کر دے گا تو یہ بھی محض ذہنی اور اعتقادی نوعیت کی بات ہوگی۔کیونکہ جنت ہمارے سامنے نہیں ہوتی کہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ یہ کیا ہے۔

اب اسلام ایک عملی اور منطقی ضابطہ حیات ہے۔اس میں یہ معاملات محض ذہنی یا اعتقادی حد تک محدود نہیں رہ سکتے۔اللہ ان کی عملی شکل لوگوں کے سامنے لانا چاہتا ہے۔اور قرآن میں بتا دیا گیا ہے کہ ان دو اجزاء سے عملی طور پر کیا مراد ہے؟

پہلا جزو: جنت

سب سے پہلے جنت کو لیجیے، کتاب اللہ نے ایک ارتقاء شدہ ذات کی مرنے کے بعد کی ارتقاء یافتہ زندگی کو جنت کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔لیکن انسان چونکہ اپنے شعور کی موجودہ (محدود فکر کی حامل) حالت پر کبھی بھی اس زندگی کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے

اللہ نے انسان کو سمجھانے کی خاطر دنیاوی مثالیں دے کر اس زندگی کی وضاحت کی ہے۔قرآن میں اس جنت سے متعلق جتنے بھی بیانات ہیں،وہ سب تمثیلی ہیں۔دنیاوی مثالیں دے دے کر بات سمجھائی گئی ہے۔مثلاً:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاء غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاء حَمِيماً فَقَطَّعَ أَمْعَاءهُمْ(سورہ محمد۔آیت 15)

مَّثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ أُكُلُهَا دَآئِمٌ وِظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَواْ وَّعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّار(سورہ الرعد۔آیت 35)

اس جنت جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے کی مثال یوں سمجھ لو جیسے ایک باغ ہے جس کے نیچے پانی کی نہریں رواں دواں ہوں اور اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار ہوں۔

اسی باغ کے متعلق ایک اور جگہ کہا گیا کہ:

عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاء وَالأَرْض(سورہ الرعد۔آیت 21)

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (سورہ آل عمران۔آیت 133)

اس کی وسعت ارض وسماء کی وسعت کی مانند ہے۔

اس قسم کے تمثیلی بیانات کے بعد یہ وضاحت بھی کر دی کہ:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاء بِمَا كَانُوا يَعْمَلُون(سورہ السجدہ۔آیت 17)

کوئی نہیں جان سکتا کہ اس کے اعمال کے بدلے میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کی نگاہوں سے اوجھل رکھا گیا ہے،اس کی کیفیت کیا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اس نے اس زندگی کو بھی جنت کی زندگی کہہ کر پکارا ہے جو اس دنیا میں قرآنی نظام پر عمل کر کے حاصل کی جاتی ہے۔اور اس میں جنت کی زندگی کی وہ تمام تفاصیل بیان کر دی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کی اس جنت ارضی سے مقصود کیا ہے۔

عرب جو کہ اللہ کے اس پیغام کے اولین مخاطب تھے، اور جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، صحرانشیں اہل البادیہ لوگ تھے۔ان کے نزدیک پرفضا باغات، تازہ اور میٹھے پانیوں کے چشمے، پھلوں کی فراوانی، سایہ دار درخت اور دودھ شہد کی نہریں زندگی کی بڑی آسائشیں سمجھی جاتی تھیں۔وہ ایسے علاقوں کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ان کے نزدیک ایسے باغات کی کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کفار رسول اللہ ﷺ پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ واقعی اگر اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہے تو:

أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا (سورہ الفرقان۔آیت 8)

اس کی جانب کوئی خزانہ نازل کیا جاتا یا کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (سکون سے) کھاتا پیتا۔

اس کے جواب میں اللہ نے انہیں کہا کہ بس کچھ دیر انتظار کرو۔ایک بار اللہ کا نظام قائم ہو لینے دو۔تم ایک باغ کی بات کرتے ہو،

تَبَارَكَ الَّذِي إِن شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْراً مِّن ذَٰلِكَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (سورہ الفرقان۔آیت 10)

وہ تمہیں بہت سے باغات عطا کرے گا جن کے نیچے پانی کی ندیاں جاری ہونگی۔اور تمہیں رہنے کو محلات دے گا۔

اس آیت میں باغات کے علاوہ محلات کا ذکر بھی آیا ہے۔اب غور کیجیے۔عرب تو بادیہ نشین لوگ تھے، صحرا میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن ان کے قرب وجوار میں روم وایران کی ایسی سلطنتیں تھیں جو عظیم تہذیبوں کی وارث تھیں۔ان کا معیار زندگی خانہ بدوش عربوں سے کئی درجے بلند تھا۔یہ ممالک قرآنی نظام کے قیام کے نتیجے میں ان عربوں کے قبضے میں آنے والے تھے جس کا اشارہ اللہ نے اسی آیت میں باغات کے ساتھ محلات کا ذکر کر کے دے دیا۔غور کیجیے کہ قرآن جنتِ ارضی کا ذکر کس انداز میں کرتا ہے۔سب سے پہلے وہ کہتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا میں حکومت وغلبہ ہوگا۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (سورہ النور۔آیت 55)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں گے اور اللہ کی جانب سے نازل کردہ انسانی فلاحی پروگرام پر عمل پیرا ہونگے، ان کے لیے اللہ نے اس دنیا میں حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ جیسے ان سے گزشتہ اقوام کو حکومت و غلبہ دیا تھا۔ نیز یہ وعدہ کہ وہ اسی (استخلاف فی الارض) کے ذریعے اس دین کو تمکن و استحکام عطا کرے گا جو اس نے ان کے لیے تجویز کیا ہے۔ اور انہیں خوف کی جگہ امن عطا کرے گا۔ تا کہ وہ صرف اللہ کی محکومیت ہی اختیار کریں۔ اور اس کی حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں۔ اور جو لوگ اس کے بعد پھر کفر کی راہ اختیار کریں گے، تو یہی لوگ بے راہ رو اور گمراہ ہونگے۔

ان آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ:

(1) ایمان اور نیک اعمال کا لازمی و حتمی نتیجہ استخلاف فی الارض (دنیا کی حکومت) ہوتا ہے۔

(2) دین قائم کرنے اور نظام خداوندی کے نفاذ کے لیے اپنی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ دین صرف اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے جس میں مجموعی طور پر اللہ کے قوانین کا نفاذ ہو۔

(3) اللہ کی عبادت اور شرک سے بچنے کے لیے اپنی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے عبادت کے معانی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کی محکومیت۔

اللہ نے اب جو ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اللہ کے قوانین پر عمل کریں گے اور قرآنی فلاحی نظام (الصلوٰہ) قائم کریں گے تو اللہ انہیں استخلاف فی الارض سے نوازے گا۔ پس ایسا ہی ہوا۔ جب اللہ نے انہیں مخالفین پر غلبہ دیا تو ان سے کہا گیا کہ:

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضاً لَّمْ تَطَؤُوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (سورہ احزاب۔ آیت 27)

"اس نے تمہیں تمہارے مخالفین کی زمینوں، شہروں اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا ہے۔ اور ان زمینوں کا مالک بھی جن پر ابھی تمہارے قدم بھی نہیں پڑے۔

جب خدا کے وعدے پورے ہوئے تو لوگ بے ساختہ پکار اٹھے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ (سورہ الزمر۔ آیت 74)

قابل تعریف ہے وہ ذات جس نے اپنے ان وعدوں کو پورا کر کے دکھایا جو اس نے ہمارے ساتھ کیے تھے۔ اور ہمیں زمین کی حکومت عطا کر دی۔ یہ وہ جنت ہے جس میں ہر جانب ہمارا اختیار کارفرما ہے۔ کام

کرنے والوں کا یہ کیسا عمدہ صلہ ہے۔

تو یہ تھی وہ جنت ارضی جس کا اللہ نے ان سے وعدہ کیا اور انہیں عطا کر دی۔ مندرجہ بالا آیات سے آپ جان گئے ہونگے کہ جنت سے قرآن نے کیا مراد لی ہے۔ یعنی ''جنت'' کے وعدے کیمطابق اللہ نے سب سے پہلے ان عربوں کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کیا جن کی ان کے ہاں کمی تھی۔ جنت کی یہی وہ پہلی خصوصیت ہے جس کا ذکر آدم سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَى وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَى

(سورہ طٰہٰ۔آیات 118 تا 119)

اس میں نہ تجھے بھوک کی فکر ہے، نہ لباس کی۔ نہ پیاس کا ڈر ہے نہ دھوپ کا۔

یعنی اس جنت میں خوراک، لباس، مکان وغیرہ کی فکروں سے انسان بالکل اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور اطمینان بھی ایسا کہ:

وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا (سورہ البقرہ۔آیت 35)

اس میں جہاں سے چاہو، پیٹ بھر کر کھاؤ۔

یہ تو تھے بنیادی ضروریات زندگی جو اس جنت میں پورے ہونے کا ذکر ہے۔ اب آگے آسائش و زیبائش (Luxuries) کا بھی اسی جنت میں میسر ہونے کا اشارہ دیا گیا ہے۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤاً وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ (سورہ الحج۔آیت 23)

''سونے کے کنگن، جواہرات سے بھرے، ریشمی لباس

ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (سورہ الزخرف۔آیت 71)

جہاں نغمات اور سُر سنگیت ہونگے، کھانے کی میز پر سونے کی پلیٹیں، انواع و اقسام کے کھانوں سے بھرے تھال ان کے ارد گرد گردش کرتے ہوئے

، بیٹھنے کے لیے عیش و آرام کے صوفے۔ (سورہ الدھر۔آیت 13)

پھلوں سے بھرے درختوں کے ٹھنڈے سائے، جنہیں حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔(سورہ الدھر۔آیت 14)

مختلف اقسام کے لذیذ کھانوں سے بھرے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے اردگرد گھومیں گے۔(سورہ الدھر۔آیت 15)

باریک ریشمی ملبوسات، ریشم کے پردے، صحت منداور پاکیزہ لوگ۔(سورہ الدھر۔آیت 19)

کھانے کے لیے من پسند پھل، پسندیدہ پرندوں کا گوشت۔(سورہ الواقعہ۔آیت 21)

تہہ بہ تہہ کیلے، بے خار درخت (یعنی ایسی آسائشیں جن کے حصول کی راہ دشوار گزار نہ ہوگی) گھنے سائے، آبشاریں، صاف شفاف پانی، جسے کھود کر نکالنا نہ پڑے۔ بکثرت پھل جنکا نہ تو موسم ختم ہو، نہ انہیں کوئی اپنی حد بندی کے ذریعہ روک سکے۔ وہ سب کے لیے عام ہوں۔(سورہ الواقعہ۔آیات 28تا33)

ہر سو ایسی فضا نظر آئے گی جس میں سب کے لیے سلامتی ہی سلامتی ہوگی۔امن وسکون کا دور دورہ ہوگا۔(سورہ الواقعہ۔آیت 26)

قارئین ذرا ان قرآنی تفاصیل پر غور کیجیے۔ یہ صرف سہانے سپنے ہی نہیں، بلکہ حقیقت کے روپ میں سچ ثابت ہوکر رہے تھے۔ زیادہ نہیں تو عہدِ فاروقؓ میں صرف مدائن کی فتح پر مسلمان افواج کے ہاتھ جو بے تحاشا مال غنیمت لگا تھا، اس کی فہرست پر نگاہ ڈالیں جو کتبِ تاریخ میں درج ہیں اور آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ جن جن اشیاء کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، وہ سب اس مال غنیمت میں موجود تھیں۔ بلکہ ایک ایران ہی کیا، شام کے سرسبز وشاداب باغات، مصر کی سونا اگلنے والی زمینیں۔ عراق کی پرفضا بہاریں، یہ سب کچھ قرآن کی بیان کردہ ''جنت'' کی عملی تعبیر تھیں۔ جو لوگوں کے سامنے آگئی۔ پھر اس کے میں

لَا یَمَسُّنَا فِیۡهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیۡهَا لُغُوۡب(سورہ الفاطر۔آیت 35)

چونکہ اس معاشرہ میں ہر جگہ اللہ کے قوانین کی عملداری تھی، اس لیے وہاں کوئی لغوبات کانوں میں نہیں پڑتی تھی۔

ہر طرف سے سلامتی ورحمت کی آوازیں کانوں میں پڑتی تھیں(سورہ مریم۔آیت 62)۔

سب بھائیوں کی طرح خلوص سے رہتے تھے(سورہ الحجر۔آیت 47)

کسی کے دل میں کینہ وبغض نہیں تھا نہ ظاہری نہ باطنی(سورہ الاعراف۔آیت 43)

المختصر یہ وہ جنت ہے جو قرآنی معاشرہ کے قیام کے بعد افرادِ ریاست کو ان کی جان ومال کے عوض ملتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات قرآنی کے مندرجات کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ اللہ کے ہاتھ جان ومال فروخت کرنے کے بعد ملنے والی جنت محض

فرضی، تخیلاتی یا اعتقادی نہیں، بلکہ ایک محسوس اور ٹھوس حقیقت ہوتی ہے جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔اب اگلے جزو کی بات کرتے ہیں۔

دوسرا جزو ''اللہ''

معاہدہ میں کہا گیا ہے کہ مومنین اپنا جان و مال اللہ کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سے مراد کیا ہے؟ مومنین کس کے ہاتھ اپنا جان و مال بیچتے ہیں؟اب کوئی ایسے ہی کہہ دے کہ بھئی میں نے اپنا جان و مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ تو محض ذہنی اور تخیلاتی بات ہوگی۔اعتقاد کی حد تک۔ایک محسوس حقیقت اسے نہیں کہا جا سکتا۔جبکہ ہم جانتے ہیں کہ معاہدہ بیع میں خرید و فروخت کا لین دین صرف محسوس اشیا اور محسوس فریقین کی موجودگی میں ہوتا ہے۔تو یہ اللہ تو غیر مرئی ہے۔پھر معاہدہ کیسے ہوگا؟ کون مومنین کو جنت دے گا؟

بات یہ ہے کہ خارجی دنیا میں تو اللہ کا قانون خود بخود ہر جگہ نافذ العمل ہے۔لیکن چونکہ انسان کو اختیار و ارادہ دے کر پیدا کیا گیا ہے،اس لیے انسانوں کی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قوانین انسانوں کے ہاتھوں ہی پورے ہوتے ہیں۔یہی وہ مقصد ہے جس کی خاطر قرآن اسلام کو ایک اجتماعی ضابطہ حیات قرار دیتے ہوئے ایک ریاست تشکیل دینے کا حکم دیتا ہے جہاں اللہ کی حاکمیت عملی طور پر نافذ ہو۔ایسا کیسے ہوگا؟

قرآنی ریاست کی مرکزی اتھارٹی ہی وہ جزو ہے جس کے ہاتھوں قوانین خداوندی کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔یعنی وہ ذمہ داریاں جنہیں اللہ نے اپنی جانب منسوب کر رکھا ہے (مثلاً رزق)،وہ قرآنی نہج پر قائم کردہ اسی ریاست کے ذریعے پوری کی جاتی ہیں جس کا کنٹرول مومنین کی جماعت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔اسے ہی نظام خداوندی کا مرکز کہا جاتا ہے۔اللہ سے عملی طور پر مراد یہی مرکزی قرآنی نظام حکومت ہے۔

پس بیع وشریٰ کا یہ معاہدہ جس کا ذکر پیچھے کیا گیا،وہ قرآنی ریاست میں اسی مرکزِ نظام خداوندی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے دور میں یہ مرکز خود رسول اللہ کی ذات مبارکہ تھی اور افراد معاشرہ کا یہ بیع وشریٰ کا معاہدہ رسول اللہ کے ہاتھوں پر بیعت کے ذریعے ہوتا تھا۔قرآن اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (سورہ الفتح۔آیت 10)

اے رسول، جو تیرے ہاتھوں پر اپنی جانیں فروخت کر رہے تھے،وہ دراصل اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ کر رہے

تھے،اوران کے ہاتھوں پر تیر انہیں بلکہ اللہ کا ہاتھ تھا۔

اس آیت سے واضح ہورہا ہے کہ قرآنی ریاست کی مرکزی اتھارٹی کے ہاتھ کو اللہ اپنا ہاتھ قرار دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظام ریاست کا یہ مرکز اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہے جو اس معاملہ بیع وشریٰ کو اپنے ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔بالفاظ دیگر قرآنی ریاست کا مرکز جسے ہم خلیفہ بھی کہہ سکتے ہیں،اللہ کا اس دنیا کے اندر قائم مقام ہوتا ہے۔اللہ کی تفویض کردہ تمام تر ذمہ داریاں اسی نے پوری کرنی ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں قرآن کہتا ہے کہ:

وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً(سورہ المزمل۔آیت 20)

اللہ کو قرض حسنہ دو۔

اب اللہ تعالیٰ کو قرض تو کوئی نہیں دے سکتا۔

اس سے مراد قرآنی نظام کو قرض حسنہ دینا ہوتی ہے۔وہی افراد معاشرہ سے یہ سب وصول کرتا ہے اور پھر اسے عالمگیر نوع انسانی کی پرورش کے لیے خرچ کرتا ہے۔یہ ہے ریاست (State) اور اس کا کردار۔

اب ہمارے سامنے گزشتہ معاہدہ کے تمام چاروں اجزاء محسوس طور پر سامنے آ گئے ہیں۔یعنی بات اب کچھ یوں ہوئی کہ افراد معاشرہ معاہدہ کی رو سے اپنی جان و مال قرآنی ریاست کے سپرد کر دیتے ہیں جس کے بدلے میں وہ ان افراد معاشرہ کے رزق اور ضروریات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اور معاشرہ کو ایسے رخ پر ڈھال دیتا ہے جس سے تمام افراد معاشرہ کو یکساں سامانِ رزق اور فراوانی ملتی ہے۔ان کی تمام ضروریات پوری ہوتی جاتی ہیں۔اور افراد معاشرہ فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنی صلاحیتوں کو قرآنی نظام کے استحکام اور دنیا کی خوبصورتی و تسخیر کائنات کے لیے اپنی کاوشوں کو بہتر طور پر استعمال کر کے اس دنیا کو ''کیا سے کیا'' بنا دینے کے عزم سے مرکز کی جانب سے عطا کردہ فرائض کو سرانجام دینے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔یوں ان کی ذات کی بھی نشو ونما ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ مرنے کے بعد اگلے جہان کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتے ہیں۔یعنی اس دنیا میں بھی جنت مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔یعنی:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً (سورہ البقرہ۔آیت 201)

اے رب ہمیں اس دنیا میں بھی بہتری وفلاح عطا کر اور آخرت میں بھی۔

اس سے مراد یہی وہ نظام ہے جس کے قیام سے اللہ کی اس ذمہ داری کو پورا کیا جاتا ہے کہ:

نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (سورہ الانعام۔آیت 151)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ایسی صورتحال میں کام کرنے کا جذبہ کیا ہوگا:

اب یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی ریاست کی جانب سے خود بخود پوری ہوتی چلی جائیں گی تو انہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہوگی؟ آپ انہیں جس کام پر بھی لگا دیں، وہ اس میں اپنی پوری محنت اور لگن سے کام کیونکر کریں گے؟ مثلاً ایک محنت کش کو معلوم ہو کہ وہ دن بھر جتنا کام کرے گا، اتنی ہی اجرت اسے ملے گی تو وہ دن بھر جان مار کر محنت کرے گا، کہ زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کرے۔ لیکن اگر اسے پتا ہو کہ اگر اگر وہ روزانہ پانچ سو روپے کا کام کرے، جبکہ اس کی گھریلو ضروریات دوسو روپے روزانہ سے ہی پوری ہو جاتی ہیں اور اسے دوسو روپے ہی ملیں گے، بقایا تین سو کسی اور کو دے دیے جائیں گے تو وہ پھر پانچ سو روپے کا کام ہی کیوں کرے گا؟

یہ سوال معاشی نکتہ نظر سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ آج تک وہ سب لوگ جو چاہتے تھے کہ رزق کی تقسیم انسانی ضروریات کے مطابق ہو اور جو لوگ کم کما پاتے ہوں لیکن ان کی ضروریات زیادہ ہوں اور ان کی کمائی سے ان کی پوری نہ پڑتی ہو تو انہیں بھی پورا پورا سامانِ رزق ملے تو ظاہر ہے اس کے لیے ضرورت سے زیادہ کمانے والوں سے لے کر انہیں دیا جائیگا۔ اس کے لیے یونانی فلاسفر افلاطون نے بھی اس پر تجربہ کیا تھا، مگر وہ اس میں ناکام رہا۔ یہی وہ ناکامی تھی جس کی بناء پر ماہرین معیشت اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب کسی کو اسکی محنت کی کمائی کا پورا پورا مالک قرار نہ دیا جائیگا تو وہ پھر پوری پوری محنت کیوں کرے گا؟ اس لیے ہر شخص سے پوری پوری محنت اور بمطابق صلاحیت کام کروانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے اپنی ملکیت میں آزاد قرار دے دیا جائے۔ اسی سے نظام سرمایہ داری کی بنیاد پڑی۔ لیکن اس نظام کے خلاف اشتراکیت (Communism) نے بغاوت کی۔

اس تحریک کے بانیان نے غریب اور محنت کش طبقہ کو جذباتی بھڑکاوا دیا کہ اٹھ کر امیروں اور سرمایہ داروں کی دولت پر قبضہ کر لو۔ وہ اٹھے اور قبضہ کر لیا۔ اس سے ہنگامی طور پر انقلاب برپا تو ہو گیا لیکن بعد میں جب غریبوں کے جذبات سرد پڑ گئے تو پھر وہی سوال۔ کہ آخر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے لیے آمادہ کیسے کیا جائیگا؟ وہ کونسا جذبہ محرکہ ہوگا کہ جس سے ہر شخص خوب جان مار کر محنت کرے اور صرف بقدر ضرورت اپنے پاس رکھ کر باقی سب ریاست کے حوالے کر دے تا کہ وہ اپنے

اجتماعی نظام کے ذریعے اس فاضلہ رقم کو تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ رزق بہم پہنچانے کا انتظام کرے۔

اب کمیونزم تو اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ ان کے ہاں تو اس طبعی زندگی کے بعد حیات بعد الموت پر ایمان ہی نہیں۔اس لیے جب زندگی ہی طبعی ٹھہری اور یہ زندگی گزار کر مر گئے تو سب ختم ہو گیا تو پھر کسی مستقل اقدار یا قانون خداوندی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ایسے نظریات کے حامل لوگوں کے لیے صرف دنیاوی قوانین کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہوتی۔اب ان کو چونکہ جذبہ محرکہ نہیں مل رہا تھا۔اس لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے زبردستی کام کروائیں۔

ادھر سرمایہ دارانہ حکومتوں نے اپنے ہاں فلاحی ریاست (Welfare state) کا تصور پیدا کیا۔جس میں ریاست ضرورتمندوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنے کی تدابیر کو بروئے کار لاتی ہے۔لیکن مسئلہ سب سے بڑا یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب فاضل دولت موجود ہی نہ ہو تو لوگوں کی ضروریات آخر کیسے پوری کی جائیں گی؟اس مسئلہ سے نپٹنے کے لیے انہوں نے ٹیکسوں کا نظام وضع کیا۔لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں ایک شخص کی آمدن کا قریب ستر اسی فیصد مختلف ٹیکسوں کی نذر ہو جاتا ہے۔اپنی رضامندی وخواہش سے کوئی ٹیکس نہیں دیتا۔صرف قانون کا ڈنڈا ٹیکس دینے پر مجبور کرتا ہے اور لوگ اس قانون سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزماتے نظر آتے ہیں۔

پس استبداد وزبردستی تو دونوں جگہ نظر آتی ہے۔کمیونزم میں بھی اور سرمایہ دارانہ معیشت میں بھی۔فرق صرف اتنا ہے کہ کمیونزم میں یہ بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے جبکہ سرمایہ داری نظام میں اس پر فریب کا پردہ پڑا رہتا ہے۔بات دونوں جگہ ایک ہی ہے۔پس جو نظام زبردستی پر مبنی ہو،زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔یہی وجہ ہے کہ جہاں کمیونزم تباہی سے دوچار ہوا،وہاں سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ''جمہوری'' ریاستوں کی جمہوریت کی بنیادیں بھی ہلتی نظر آتی ہیں۔

چراغ تلے اندھیرا

لیکن باعثِ حیرت یہ بات ہے کہ جس چیز کی تلاش میں یہ دونوں نظام بالخصوص کمیونزم مارے مارے پھر رہے ہیں،وہ قرآن کریم سے نہایت بہترین انداز میں دستیاب ہے۔قرآن اس مسئلہ کا ایک ایسا حل پیش کرتا ہے کہ انسان داد دینے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔وہ کسی کی جیب سے زبردستی پیسہ نکالتا نہیں۔وہ انسان کے اندر کچھ ایسی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے کہ انسان خود بخود اپنی محنت کی کمائی کے بعد بقدر ضرورت رکھ کر باقی فاضل دولت خود ہاتھوں میں لیے پھرتا ہے کہ خدارا اسے لے لو۔جاننا چاہتے ہیں کہ کیسے؟آئیں اگلے باب کی طرف اور جاننے کی کوشش کریں۔

وہ عہد کرتا ہے کہ میں نے اپنی جان و مال اس نظام کے ہاتھوں فروخت کردی ہے جونوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوا ہے۔اسی معاہدہ کی رو سے ایک انسان اسلامی معاشرہ کا رکن بنتا ہے جسے ''مسلمان ہونا'' کہا جاتا ہے۔لہٰذا اس مسلمان کی ذاتی ملکیت تو کچھ بھی نہیں ہوتی۔وہ دن رات محنت کرتا ہے اور اپنی تمام محنت کے آؤٹ پٹ کو اس نظام خداوندی کی تحویل میں دے دیتا ہے جو تمام معاشرہ کی ضروریات ماں کی طرح پوری کرتا ہے۔اس سے اسی فرد کی ذات نشو ونما پاتی ہے اور بوقت ضرورت وہ اپنی جان بھی اسی ریاست کے لیے قربان کر دیتا ہے۔

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُواْ بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (سورہ التوبہ۔آیت 111)

وہ رب کی راہ میں جنگ کرنے کی خاطر سر بکف میدان میں نکل آتے ہیں۔یا تو پھر فاتح و کامران واپس آتے ہیں یا پھر میدان میں جان دے دیتے ہیں۔یوں وہ ایک بڑے فائدہ کی خاطر چھوٹے مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔اور یہ معاہدہ اور نظام کوئی نئی بات نہیں، یہ توریت اور انجیل میں بھی مذکور تھا (جو انہوں نے بدل ڈالا) اور اب اس کی تجدید قرآن کے ذریعہ کی گئی ہے۔اس عہد کا پورا کرنا رب نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔اور ظاہر ہے اللہ سے بڑھ کر اس وعدہ کو پورا کرنے والا کوئی نہیں۔پس اے جماعتِ مومنین، تم اس سودے پر جو تم نے اللہ کے نظام سے کیا ہے، خوش ہو جاؤ۔یہی کامیابی ہے۔

دین کا مقصد یہی قرآنی نظامِ ریاست قائم کرنا ہے اور یہ نظام رسول اللہ ﷺ اور ان کے عظیم ساتھیوں نے قائم بھی کر کے دکھا دیا۔

اور یہی نظام اب بھی ایک نہ ایک دن قائم ہو کر رہے گا، چاہے سرمایہ داریت، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اس کی راہ میں کتنے ہی روڑے اٹکائیں۔قرآن کو قیامت تک محفوظ بھی اسی لیے رکھا گیا ہے کہ کسی بھی دور میں انسانیت چاہے تو اس کو یہ قرآن نظام قائم کرنے کے لیے ضابطہ حیات محفوظ طور پر میسر ہو۔جس قوم نے بھی اس قرآن کو اپنا لیا، اس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہو جائیگا۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا کے انتہائی غریب لوگوں میں سے دو تہائی لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے صرف سات ممالک میں رہائش پذیر ہیں۔وہ ممالک ہیں بنگلہ دیش، چین، جمہوریہ کانگو، ایتھوپیا، بھارت انڈونیشیا اور پاکستان۔

(FAO: NEWS RELEASE 2010.)

4 زیادہ سے زیادہ کمانے کے بعد کم سے کم پاس رکھ کر باقی ضرورتمندوں کو دے دینے کا قرآنی جذبہ محرکہ اور انسانی ذات کی نشوونما کے اصول

کارل مارکس کے کمیونزم کی گاڑی جس جگہ رکی تھی، قرآن نے اسکی گاڑی کو وہیں سے چلانے کا مجرب نسخہ دیا۔ لیکن شاید یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے حق و باطل میں فرق کرنے کی کوشش نہ کی اور خدا اور وحی کے انکار میں غلط خداؤں اور محرف وحی کے انکار کے ساتھ ساتھ سچے خدا اور سچی وحی پر مشتمل الہامی ضابطہ حیات کا بھی انکار کر دیا جس میں ان ہی کی مشکلات کا حل پوشیدہ تھا۔

تفصیلی گفتگو کے لیے آگے بڑھنے سے قرآنی نظام زندگی کا ایک بنیادی اصول پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق:

(1) انسان اس دنیا کے اندر صرف ایک جسم کے ساتھ ہی موجود نہیں بلکہ جسم کے ساتھ اسے ایک ذات بھی دی گئی ہے۔ جسے عام زبان میں آپ ''روح'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ (قرآن اسے روح نہیں بلکہ نفس کہہ کر پکارتا ہے)

(2) انسانی زندگی کا اس زمین پر موجودگی کا حقیقی مقصد اپنی ذات کی نشوونما اور اسے پروان چڑھانا ہے۔

(3) انسانی جسم کی پرورش اس سے ہوتی ہے کہ کوئی شخص کس قدر کھاتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی پرورش اس سے ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو کتنا دیتا ہے۔ دوسرے افراد کی نشوونما کی خاطر کیا کچھ کرتا یا دیتا (Contribute) کرتا ہے۔ کوئی انسان دوسروں کی پرورش کے لیے جتنا زیادہ دے گا، اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما زیادہ ہوتی چلی جائیگی اور وہ مرنے کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیگا۔ اور جو شخص اپنی ذات کی نشوونما مناسب حد تک نہ کر پایا، اس کی زندگی موت کے بعد وہیں ایک جگہ رک جائیگی، جسے اللہ تعالیٰ نے جہنم کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔

روح کا قدیم تصور اور قرآنی مفہوم

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ (سورہ النحل۔ آیت 2)

روح کے متعلق ہمارے ہاں آج تک یہی سمجھا جاتا ہے کہ آدمی زندہ ہے تو اس میں روح ہے، مر گیا تو روح نکل کر اڑ گئی۔ پھر

یہ روح کہاں بھٹکتی پھرتی ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال تھا جس کے پھر مختلف مذاہب نے مختلف جوابات بھی تراشے۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ قرآن میں انسانی روح کا تو کہیں کوئی ذکر ہی موجود نہیں۔قرآن نے روح کا ایک بالکل مختلف تصور پیش کیا ہے۔روح تو ایک توانائی کو کہا جات اہے۔اصل میں مادہ (Matter) کے مقابلے میں یہ پرانا یونانی تصور تھا۔کہیں انہوں نے Spirit کا لفظ ایجاد کیا اور انسان کے لیے ان کے ہاں Soul کا لفظ مستعمل تھا۔یہی Soul ہے جسے روح کہا جاتا ہے۔پھر جب یونانی ترجموں نے جب فلسفوں کی شکل اختیار کی تو ہمارے ہاں عباسیہ دور میں ان اصطلاحات کا عربی میں ترجمہ ہوا تو وہاں انہوں نے اس کا ترجمہ ''روح'' کر دیا۔وہاں سے یہ بات پھر چل نکلی۔

قرآن انسان کے اندر روح نہیں، نفس کی موجودگی کی بات کرتا ہے۔

اللہ نے قرآن میں کسی ایک مقام پر بھی انسان کے لیے روح کا لفظ استعمال نہیں کیا۔وہ اس کے لیے نفس کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے معنی ہیں انسانی ذات۔اور کم از کم ایک ہزار سال گزرنے کے بعد آج کے دور میں اس کے لیے Self کا لفظ آیا ہے۔اس لفظ کے استعمال سے بات الگ ہوگئی۔محققین نے علمی انکشافات کی بناء پر محسوس کیا کہ یہ ایک اور چیز ہے جسے انہوں نے Self کہہ کر پکارا ہے اور آج کے دور میں جسے ہمارے ہاں علم النفس (Psychology) کے نام سے جانتے ہیں۔اس کے لیے انہوں نے نہ سپرٹ کا سہارا لیا نہ ہی Soul کا۔حتیٰ کہ لفظ Mind کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔انہوں نے Psyche کا ایک نیا لفظ تراشا اور یہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے ''نفس'' کہہ کر پکارا تھا۔روح کا لفظ استعمال نہیں کیا۔حالانکہ یہ تو عام مروج تھا۔اور ہمارے ہاں آج بھی مروج ہے۔اس لیے بھی کہ اس سے پھر آگے ''روحانیت'' کا تصور پیدا کیا جاتا ہے۔نہ کوئی روح کی آج تک حقیقی تعبیر پیش کر سکا نہ ہی روحانیت کے بارے میں بتا سکا ہے کہ یہ ہوتی کیا ہے۔قرآن میں نہ روحِ انسانی کا کوئی ذکر ہے نہ ہی روحانیت کا۔

قرآن میں روح کا لفظ وحی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن میں اللہ نے روح کا لفظ وحی کے لیے استعمال کیا ہے۔ہمارے ہاں یہ جو مشہور آیت Quote کر دی جاتی ہے کہ

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

(سورہ بنی اسرائیل۔آیت 85)

وہ تجھ سے روح کی بابت پوچھتے ہیں۔ان سے کہو کہ یہ خدا کے امر سے ہے۔تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہاں سے استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھیے ۔روح کا ذکر ہے اور روح کی بات کسی انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔بھئی جب تھوڑا علم دیا گیا ہے تو پھر روح کے تذکروں اور مباحث کا ہے کے؟

اس آیت میں بھی انسانی روح کا ذکر نہیں ہے۔البتہ اس آیت کے ساتھ ہی ایک آیت موجود ہے جو اس کی پوری طرح وضاحت کردیتی ہے۔لیکن ہمارے ہاں چونکہ رواج یہ ہے کہ قرآن میں دیکھ لیا کہ ''لا تقربو الصلوٰہ ''(سورہ النساء۔آیت 4)اور صلوٰہ کا انکار کردیا۔لیکن اس سے اگلا حصہ ''وانتم سکٰری'' بھی ساتھ ہے،اسے نہیں پڑھا۔

بالکل ایسی ہی صورتحال روح کے متعلق ہے کہ ''یسئلونک عن الروح'' اور اسے لے کر بھاگے کہ دیکھیے روح کی بات ہورہی ہے۔قرآن نے آگے کہا ہے کہ تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔اور پھر ''الروح من امر ربی'' کے بعد اگلی آیت ہے۔غور فرمائیں۔کہ:

وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا (بنی اسرائیل۔آیت 86)

کہ یہ وحی تیری فکر کی پیدا کردہ چیز نہیں ہے۔یہ تو ہماری مشیت (امر) کی شے ہے۔ہم چاہیں تو یہ سارے کا سارا علم لے جائیں۔تمہاری بات آگے چل ہی نہ سکے۔

یعنی واضح طور پر وحی کا لفظ اگلی آیت کے اندر موجود ہے۔لوگ اسے نہیں دیکھتے۔اور غلط طور پر انسانی روح کی دلیل اس آیت سے لانے لگ جاتے ہیں جو خالصتاً وحی الٰہی کے لیے آئی ہے۔

روح کا مطلب ہے وحی خداوندی۔اور وہ اس لیے کہ وحی کے ذریعہ جو قانون دیا جاتا ہے،اس میں بہت قوت ہوتی ہے۔بشرطیکہ اس کے پیچھے قانون نافذ کرنیوالی ایک قوت بھی ہو۔پھر اس آیت میں اگلا لفظ ''امر'' آجاتا ہے۔

امر اور خلق میں فرق

اہل مغرب کا ایک مشہور فلاسفر (Pringle Pattison) گزرا ہے۔اسکا کہنا ہے کہ انگریزی زبان اگرچہ بہت ترقی یافتہ زبان ہے،مگر بدقسمتی سے اس میں تخلیق اور پیدائش کے لیے ایک ہی لفظ ''Creation'' ہے۔لیکن اس کے مقابلہ میں عربی زبان بہت خوش قسمت ہے کہ وہاں اس کے لیے دو الفاظ الگ الگ مستعمل ہیں۔امر اور خلق۔

وہ کہتا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق اس وقت ہوتی ہے جب وہ محسوس طور پر سامنے آجاتی ہے۔اور اس محسوس دور سے پہلے بھی ایک زمانہ اس پر گزرتا ہے جب وہ چیز عالم تخیل میں ہوتی ہے۔اس کی پلاننگ ہورہی ہوتی ہے۔اسکیم پر سوچ بچار کیا جارہا

ہوتا ہے۔اس وقت وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے نہیں آئی ہوتی ۔ یہ تخلیق کا پہلا مرحلہ ہے۔خدا کی تخلیق تخلیق صرف اسی وقت کہلاتی ہے جب وہ ہمارے سامنے محسوس شکل میں تیار ہوکر آ جاتی ہے۔

اس سے پہلے مرحلہ میں وہ مشیت خداوندی یا ارادہ الٰہی میں ہوتی ہے۔یعنی اس کا ابھی نقشہ بنایا جارہا ہوتا ہے۔عام الفاظ میں وہ تصور یا تخیل میں ہوتی ہے جو ابھی محسوس شکل میں ہمارے سامنے نہیں آئی ہوتی۔قرآن نے اسے ''عالم امر'' کہہ کر پکارا ہے۔

امر کا مطلب حکم دینا نہیں بلکہ سمت کا تعین کرنا ہے۔

امر کے معنی حکم دینا نہیں۔عربی زبان میں اس کے معنی مختلف ہیں۔اس کے معنی ہیں سمت کا تعین کرنے والا،راستہ بتانے والا۔عربوں کے ہاں صحراؤں میں راستے نہیں ہوتے تھے،تو وہ چھوٹے چھوٹے پتھر نشاندہی کے لیے رکھ دیا کرتے تھے،انہیں امور کہا جاتا تھا۔حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے لیے لفظ ''امیر المومنین'' کو پسند فرمایا تھا اس لیے کہ سمجھتے تھے کہ قرآن کی رو سے بننے والے نظام مملکت میں سربراہ کی حیثیت محض ایک نشاندہی کرنے والے کی ہونی چاہیے۔جو امت کے لیے نشان راہ متعین کرتا چلا جائے۔ان کی حد تک تو ٹھیک تھا۔جب دین مذہب میں بدلا اور خلافت ختم ہوکر ملوکیت بن گئی تو پھر امیر کے معنی بھی مختلف ہوتے چلے گئے۔

تخلیق سے پہلے کا مرحلہ امر کہلاتا ہے اور جب وہ چیز تیار ہوکر محسوس شکل میں سامنے آتی ہے تو وہ تخلیق کہلاتی ہے۔اور وہ عالم خلق میں آ جاتی ہے۔''قل الروح من امر ربی'' روح کا تعلق تمہارے عالم خلق سے نہیں۔انسان کی فکر کی بھی پیدا کردہ کوئی چیز ہوگی تو وہ تخلیق کے مرحلے میں آ جائیگی۔اور وحی تو فکر انسانی کی مخلوق بھی نہیں۔دراصل اس کا تعلق بھی عالم امر میں سے ہے جو محسوس شکل میں سامنے نہیں آتا۔وہاں سے نبی کی وساطت سے ہی یہ ہدایات ملتی ہیں۔مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (سورہ النحل۔آیت 2) اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ وہ وحی ہر فرد کے اندر دوسرے جانداروں یا مویشیوں کی طرح نہیں رکھ دی جاتی۔نیز یہ چیز حیوانات کی طرح جبلی یا فطری طور پر نہیں ملتی۔بلکہ وہ اپنے بندوں میں جسے اس منصب کے لیے منتخب کرلیتا ہے،اس کی طرف وحی آتی ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے۔وحی یہ تھی أَنْ أَنذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ (سورہ النحل۔آیت 2)۔ہم اس کو وحی بھیجتے ہیں کہ انہیں آگاہ کردے کہ ہمارے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار نہیں۔

انسانی ذات کا تصور

جیسا کہ پیچھے بھی بتایا گیا کہ انسان میں طبعی جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی موجود ہے جسے ''انسانی ذات'' کہتے ہیں۔ذات کی حقیقت و ماہیت کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے ۔چاہے وہ اللہ کی ذات ہو یا انسان کی ۔ہم صرف اس کی صفات و اعمال ہی سے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

انسانی جسم لاتعداد خلیات (Cells) کا مرکب ہے۔مگر یہ خلیات ایسے نہیں کہ ایک دفعہ ہی کسی طرح وجود میں آ گئے اور پھر انسان کے مرنے تک ویسے ہی رہیں گے۔ان خلیات میں ہر دم تغیر و تبدل کا عمل جاری ہے۔جسے ماہرین حیاتیات میٹابولزم کہہ کر پکارتے ہیں۔انسان کی پوری عمر کے دوران تخریبی عمل کے ذریعہ لاتعداد خلیات ضائع ہوتے ہیں جنہیں کیٹابولزم (Katabolism) کہتے ہیں اور تعمیری عمل کے ذریعہ ان گنت نئے خلیات بنتے ہیں جسے اینا بولزم (Anabolism) کہا جاتا ہے۔اس تغیر و تبدل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی جسم کچھ عرصہ بعد بالکل ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے جس میں پچھلے جسم کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ تبدیلی ہر تیسرے چوتھے سال واقع ہو جاتی ہے۔ہر انسان کا جسم ہر آن تبدیل ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ دس پندرہ سال بعد اس کا جسم گزشتہ جسم سے بالکل ایک نئی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔

اب یہ سوچئے کہ اگر انسان میں ذات نہ ہوتی بلکہ صرف جسم ہوتا تو جیسا کہ تین چار سال بعد پہلا آدمی ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک بالکل نیا آدمی لے لیتا ہے تو اس تبدیلی کا عملی دنیا پر کیا اثر رونما ہوتا؟ اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

آپ کے ایک دوست نے آپ سے پندرہ سال قبل کچھ رقم ادھار لی تھی اور اس کی رسید یا پرونوٹ وغیرہ بھی آپ کو لکھ کر دے دیا تھا۔لیکن پندرہ سال گزرنے کے بعد اب وہ آپ کی رقم واپس کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔آپ عدالت میں مقدمہ کرتے ہیں اور اس کی وہ رسید جج کو پیش کرتے ہیں۔جواب میں آپ کے دوست کا وکیل ڈاکٹر کی یہ شہادت پیش کر دیتا ہے کہ جس دوست نے آپ کو پندرہ سال قبل رقم ادھار دی تھی، اس کا تو اب کوئی ذرہ بھی اس دوست کے جسم میں باقی نہیں۔وہ شخص تو مدت ہوئی فنا ہو گیا۔اب اس کی جگہ نیا آدمی معرض وجود میں آ گیا۔اب اگر اس سے قرض واپس لیا جاتا ہے تو یہ تو غلط ہوا کہ قرض کسی نے لیا تھا اور ادائیگی کوئی کرے۔اور اگر اسے عدم ادائیگی پر سزا دی جاتی ہے تو یہ اس سے بھی بڑی ناانصافی ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔

اب ذرا یہاں رک کر سوچیے کہ اگر یہ نظریہ تسلیم کیا جائے کہ انسان دنیا میں صرف اپنا طبعی جسم ہی رکھتا ہے اور اس کی زندگی یہی

طبعی زندگی ہے،اس کے بعد کچھ نہیں تو اس کے عملی نتائج کیا برآمد ہونگے ۔نہ کوئی عہد و پیماں باقی رہے نہ کسی ضابطہ یا قانون کی پابندی کروانا ممکن ہو پائے ۔نہ کسی کا احتساب لیا جاسکے اور نہ ہی کسی کو کسی جرم کا مرتکب قرار دیا جائے ۔اگر شادی کے دس سال بعد آپ کی بیوی آپ سے کہہ دے کہ جس عورت سے تم نے نکاح کیا تھا،وہ اب فنا ہو چکی ۔اس کی جگہ میں ایک نئی عورت کی شکل میں آ چکی ہوں پس میں تمہارے عقد کی پابند نہیں ۔

اب آپ خود اپنے آپ پر نگاہ دوڑائیں ۔فرض کیجیے کہ آپ کی عمر پنتالیس سال ہے،اس دوران آپ اپنی زندگی میں کوئی چار پانچ دفعہ تبدیل ہو چکے ہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات نے آپ کے ذہن کو بچپن میں متاثر کیا تھا،ان کی تلخ یا شیریں یادیں آج بھی آپ کے پاس موجود ہیں جنہیں یاد کر کے آپ کے دل و دماغ کو مغموم یا مسرور کر دیتی ہے ۔آپ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچ سکتے کہ جن کیفیات سے میں اس دور میں گزر رہا تھا،وہ میں اب نہیں ہوں،وہ کوئی اور تھا۔ہمیں صرف وہی نہیں اس کے بعد کے ادوار میں گزرنے والے تمام واقعات بھی یاد ہوتے ہیں ۔یعنی ہمارا اپنا ذاتی تجربہ ومشاہدہ ہمیں اس بات کی شہادت دیتا نظر آتا ہے کہ ہمارا جسم صرف مادی جسم نہیں جو مدت ہوئی فنا ہو چکا۔ہمارے اندر کچھ اور بھی موجود ہے جو جسم کے ان تغیرات کے ساتھ بالکل بھی تبدیل نہیں ہو پاتی ۔اسی ''چیز'' کا نام انسانی ذات (Human Personality) ہے ۔یہی ذات ہے جو ہر فرد کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی ذمہ دار ہے ۔

کچھ لوگ یہاں اعتراض کر سکتے ہیں کہ جن باتوں کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں وہ تو صرف انسانی حافظہ کی بدولت ہی یاد رہ پاتی ہیں ۔ان سے ذات کا تو کوئی تعلق نہیں ۔اور جب انسان کا حافظہ گم ہو جائے تو اسے اپنی سابقہ زندگی کا نہ کوئی واقعہ یاد رہتا ہے نہ ہی کسی واقعہ کا تذکرہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے ۔اور جب حافظہ ٹھیک ہو جائے تو ماضی کے واقعات پھر سے اس کو یاد آنے لگ جاتے ہیں پس یہ سب صرف یادداشت یا حافظہ کا کھیل ہے ۔

یہ خیال درست نہیں بلکہ انسانی جسم کے متعلق غلط فہمی کا نتیجہ ہے ۔دراصل انسانی ذات اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے کیلئے جسم کے اعضاء کو اپنا آلہ کار بناتی ہے ۔آپ کسی چیز کو پکڑنے کا ارادہ کرتے ہیں اور آپ کا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس چیز کو پکڑ لیتا ہے ۔اگر بالفرض آپ کا ہاتھ مفلوج ہو جائے تو وہ اس چیز کو پکڑنے کے لیے آگے نہیں بڑھے گا۔کیا ہاتھ کی عدم حرکت سے آپ اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ آپ کے اندر ارادہ کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی ،اور یہ سب صرف ہاتھ کا کرشمہ تھا۔جب ہاتھ ہی بیکار ہو گیا تو معاملہ ختم ۔آپ ایسا کبھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ آپ کے اندر فیصلہ یا ارادہ کرنے والی چیز ہاتھ

کے مفلوج ہوجانے کے بعد بھی موجود تھی۔فرق صرف اتنا واقع ہوا کہ جو ارادہ آپ کے اندر وہ چیز کرتی تھی، اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یا محسوس شکل میں عملی طور پر سامنے لانے کیلئے جس ہاتھ نے کام کرنا تھا، وہ اب اس کام سے قاصر ہے۔

انسان کے تمام اعمال چاہے وہ اس کی محض خواہشات ہوں یا محسوس اعمال، انسان کی ذات پر اپنے اثرات یا نقوش مرتب کرتے ہیں۔اور انسانی ذات اپنے ان نقوش کو اپنے دماغ کے ذریعے مشہود کرتی ہے۔اسی کا نام حافظہ ہے۔اگر دماغ کسی بیماری وغیرہ سے مفلوج ہوجائے تو وہ انسانی ذات کے ان نقوش کو ابھار کر سامنے لانے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔اور جب وہ صحت یاب ہوجائے، ٹھیک ہوجائے تو پھر سے اس میں وہی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔یہ ہے حافظہ کی حقیقت۔

اب روزمرہ زندگی کی ایک مثال کے ذریعہ حقیقت کو مزید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔فرض کیجیے آپ ٹی وی پر کوئی کرکٹ میچ دیکھ رہے ہیں۔میچ سنسنی خیز مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔یکا یک آپ کے سروس پرووائیڈر یا آپ کے ڈش ٹی وی میں کوئی فنی خرابی واقع ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے نشریات بند ہوجاتی ہیں اور آپ میچ دیکھنے سے محروم ہوجاتے ہیں۔ادھر میچ اب بھی جاری ہے۔ٹی وی نشریات بند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں میچ بھی ختم ہوگیا۔لیکن فرق کیا پڑا؟ صرف آپ ہی اسے نہیں دیکھا پا رہے۔جو ٹی وی اس میچ کے مناظر کو آپ تک پہنچانے کا ذریعہ بننا تھا، اس کی نشریات میں خرابی آگئی۔

اسی طرح آپ ایک آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں، اب وہ آئینہ گر کر ٹوٹ جاتا ہے اور اس پر آپ کا عکس دکھائی نہیں دیتا۔آپ کا وجود اب بھی برقرار ہے۔مگر وہ آئینہ جس نے آپ کے عکس کو دکھانا تھا، وہی ٹوٹ گیا۔

لہٰذا دماغ اصل ذات نہیں ہے۔دماغ صرف وہ پردہ سکرین ہے جس پر ذات اپنے نقوش یا اثرات کی نمائش کرتی ہے۔

انسانی ذات کا تصور قرآن کی رو سے

قرآن انسانی ذات کو نفس کہہ کر پکارتا ہے۔سورہ الشّمس میں ہے کہ:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (سورہ الشمس۔آیات 7تا10)

نفس یعنی انسانی ذات کو سنوارنے اور بگاڑنے کی صلاحیت انسان کے اندر رکھ دی ہے اور اسے با اختیار بنا دیا ہے۔اب جس نے اس ذات کی نشوونما کی، وہ کامیاب ہوگیا، اور جس نے اسے خود ساختہ پابندیوں میں دبائے رکھا، اور پھلنے پھولنے نہ دیا، وہ ناکام رہا۔

قرآن کی رو سے واضح ہے کہ کس طرح نفس انسانی اپنی ایک الگ اور منفرد پہچان رکھتا ہے۔اسی کو انسانی ذات کہتے ہیں۔

انسانی ذات کبھی بھی ضائع نہیں ہوسکتی

انسانی ذات پر انسانی جسم کے تغیرات کا کچھ بھی اثر نہیں پڑتا۔انسان کا ہاتھ مفلوج ہوجائے، ٹانگ ٹوٹ جائے، دماغ خراب ہوجائے، دیگر اعضاء کو نقصان پہنچے یا پھر پورا انسان ہی کسی وجہ سے موت سے دوچار ہوجائے تو انسانی ذات کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔وہ ختم نہیں ہوتی۔طبعی موت کے بعد بھی وہ باقی رہتی ہے۔اسی کو حیات بعد الموت کہتے ہیں۔

جیسا کہ پچھلے حصہ جات میں میں لکھ چکا ہوں کہ انسانی ذات کی نشوونما ہی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام ادیان اور اسلام کے تحت ایک انسان کا مقصد حیات ہے۔اسلامی معاشرہ کی یہی ذمہ داری ہے۔اگر انسانی ذات کی مناسب حد تک نشوونما ہوجائے تو یہ جسم کی موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجاتی ہے۔

انسانی ذات خدا کی ذات کا جزو بھی نہیں

انسانی ذات اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہے۔لیکن یہ خدا کی ذات کا جزو نہیں۔اللہ نے قرآن میں جو اسے ''من روحہِ یا من روحنا'' کہا ہے،اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اللہ ہی سے نکلی کوئی چیز ہے۔اور اللہ نے اپنی ذات کا کچھ حصہ انسان کو ''من روحنا'' کہہ کر دے دیا ہے۔ایسا تو ہم تب مانتے جب قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی یہ لکھا ہوتا کہ اللہ روح ہے اور اس نے اس روح کا کچھ حصہ انسان کو دے دیا ہے۔تو یہ مانا جاسکتا تھا کہ انسان اللہ کی ذات کا ہی ایک جزو ہے۔لیکن اللہ نے تو کہیں بھی ایسا نہیں کہا۔پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ذات اجزاء میں تقسیم نہیں ہوسکتی۔اس کے حصے نہیں کیے جاسکتے۔انسانی ذات محض اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی الوہیاتی توانائی کی مظہر ہے۔یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کی نمود تو ہوسکتی ہے۔وہ بھی انسانی حدود کے اندر رہ کر،لیکن اللہ کی ذات کی طرح بے انتہا یا لامحدود انداز میں نہیں۔

خیروشر

انسانی زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔قرآن نے وہ ضابطہ حیات انسان کو دیا جس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔قرآن کی رو سے اخلاقیات سے مقصد صرف اتنا ہی نہیں کہ ان کے مطابق آپ ایک فلاحی معاشرہ کا قیام عمل میں لائیں تو زندگی امن وسکون کی گزرتی ہے۔بلکہ مقصد دراصل یہ ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنے سے انسان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔اسے ہی عمل خیر کہا جاتا ہے۔جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو۔اور جس سے انسانی ذات کی نشوونما رک

جائے ،اسے عمل شریابدی کہتے ہیں۔

یہی معیار ایک صحیح یا غلط ریاست کا ہے جس میں افراد کی ذوات کی قرآنی اقدار کے مطابق نشوونما ہورہی ہو،وہ معاشرہ قرآنی ریاست کہلاتا ہے،اور جس میں انسانی ذات کی نشوونما رک جائے ،وہ باطل ہے،اوراسی کو محکومی اور ملوکیت کہتے ہیں۔جن افراد کی ذات کی نشوونما ہو،وہ آزاد ہیں،جن کی نشوونما رک جائے ،وہ محکوم اور غلام ہیں ،خواہ ان کی اپنی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

انسانی زندگی کا مقصد :انسانی صلاحیتوں کی نشوونما

اس دنیا سے آگے کی زندگی صرف نیک صالحین کی ہے۔یعنی وہ مومنین جنہوں نے دنیا میں قرآنی معاشرہ قائم کرکے اللہ کے قوانین کی حاکمیت کو عملی طور پر نافذ کرکے اپنی ذوات کو نشوونما دی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ اس دنیا کی زندگی میں نیک صالح بنے،عمل صالح کیے،پھر ہی ان کی ذات میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ حیات بعد الموت میں اگلے ارتقائی مراحل طے کریں۔آیئے اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔

سکول کی سطح پر جماعتیں ہوتی ہیں۔اول، دوم،سوم سے لے کر دسویں جماعت تک۔جو بچہ ایک جماعت کے امتحان میں پاس ہوجاتا ہے،اسے اس سے اگلی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے،یا Promote کردیا جاتا ہے۔یہ جو امتحان میں کہا جاتا ہے کہ پاس کردیا۔اس پاس کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کہ اس طالب علم میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ اگلی جماعت میں چل سکتا ہے۔جو نہیں چل سکتا،اسے پروموٹ نہیں کیا جاتا۔ایک امتحان تو یہ ہوتا ہے کہ اب یہ (بالفرض) ساتویں سے آٹھویں جماعت جو اس سے ذرا اعلیٰ ہے، میں چلنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔لیکن سال بھر جو طالب علم محنت کرتا ہے،یا اس سے محنت کا کام کرایا جاتا ہے،وہ سارا اسی لیے ہوتا ہے کہ اس سے اس میں اگلی کلاس میں جانے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

اگر اس نے اگلی کلاس میں نہیں جانا تو اسے نہ تو سال بھر پڑھنے کی ضرورت ہے نہ امتحان دینے کی (مادی نکتہ نظر)۔لیکن اگر اس نے اگلی کلاس میں جانا ہے تو پھر اس میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ اگلی کلاس میں جانے کے قابل ہوسکے (قرآنی نکتہ نظر)۔

فِیُ الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِیُن (سورہ النحل۔آیت 122)

وہ سب طلباء ساتویں جماعت میں ہوتے ہیں جن میں ساتویں جماعت میں چلنے کی صلاحیت پیدا کردی گئی ہوتی ہے۔ان

میں اس سطح کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔اس لیے وہ جنت جو قرآن بعد الموت بتاتا ہے کوئی مخلوط اجتماع نہیں ہوگا کہ جہاں سارے فیل پاس (سفارشی) بھی اکٹھے کر دئے جائیں گے۔وہاں وہی جائیگا جو اس سطح زندگی کے لیے درکار ضروری صلاحیتیں اپنی ذات میں پیدا کر چکا ہوگا۔اسی دنیا میں۔انسان کی زندگی ایسی ہے کہ یہ درجہ بہ درجہ ارتقائی مراحل طے کرتی چلی جاتی ہے۔اس دنیا میں آئے،اس کے بعد اس سے اگلی دنیا میں جائیں گے،وہاں کامیاب ٹھرے تو اس سے بھی اگلی دنیا میں۔پھر اس سے بھی آگے۔اور نہ جانے کیا صورت ہوگی ان دنیاؤں کی جو اس زمینی زندگی کے بعد آئیں گی،ان کی کیفیت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔انسان کو وہاں کا علم بالکل بھی نہیں دیا گیا۔کیونکہ یہ اس کے موجودہ احاطہ ادرا ک میں ہی نہیں آ سکتا۔البتہ قرآن میں دنیاوی مثالوں سے اللہ نے حیات بعد الموت کا تصور خوب واضح کر دیا ہے کہ وہاں کی زندگی بہر حال بہت ہی شاندار ہوگی۔اور انہی کے لیے ہوگی جنہوں نے دنیاوی زندگی میں اپنی ذوات کو مناسب حد تک نشو ونما دی ہوگی۔وہی مناسب حد جسے قرآن ''میزان'' کہہ کر پکارتا ہے۔فمن ثقلت موازینہ۔

اس کے برعکس جحیم وہ درجہ ہے جہاں کسی انسان کو روک دیا جاتا ہے۔کہ بس۔تمہاری آگے کوئی ضرورت نہیں۔اس میں اگلی کلاس یا اگلے لیول میں جانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

انسانی ذات کی پرورش کے قوانین: دوسروں کو دینا،دوسروں کے لیے کچھ کر دکھانا،دوسروں کو فائدہ پہنچانا۔

جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لیے قوانین مقرر ہیں کہ آپ روزانہ اتنی مقدار میں کھانا کھائیں اور اس میں فلاں مقدار میں پروٹین،کاربو ہائیڈریٹ،وٹامنز وغیرہ شامل ہوں تو آپ کا جسم نشو ونما پائے گا۔یعنی انسانی جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے کہ انسان کتنا کھاتا ہے۔جس جسم کی پرورش مقصود ہے،اسی کو کھانا پڑے گا۔کسی اور کے کھانے سے دوسرے کے جسم کی پرورش نہیں ہوسکتی۔جتنا انسان خود کھائے گا،اتنی ہی اس کے جسم کی نشو ونما ہوتی چلی جائیگی۔

اس کے برعکس انسانی ذات کی نشو ونما اس بات سے ہوتی ہے کہ آپ دوسروں کی نشو ونما کے لیے کیا دیتے ہیں؟ آپ معاشرہ کے افراد کے لیے کس قدر مددگار ہیں؟ بالفاظ دیگر انسانی جسم کی پرورش لینے سے،جبکہ انسانی ذات کی پرورش دینے سے ہوتی ہے۔

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی (سورہ اللیل۔آیت 18)

وہ شخص جو ہر اس چیز کو جو اس کی ضروریات سے زاید ہے،دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دے

دیتا ہے تا کہ اس کی ذات کی نشوونما و پرورش ہو جائے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى (سورۃ الاعلیٰ۔آیت 14)

اور کامیاب وہی ہوتا ہے جس کی ذات نشوونما پا جاتی ہے (تزکیہ نفس)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا تو اسے اختیار دیا اور ''نفخ من روحنا '' سے اس میں ذات کی شکل میں اپنی الوہیاتی توانائی پھونک دی۔ اور اسے حکم دیا کہ اسے زمین پر اللہ کے قوانین کا نفاذ کرنا ہے اور اس کی حاکمیت کو قائم کرنا ہے۔ اب اللہ تمام کائنات کا خالق ہے، وہ سب کو دیتا ہی دیتا ہے، کسی سے لیتا کچھ نہیں۔ پس جب اللہ کی ان صفات کا مظہر بننے کا انسان کو حکم ملا اور اس کو ایک عدد ذات دی گئی جس کی پرورش مقصود تھی تو پھر ظاہر ہے انسان کو بھی اللہ کی صفات کا مظہر بننے کے لیے زمین پر ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جو ہر ذی روح کی پرورش کرتا۔ انسان کو زمین پر رب کی ایک عملی شکل بن کر دکھانا تھا۔ اور یہی زندگی کا مقصد ہے کہ آپ دوسروں کو کتنا دیتے ہیں؟ اسی سے آپ کی ذات میں صفاتِ خداوندی پیدا ہوتی ہیں جن سے آپ موت کے بعد بھی حیاتِ ابدی کے حقدار قرار پاتے ہیں اور آپ کی ذات ارتقاء کی اگلی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس پر قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد قائم ہے کہ:

(1) مختلف افراد میں کمانے کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ جو انہیں اللہ ہی کی جانب سے عطا کردہ ہے۔

(2) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو زیادہ کماتا ہے، اس کے پاس اس کی ضروریات سے زائد دولت آ جاتی ہے۔

(3) جس کے پاس کمائی کی صلاحیت کم ہوتی ہے، اس کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔

(4) چنانچہ معاشرہ کا توازن قائم رکھنے اور افراد کی پرورش کے لیے ضروری ہے کہ جن کے پاس زائد دولت ہے، ان کی دولت ایسے لوگوں پر خرچ کی جائے جن کی ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں۔

(5) سوال یہ ہے کہ جن کے پاس فاضلہ دولت ہے، وہ اپنی دولت دوسروں کو کیوں دیں؟

اب یہاں ''اخلاقیات'' کی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ دولت مندوں کو انسانی ہمدردی کا واسطہ دے کر ان کے جذباتِ ہمدردی کو ابھارا جاتا ہے کہ وہ اپنی دولت خیرات میں دے دیں۔ لیکن ہمارا جنرل مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ ایسی تدابیر بہت ہی کم کامیاب ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہو سکتا۔ نیز جن لوگوں کی پرورش ہی خیرات کی چیز سے ہو، ان کی خودی تباہ ہو جاتی ہے۔ ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی اخلاقیات کا یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔

میں نے پیچھے یہ بتایا کہ دنیا بھر میں حکومتیں اس مقصد کے لیے مختلف اقسام کے ٹیکس عائد کرتی ہیں اور یوں مالداروں سے ان کی فاضلہ دولت حاصل رکتی ہیں۔ دولتمند طبقہ اسے ایک طرح کا جبر سمجھتا ہے اور ٹیکسوں سے بچنے کے لیے مختلف حیلے بہانے اور فرار کی راہیں اختیار کرتا ہے۔ اس سے معاشرہ میں بد دیانتی کا مرض عام ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہیں تو وہ زیادہ کمانا ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ جب ان کے پاس وہ فاضل دولت رہنی ہی نہیں تو وہ کیوں جان مار کر زیادہ کمائیں؟ اس سے ریاست کی پیداوار پر بہت ہی برا اثر پڑتا ہے۔

یہ ہے دنیا کی وہ سب سے بڑی مشکل جس کے حل کے لیے اشتراکی نظام بھی بری طرح ناکام ہو گیا۔ یہی وہ جذبہ محرکہ جس کے ذریعہ لوگ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے ملک کی پیداوار بڑھائیں، اور اس میں سے اپنی ضروریات جتنا رکھ کر باقی سب قرآنی ریاست کے سپرد کر دیں کہ وہ اسے مجموعی طور پر معاشرہ کے ضرورتمندوں کی پرورش میں استعمال کرے۔

انسانی ذات سے متعلق گزشتہ تصریحات سے آپ نے دیکھا کہ یہ جذبہ محرکہ جس کی تلاش میں سوشلسٹ مارے مارے پھرتے رہے، وہ صرف قرآن ہی سے مل سکتا ہے۔ کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ کما کر اپنی فاضلہ دولت دوسروں کی پرورش کے لیے دے دیگا، اتنا ہی اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائیگی۔ اس تصور کا حامل ہر مسلمان جان مار کر محنت کرتا ہے لیکن اپنی فاضل دولت اپنے پاس ہرگز نہیں رکھتا۔ اس سے ایک جانب نظام سرمایہ داری کی بھی جڑ کٹ جاتی ہے (کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضل دولت پر ہے)، جبکہ دوسری جانب اس مسئلہ کا بھی اطمینان بخش حل مل جاتا ہے جس کے لیے نظام اشتراکیت کو زبردستی کا کوڑا ہاتھ میں لینا پڑا تھا۔ اور وہ اس میں بری طرح ناکام رہا تھا۔

قارئین بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ کہ:

انسانی زندگی کا مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما۔

اور انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی ہے کہ انسان اپنی پوری محنت سے جان مار کر کمائے اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر فاضلہ دولت دوسرے ضرورتمندوں کو دے دے۔ یعنی اس دنیا پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا عملی نمونہ بن کر دکھائے۔ اس کی ذات بلند سے بلند ہوتی چلی جائیگی اور موت کے بعد ارتقاء کی اگلی منزل کی جانب مسکراتے ہوئے رواں دواں ہوگی۔

جس شخص کا اس فلسفہ حیات پر ایمان ہوگا، اس سے زیادہ سے زیادہ کام کروانے کے لیے نہ تو کسی ڈنڈے کی ضرورت پڑے

گی، نہ ہی اس کی زائد کمائی کو اس سے زبردستی چھیننے کی ضرورت۔ زبردستی تو دور کی بات رہی، اسے تو اس کے لیے کسی پند و نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ جانتا ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ کما کر دوسروں کو زیادہ سے زیادہ دینے سے خود اسکی اپنی ذات کی نشو ونما ہو رہی ہے۔ وہ جتنا زیادہ دے رہا ہے، اس کی ذات درجہ بہ درجہ بلند ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایسا شخص اپنی ذات کی ہی بھلائی کے لیے خوب جان مار کر محنت کرے گا، اور اس میں سے اپنے لیے بقدر ضرورت رکھ کر باقی سب اپنے دل کی کامل رضا مندی اور خوشی سے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے دے دیگا۔ یہی وجہ جذبہ محرکہ ہے جو قرآنی معاشی نظام کو کمیونزم سے جدا کرتا ہے۔ جو چیز ان کو میسر نہ آسکی، وہ ہمیں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بخوبی فراہم کر دی۔

سرمایہ داروں کی جانب سے کیا جانیوالا ایک اعتراض (قارئین ذرا غور کیجیے گا)

نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی جانب سے اس سلسلہ میں ایک اعتراض دہرایا جاتا ہے اور یہ وہ اعتراض ہے جو اس باطل نظام سرمایہ داری کے حق میں ایک بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان کا ذاتی مفاد ہی وہ واحد جذبہ محرکہ (Incentive) ہے جس کے تحت انسان خوب جان مار کر محنت و مشقت کرتا ہے۔ اگر آپ اس جذبہ کو نکال دیں گے تو کوئی انسان زور و شور سے محنت نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو وہ پیش کرتے ہیں اور پھر روس کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ دیکھ لیجیے۔ اس جذبہ محرکہ کو نکال دینے سے اشتراکیت کا نظام کیسے بری طرح فلاپ ہو گیا۔

جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے، یہ اعتراض واقعی ان کے لیے بہت اہم اور دقیق ہے۔ روس کے ناکام تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ واقعی اس فلسفہ حیات (کمیونزم) کی رو سے انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا کوئی جذبہ محرکہ باقی نہیں رہتا۔

یہ بات درست ہے کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور اپنا ذاتی مفاد ہی کام کرنے کے لیے جذبہ محرکہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل تردید نہیں کہ انسان اپنے بڑے مفاد کی خاطر چھوٹے مفاد کو قربان کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان مال و دولت سے محبت رکھتا ہے۔ اسے بڑی محنت سے کماتا اور پھر سنبھال کر رکھتا ہے۔ لیکن جب کبھی وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اپنی جان بچانے کے لیے اپنے اسی مال کو بے دریغ خرچ کرنے لگتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا، لوگ اس پر لعن طعن کرتے ہیں۔ سب مالداروں پر جب بیماری آپڑتی ہے تو وہ اپنا وہ روپیہ جو سنبھال رکھا ہوتا ہے، اسے پانی کی طرح بہاتے

ہیں۔صرف اس لیے کہ ان کے نزدیک ان کی جان ان کے مال سے زیادہ قیمتی ہے۔اور وہ اپنی قیمتی ترین متاع (جان) کو بچانے کے لیے کم قیمت کی متاع (مال) کو خرچ کر ڈالتا ہے۔

انسانی ذات: مال سے زیادہ قیمتی

پس ثابت یہ ہوا کہ قرآنی نظریہ حیات کی رو سے مال کی بھی بلاشبہ ایک قیمت ہے۔لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی انسانی ذات ہے۔لہٰذا جب وہ اپنی ذات کی نشوونما کے لیے اپنا مال دوسروں کو زیادہ سے زیادہ دیتا ہے تو وہ اپنے بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو قربان کر رہا ہوتا ہے۔وہ اسے منافع بخش سودا سمجھتا ہے۔لہٰذا اس فلسفہ حیات کے مطابق انسان اپنے مفاد کو کبھی بھی قربان نہیں کرتا، بلکہ کم فائدے کو چھوڑ کر زیادہ فائدے کی جانب لپکتا ہے۔

پس یہ جو اعتراض نظام سرمایہ داری کے حامیان کی جانب سے کیا جاتا ہے، اس کا جواب کمیونزم کے فلسفہ سے تو واقعی نہیں مل سکتا۔لیکن قرآنی معاشی نظام کے نکتہ نظر کی رو سے اس اعتراض کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔اور اگر دنیا پر نگاہ ڈالی جائے تو اس امر کا اعتراف خود اس قرآنی معاشی نظام کے مخالفین اور سرمایہ داریت کے علمبردار بھی کرتے ہیں۔وہ ان لوگوں کے مجسمے نصب اور یادگاریں قائم کرتے ہیں جنہوں نے بڑی محنت سے مال کمایا اور اسے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کسی قوم یا فرد نے کبھی کسی ایسے شخص کی یادگار قائم نہیں کی جس نے کروڑوں اربوں روپے کمائے ہوں لیکن اپنی اس دولت کو اپنے یا اپنی اولاد تک محدود رکھا اور پھر اسی حالت میں مر گیا۔دنیا نے ایسے افراد پر ہمیشہ لعنت ہی بھیجی ہے۔قرآن کی رو سے بقاء اور ابدیت کا اصول ہی یہ ہے کہ:

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (سورہ الرعد۔آیت 17)

دنیا میں بقاء اور غلبہ اسی کے لیے ہے جو پوری نوع انسانی کے لیے فائدہ مند ہو۔

دنیا کی دوسری اقوام میں تو ایسے لوگ شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔کوئی ایسا نکل آئے تو بہت بڑا ہیرو بن جاتا ہے۔مگر قرآن تو ہر مومن کو انہی خصوصیات کا حامل بنانا چاہتا ہے۔جیسا کہ میں پیچھے بتا چکا ہوں کہ قرآن تو اپنی اسلامی سوسائٹی کی تشکیل ہی اس معاہدہ کے ذریعے ممبرشپ کے ساتھ کرتا ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (سورہ التوبہ۔آیت 111)

پستی سے بلندی تک: (قرآنی نظام کے قیام تک سفر کے مختلف مراحل)

قرآنی نظام کی جانب سفر: پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف

جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصہ میں میں نے ایک جگہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی نظام کے قیام کو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے سے تشبیح دی ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ پہاڑ پر تیزی سے دوڑ کر یا ایک دم سے نہیں چڑھا جاتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ،قدم بقدم،ٹھہر ٹھہر کر اور رک رک کر بتدریج چڑھا جاتا ہے۔اس میں بعض اوقات سانس بھی پھولنے لگتا ہے۔تب کہیں جا کر یہ منزل طے ہوتی ہے۔

نہ جانے انسان نے ذاتی ملکیت کا تصور کب پیدا کیا تھا،لیکن جب بھی پیدا ہوا،آج کے دور کے حساب سے لگتا یوں ہے کہ ذاتی ملکیت کا جذبہ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہر شخص فطری طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ اگر اشیاء پر کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہنے دی جائے تو کوئی بھی انسان برضاورغبت کام نہیں کرے گا۔محنت سے کام کرنے اور سرتوڑ کوششیں کرنے کے تمام جذبات ختم ہو جائیں گے۔اس لیے ایسا نظام جس میں ذاتی ملکیت کا تصور ہی باقی نہ رہے، نہ صرف ناکام بلکہ قابل عمل ہوگا۔ یہ ہے وہ تصور جو ہمارے ہاں اس وقت پایا جاتا ہے۔

اب ایسی صورتحال میں آپ کسی صبح اٹھیں اور ساتھ والے سے کہیں کہ بھئی اپنی تمام املاک کو ختم کر دو (یا انہیں ختم کر دیا جائیگا)، یا ریاست کی تحویل میں دے دو۔تو یہ فی الواقعہ ایک ناقابل عمل طریقہ کار کو استعمال کرنے والی بات ہوگی۔اس کے علاوہ انسان نے جو معاشرہ ذاتی مفاد کی بنیادوں پر قائم کر رکھا ہے۔اس میں ہر فرد جانتا ہے کہ اس کا اور اس کے گھرانے ،بیوی بچوں کا زندہ رہنا صرف اسی صورت ممکن ہے جب اس کے پاس کچھ موجود رہے۔مشکل وقت پڑتا ہے تو کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔سب کھانے کے یار، مطلبی ٹٹو ہوتے ہیں۔انسان کے کام وہی پیسہ آتا ہے جو اس کی ملکیت میں ہو یا اچھے برے وقت کے لیے اس نے بچا کر رکھا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے حالات میں آپ کسی سے یہ مطالبہ کر دیں کہ بھئی اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کر دو، یا فلاں ضرورتمند کو

دے دو،تو یہ ایک ناممکن العمل مطالبہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن ایسے معاشرہ سے اپنے مطلوبہ قرآنی معاشرہ کی جانب آہستہ آہستہ لے کر جاتا ہے۔انسانیت یہ سفر منزل بہ منزل گرتے پڑتے طے کرتی ہے۔لیکن قرآن پورے راستے انسان کی طرف اپنی ہدایات کی انگلی کیے رکھتا ہے کہ لو پوری راہ میں تمہیں اپنی ہدایات دوں گا جن سے تمہیں راستہ طے کرنے میں قطعاً مشکل نہیں ہوگی۔

قرآن ایک طرف افرادِ ریاست کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرتا جاتا ہے اور دوسری جانب نئے نظام کے مطابق ایسے حالات پیدا کرتا جاتا ہے جس سے انسان کو رفتہ رفتہ اطمینان حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ اگر اس نے کچھ دیا تو وہ بھوکا نہیں مرے گا۔یا اسے بھوکا نہیں مرنے دیا جائیگا۔اس طرح وہ بتدریج قدم بہ قدم نئے معاشرے کے مطابق ڈھل جانے کی صورتحال پیدا کر لیتا ہے۔

پس صدقہ وخیرات،بیع وشریٰ،لین دین،معاہدے،ترکہ ووراثت کے احکام ایسے احکام ہیں جو اسی عبوری (منزل آنے سے پہلے والا دور) دور سے متعلق ہیں۔جوں جوں حالات بدلتے جاتے ہیں،یہ عبوری دور کے احکامات پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔درحقیقت یہ احکامات حالات سے مشروط ہیں۔مثلاً قرآن میں زنا کی سزا مقرر ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایسے معاشرتی حالات پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں زنا کے امکانات کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو جائیں۔اور ایک وقت ایسا آئے کہ کوئی بھی شخص زنا کا مرتکب نہ ہو۔اب ظاہری بات ہے کہ اس وقت زنا کی سزا کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔یہ حکم موجود تو رہے گا،مگر نافذ العمل نہیں ہوگا۔بلکہ عارضی طور پر ساقط العمل ہو جائیگا۔اسی طرح قرآن میں ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ دس مساکین کو کھانا کھلانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔(سورہ مائدہ۔آیت 89)

اب چونکہ قرآن نے غلامی کے راستے کو مکمل بند کر دیا تھا۔لیکن جو غلام دورِ رسالت میں موجود تھے،ان کے متعلق مختلف ایسے احکامات دے دیے جن سے وہ آہستہ آہستہ معاشرہ ہی کا حصہ بن جائیں۔اب جب کہ غلامی ممنوع قرار دئے جانے کے بعد معاشرہ میں بالآخر کوئی غلام ہی باقی نہ رہے گا تو پھر اس وقت قرآن کا یہ حکم ''کہ کفارہ میں غلام آزاد کرو'' بھی نافذ العمل نہیں رہے گا۔

اسی طرح کوئی معاشرہ اگر ایسا خوشحال ہو جائے کہ اس میں بھوکوں اور مسکینوں کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے،سب کھاتے پیتے ہو جائیں تو یہ حکم بھی ساقط ہو جائیگا کہ ''دس مساکین کو کھانا کھلاؤ''۔اس وقت یہی قرآنی ریاست کا نظام مملکت ہی ہوگا جو

فیصلہ کرے گا کہ اب کفارہ کے بدلے میں کیا کرنا چاہیے۔پھر اگر حکومت کی جانب سے ایسا انتظام ہو جائے کہ ہر ضرورتمند کو حکومت کی طرف سے قرضہ مل سکے تو قرض کے سلسلے میں نجی لین دین کے معاملات نہ ہو پانے کے سبب قرآن کے لین دین سے متعلق احکامات بھی ساقط العمل ہو جائیں گے۔اسی طرح اگر کوئی شخص جائیداد چھوڑ کر نہ مرے تو اس پر وراثت سے متعلق احکامات نافذ ہی نہیں ہونگے۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ احکامات ہمیشہ حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن میں ان احکامات کی ضرورت باقی نہ رہے تو یہ نافذ العمل نہیں رہیں گے۔

لیکن ایک بہت ضروری نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ اس وقت بھی یہ احکامات ''منسوخ'' (Abrogate) نہیں ہونگے۔صرف ساقط العمل (Inoperative) ہی ہونگے۔اس سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ پڑ جائے کہ یہ چیز بھی ناسخ و منسوخ کے زمرے میں آتی ہے۔ناسخ و منسوخ کا باطل عقیدہ قرآن کے کچھ احکامات کو مستقلاً منسوخ بتاتا ہے، جبکہ یہاں میں بات کر رہا ہوں عارضی طور پر ساقط العمل ہونے کی۔اگر پھر کسی دور میں وہی حالات پیدا ہو جائیں تو پھر سے وہی ساقط حکم دوبارہ نافذ العمل ہو جائیگا۔جس طرح پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو کا حکم ساقط العمل اور تیمّم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے، اور جب پانی مل جائے تو تیمّم کا حکم ساقط اور وضو دوبارہ نافذ العمل ہو جاتا ہے۔بالکل ویسی صورتحال ہے۔دونوں صورتوں میں وضو اور تیمّم دونوں احکامات اپنی جگہ موجود رہتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی حکم اپنے حالات کی عدم موجودگی میں منسوخ نہیں ہو جاتا۔اور اگر کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جائے کہ ملک میں جگہ جگہ وافر مقدار میں پانی دستیاب ہو تو پھر تیمّم سے متعلق حکم کی ضرورت نہیں رہے گی۔لیکن یہ حکم منسوخ نہیں ہوتا۔بلکہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔

پہلی سٹیج: انفرادی زندگی

دنیا پر قرآن کا نزول ایک ایسے معاشرہ پر ایسے وقت میں ہوا جو نظام سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ایک طرف بڑے بڑے سردار اور ایسے متمول افراد ہیں جو دولت کے نشے میں چور ہیں اور دوسری جانب ایسے غرباء و مساکین ہیں جو ایک وقت کی روٹی کے لیے بھی ترس رہے ہیں۔چنانچہ ایسے معاشرہ میں قرآن کی جانب سے سب سے پہلے متمول افراد سے درخواست (Appeal) کی جاتی ہے کہ وہ ان مجبور، معذور اور نادار لوگوں کی روٹی کا انتظام کریں۔ان کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائیں جو کسی نہ کسی طرح اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے سے معذور ہیں۔جن کی قلیل آمدنی ان کے لیے کافی نہیں

رہتی۔قرآن ایسے لوگوں سے درخواست کے علاوہ انہیں سخت تنبیہ بھی کرتا ہے کہ اگر تم نے ان غرباء ومساکین کی روٹی کا انتظام نہ کیاتو تم پر جہنم کا عذاب مسلط کر دیا جائیگا۔ملاحظہ فرمائیں:

نَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ۔(سورہ الحاقہ۔آیات 33تا35)

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاء وَلَا شُكُوراً إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْماً عَبُوساً قَمْطَرِيراً۔ (سورہ الدھر۔آیات 8تا10)

حیات بعد الموت میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا،اس پر گفتگو نہیں کی جاسکتی،اس کا تصور انسانی شعور کی پہنچ سے باہر ہے۔لیکن دنیا کے حوالہ سے انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے اپنے چال چلن کو ٹھیک نہ کیااور معاشرہ کا نقشہ تبدیل نہ کیا جس میں کثیر تعداد میں لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم نظر آتے ہیں تو یاد رکھو ملک میں ایک وقت ایسا فساد برپا ہوگا کہ تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔اس وقت تم بدحواس ہوکر پوچھتے پھروگے کہ ایسا کیوں ہوا؟ تب اللہ کا اٹل قانونِ مکافات تمہیں بتائے گا کہ تمہارے ہاں عزت ومنزلت کا معیار اپنے گروہ کی اکثریت تھی۔تم میں جو تنہا اور بے سہارا رہ جاتا تھا،تم اسے عزت دار ہی نہیں سمجھتے تھے۔جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی وجہ سے رک جاتا تھا،تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے،نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔(سورہ الفجر۔آیات 17تا20)

چنانچہ پھر ہوتا یوں تھا کہ جس معاشرہ کی طرف بھی اللہ نے اپنے دین کی صورت میں ایسے احکامات بھیجے،وہاں سے کچھ لوگ اس نئی آواز پر لبیک کہہ کر اس داعی انقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے۔انہیں ہی (جماعت مومنین) کہا جاتا تھا۔ان لوگوں سے بھی اللہ تعالیٰ کہتا کہ یاد رکھو۔تم نے اگر حق کا ساتھ دینا شروع کیا ہے تو تمہیں اپنے سر پر بہت بھاری ذمہ داری لینی ہے۔تمہیں مجبوروں،بے کسوں،ناداروں اور مساکین کی روٹی کا انتظام کرنا ہے۔اور ایسا تعریف یا ان سے صلہ کی توقع کے بغیر بے لوث کرنا ہوگا۔(سورہ الجن۔آیت 8تا10) یہ ایک بہت دشوار گزار چوٹی ہے جس پر تمہیں چڑھنا ہوگا۔(سورہ الفجر۔آیات 11تا16) جو ایسا نہیں کرے گا،وہ اپنے دعویٰ ایمان کی تکذیب کر دے گا۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ

الْمِسْكِيْنِ (سورہ الماعون۔آیات 1تا3)

کیاتم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہ وہی ہوتا ہے جو بے سہارا اور لاوارث لوگوں کو دھکے دیتا ہے۔اور غربا ءو مساکین کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔(بہت توجہ کی ضرورت ہے۔دین کا حقیقی مقصد بیان کیا جارہا ہے۔اور ایسا نہ کرنے کو دین کی سرے سے ہی تکذیب قرار دیا جارہا ہے)

۔پس اگر تم ایمان لائے ہو تو تمہارے دعویٰ ایمانی کی سچائی کا ثبوت یہی ہوگا کہ تم ضرورتمندوں اور محروموں کی ضروریات پوری کرنے اور ان کی پرورش کے لیے کیا کچھ دیتے ہو؟ ذیل میں وہ قرآنی احکامات پیش کیے جارہے ہیں جو اسی ابتدائی منزل کے لیے ہیں جہاں سے قرآنی نظام کی جانب سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

صدقہ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ قرآن مومنین سے اسلام لانے کے بعد تقاضا کرتا ہے کہ اگر تم دعویٰ ایمانی میں سچے ہو تو اپنے اس دعویٰ کا عملی ثبوت پیش کرو، معاشرہ کے محروموں اور ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرو، ان کی پرورش کے لیے زیادہ سے زیادہ دو۔قرآن نے اسے صدقات کا نام دیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس کام کا آغاز تم اپنے عزیز و اقارب سے کرو، پھر اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اپنے پرائے کی تمیز سے بالاتر ہوتے ہوئے معاشرہ کے ہر ضرورتمند اور محروم کی امداد کرو(سورہ البقرہ۔آیت 215،سورہ الروم۔آیت 38)

لیکن یہ بھی نہ ہو کہ تم کسی کی امداد کرو تو پھر اس کے سینے پر احسان کی بھاری سل رکھ دو جس کے بوجھ تلے وہ بیچارا عمر بھر دبا رہے۔اور نہ ہی اپنے ان صدقات کی نمائش کرتے پھرنا۔اسے انسانیت اور اسلام کا بنیادی ترین فریضہ سمجھ کر ادا کرنا۔تمہاری بے باک عقل تمہیں کہے گی کہ اگر ہم دوسروں کو اپنی جانب سے دیتے ہیں تو کم از کم اس کی مشہوری تو ہو۔ان پر اپنا احسان جتلائیں۔معاشرہ میں ہمارا نام ایک نیک دل اور مخیّر کی حیثیت سے لیا جائے۔لیکن تم عقل کے بہکاوے میں مت آنا۔بلکہ اسے سمجھانا کہ تم جو کچھ بھی دے رہے ہو وہ رائیگاں نہیں جائیگا۔اس کی ایک ایک پائی کا تمہیں اجر ملے گا۔اس کی مثال یوں سمجھ لو کہ ایک کسان مٹی میں بیج کے دانے دبا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔کچھ عرصہ بعد ایک ایک دانے سے سینکڑوں دانے مزید اسے واپس مل جاتے ہیں۔اسی طرح ان صدقات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہارے اس عمل سے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھ دی جائیگی جس میں انسانیت کے حقوق محفوظ تر ہو جائیں گے۔تم ایک جنت نظیر قرآنی معاشرہ کی بنیاد رکھنے جارہے ہو جس سے خود تمہاری اپنی ذات کی بھی نشوونما ہوتی جارہی ہے۔یوں تم اور تمہاری آئندہ نسلیں ان ہولناک

تباہیوں سے محفوظ ہوجاؤ گے جو انسان کی ناہمواریوں اور فساد کا فطری نتیجہ ہے۔(سورہ البقرہ۔آیات 261تا276)سورہ ابراہیم۔آیت 31)

مال و دولت کے معاملات میں اصلاحی اقدامات

اس ابتدائی سٹیج پر جہاں ایک جانب ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی طور پر ترغیب دی جارہی ہے، وہاں دوسری جانب مالی معاملات میں بھی اصلاحی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔لہٰذا قرآن کہتا ہے کہ دوسروں کا پیسہ باطل طور پر مت کھاؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً

(سورہ النساء۔آیت 29)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ

أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 188)

انسان اپنے جذبات سے اس قدر مغلوب ہوجاتا ہے کہ اسکی پوری کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کا مال کسی طرح اس کے پاس آجائے۔خواہ اس کے لیے اسے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔یہ بہت تباہ کن ذہنیت ہے۔پس جماعتِ مومنین کو حکم دیا جارہا ہے کہ تم اس طرح دوسروں کا مال ناحق نہ کھانا، ہاں البتہ معاشرہ میں ضروریات زندگی کی اشیاء کا تبادلہ جسے ہم تجارت کہتے ہیں، باہمی رضامندی سے ہونا چاہیے۔ایسا ہرگز نہ ہو کہ ایک شخص محض سرمایہ کے بل بوتے پر دوسرے کی محنت کی کمائی بٹور لے (سرمایہ داریت)، یا بغیر کچھ لگائے مفت میں دوسروں کی کمائی اپنی جیبوں ڈالتا چلا جائے (مذہبی پیشوائیت)۔

اور اللہ نے ساتھ ہی اس امر کی وضاحت بھی کر دی کہ مذہبی پیشوائیت اور مشائخ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں (مفت خوری)۔پس ایسے لوگوں کو کچھ نہ دو۔وہ خود محنت کر کے کمائیں اور کھائیں (سورہ توبہ۔آیت 34)۔یتیموں کے مال کی حفاظت کرو۔(سورہ النساء۔آیت 6، سورہ الانعام۔آیت 153، سورہ بنی اسرائیل۔آیت 34)۔اگر عورت بھی کچھ کماتی ہے تو مرد بلاوجہ اس کی کمائی پر غاصب بن کر نہ بیٹھ جائے۔عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی اور مرد اپنی کمائی کا۔ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر کسی کو ایک دوسرے کی کمائی میں حق تصرف نہیں۔لین دین کے معاملات کے متعلق حکم ہوا کہ انہیں باضابطہ

تحریر میں لایا کرو(سورہ البقرہ۔آیت 282) اسٹامپ پیپر کا اجراء اسی حکم کی حکمت کو بھانپتے ہوئے عمل میں لایا گیا۔مقروض اگر تنگدست ہوتو اس کا قرض معاف کردو(سورہ البقرہ۔آیت 280)۔ہر کوئی اپنے ترکہ سے متعلق وصیت کرے (سورہ البقرہ آیت 180،سورہ المائدہ آیت 106)۔اور اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ متوفی وصیت نہ کر پایا یا اس کی وصیت سارے ترکہ پر محیط نہیں تو پھر ترکہ کی تقسیم ان احکامات کے مطابق ہوگی جو قرآن میں درج ہیں(سورہ النساء آیت 7،سورہ النساء آیت 12-11)۔اس تقسیم کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ یوں دولت ایک جگہ ہی مرتکز ہونے کی بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

خرید وفروخت یا مالک ومزدور کے تعلقات کے سلسلہ میں معاملات کو احسن طریقہ سے انجام دو۔ناپ تول میں کمی مت کرو۔خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں پوری پوری چیز دو۔مزدور کی مزدوری ضابطہ وقانون کے تحت اور بمطابق معاہدہ ادا کرو۔(سورہ الانعام۔آیت 153،سورہ الاعراف آیت 85،سورہ ہود۔آیت 84،سورہ المطففین۔آیت 1تا7)

زرعی اصلاحات کے متعلق ابتدائی قوانین

مکہ کے عربوں کی معیشت زرعی نہیں تھی۔وہ لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔اس لیے قرآن نے اس ابتدائی منزل میں انسانوں کی توجہ زیادہ تر کاروباری معاملات پر ہی مرکوز رکھی ہے۔زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اس میں بھی نادار اور ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دو۔اور زمین کی پیداوار میں سے بھی دو(سورہ البقرہ۔آیت 267)۔اسے خدا کا حق کہہ کر پکارا گیا(سورہ الانعام۔آیت 142)۔جیسے صدقات کے معاملہ میں کہا گیا تھا کہ اگر تم نے معاشرہ کے مفلوک الحال اور غریب لوگوں کی ضروریات پوری نہ کیں تو تمہارے معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہوگا جس سے تمہارے موجودہ خودساختہ قوانین عزت وتکریم تباہ وبرباد ہوکر رہ جائیں گے۔اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا گیا کہ اگر تم نے اس میں سے ''اللہ کا حق'' محتاجوں اور اور ضرورتمندوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانہ جل کر راکھ ہوجائیگا۔(سورہ القلم۔آیات 17تا33،سورہ الکہف۔آیات 32تا44) اور تمہارے بال بچے تک برباد ہوجائیں گے۔(سورہ البقرہ۔آیت 266)

دوسری سٹیج: انفرادیت سے اجتماعی نظام کی جانب اگلا قدم

پہلی سٹیج میں قرآن کی تمام ہدایات انفرادی تھیں۔اس مرحلہ کے دوران جن لوگوں کے ذہنوں میں اس دعوت کے نتائج کی صداقت نقش ہوگئی اور وہ اس کے قائل ہوگئے،وہ اس داعی انقلاب کے گرد جمع ہوتے گئے اور یوں ان کا ایک معاشرہ وجود

میں آنا شروع ہوگیا۔ جب معاشرہ ایک مخصوص حجم کو پہنچ گیا تو اب اس عظیم انسانی فلاحی پروگرام اپنی اگلی سٹیج کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ انفرادیت سے اجتماعیت کی جانب قدم تھا۔

پہلی سٹیج میں کہا گیا کہ لوگ غرباء و مساکین اور محروموں کی امداد خود اپنے طور پر کریں اور اسے ''صدقات'' کا نام دیا گیا۔ اب قران نے کہا اب انفرادی طور پر مت دو بلکہ صدقات یا عطیات کو خود ہی اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے قرآنی نظام کے مرکز (رسول اللہ ﷺ) کے پاس جمع کرادو۔ اور اس اولین قرآنی ریاست کے سربراہ یعنی رسول پاک ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو (سورہ التوبہ۔ آیت 103) اور اس روپے کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لیے ان مصارف پر خرچ کرو جن کا ذکر سورہ توبہ کی آیت نمبر 60 میں کیا گیا ہے (یاد رکھیں سورہ توبہ میں مذکور یہ مصارف صرف صدقات کے ہیں، زکوٰۃ کے نہیں۔ ہمارے ہاں غلط فہمی سے اسے زکوٰۃ کے مصارف سمجھا جاتا ہے جو کہ بالکل غلط تصور ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے جا کر زکوٰۃ کے عنوان کے تحت کی جائیگی)۔ اس سے پہلے حکم یہ دیا گیا تھا کہ ضرورتمندوں کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو ہمیشہ مدنظر رکھو۔ اب یہ حکم دیا گیا کہ ''قرض اللہ کو دیا کرو'' (سورہ الحدید۔ آیت 18، سورہ المزمل آیت 20)۔ یعنی جب تمہاری قرآنی ریاست کسی اجتماعی ضرورت یا کسی ہنگامی صورتحال کے لیے تم لوگوں سے اپیل کرے تو جو کچھ کسی سے ہو سکے دے، کچھ عرصہ بعد جب تمہارا معاشرہ معالی طور پر مضبوط ہو جائیگا اور یہ قرآنی نظام معیشت اپنی مکمل خوشگواریوں سے قائم ہو جائیگا تو جو کچھ تم نے اللہ کو بطور قرض دیا ہوگا، اس کا ایک ایک پیسہ تمہیں واپس مل جائیگا (سورہ انفال۔ آیت 60)۔ لیکن اگر اُس وقت تم نے بخل سے کام لیا اور ریاست کے سربراہ کی اپیل کے باوجود دینے میں لیت و لعل سے کام لیا تو پھر یاد رکھو تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لیے تم اپنی تباہی اپنے ہاتھوں مول نہ لو (سورہ البقرہ۔ آیت 195)۔ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہ مارو۔ اب یہ ہلاکت و تباہی کیا ہوگی؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے، بے نشاں ہو جاؤ گے، اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تم جیسی نہیں ہوگی (سورہ محمد۔ آیت 38)۔ انفرادی مفاد پرستی کے جذبات اور شیطانی وسوسے تمہیں ورغلائیں گے کہ تم اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو، وقت پر تمہارے کام آئے گا (سورہ البقرہ۔ آیت 268)۔ لیکن تم اس کے دھوکہ میں نہ پڑنا۔ معاشی ناہمواریوں سے سوسائٹی میں جو فساد اور تباہی رونما ہوتی ہے اس میں انسان کی ذاتی ملکیتیں کچھ بھی کام نہیں آتیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا پیسہ ہمیں بربادی سے بچالے گا اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر لگا کر تباہی کو خود اپنے گھر کی راہ دکھاتے ہیں۔ (سورہ الیل۔ آیت 9-8، سورہ المائدہ۔ آیت 36، سورہ النساء۔ آیت 37)

یا درکھو تم جو بھی نوع انسانی کے اجتماعی مفاد کے لیے دیتے ہو، اس سے تمہاری اپنی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائیگی (سورہ الیل۔آیت 18)۔ جسمانی نشوونما بھی اور ذات کی نشوونما بھی جو کہ درحقیقت زندگی کا اصلی مقصد بھی ہے۔ انسان موجودہ زندگی کی سطح پر اللہ کے قوانین پر زیادہ سے زیادہ عمل پیرا ہونے کے لیے جتنی بھی کوششیں کرتا ہے، اس سے اس کی ذات کی جو نشوونما ہوتی ہے، اسے ہی درحقیقت ''قرب خداوندی'' کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے انسان میں بشریت کی حد تک اللہ تعالیٰ کی صفات کی جھلک پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ قربِ خداوندی کبھی بھی مال و دولت جمع کرنے سے نہیں بلکہ مال و دولت کو خدا کی راہ میں دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ (سورہ النور۔آیت 37)۔ اس میں اگر چہ کوئی شک نہیں کہ اولاد اور بیوی کی طرح مال و دولت بھی انسان کے لیے کشش کا باعث ہے (سورہ آل عمران۔آیت 13) لیکن اگر بیوی بچوں یا مال و دولت کی محبت انسانیت کے اجتماعی مفاد پر غالب آجائے تو یہی مال و دولت اور بیوی بچے انسان کے لیے فتنہ بن جاتے ہیں (سورہ التغابن۔آیت 15)۔ یہی انفرادی مفاد پرستی کہلاتی ہے۔ اور اسی سے دور رہنے کو اللہ تعالیٰ کہتا ہے تا کہ انسان کو فلاح نصیب ہو۔ (سورہ التغابن۔آیات 16تا18)۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ انفرادی مال و دولت جمع کر کے وہ خود کفیل ہو گیا ہے، اسے معاشرہ یا ریاست کے تعاون کی کوئی ضرورت نہیں تو اس کی غلط فہمی ہے۔ یہ سوچ اس کی بالآخر تباہی کا باعث بنتی ہے۔ (سورہ العلق۔آیات 7 تا 8، سورہ الیل۔آیات 10تا11)

سائل ومحروم کا حق

پہلی سٹیج میں ضرورت مندوں اور محروموں کی امداد کے لیے صرف اپیل ہی کی گئی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے اور تم انہیں بطور امداد کچھ دو۔ لیکن اب اس سٹیج میں قرآن نے حکم دیا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورتمندوں کا حق ہے۔ یعنی معاشرہ کے ضرورتمند اور محروم افراد تمہاری کمائی سے اپنے حق کے طور پر تم سے فاضل مال طلب کر سکتے ہیں۔ اگر تم خود ان کو یہ حق ادا نہ کر سکے تو پھر ریاست تم سے لے کر انہیں دلوائے گی۔ (سورہ المعارج۔آیات 24 تا 25، سورہ الذاریات۔آیت 19)

قارئین آپ نے دیکھا کہ اس دوسری سٹیج میں آ کر صدقات اب ''خیرات'' نہیں رہے بلکہ ''حق'' بن گئے ہیں۔ چونکہ عام مشاہدہ ہے کہ خیرات لینے والا خود شرمندگی اور ذلت محسوس کرتا ہے اور دینے والا احساس برتری سے مامور ہوتا ہے اور اس کے دل میں یہ احساس ابھرتا ہے کہ میں اس پر احسان کر رہا ہوں۔ وہ جتنا زیادہ دیتا ہے، اسکی گردن اتنی ہی اکڑتی جاتی ہے

اور لینے والا ذلیل ترین شخص بن کر رہ جاتا ہے۔لیکن جو چیز بطور حق وصول کی جائیگی،اس میں نہ تو لینے والے کے دل میں احساس کمتری (Inferiority Complex) پیدا ہوگا اور نہ ہی دینے والا اپنے دل میں کوئی احساس برتری پیدا کر سکے گا(Superiority Complex)۔

مال غنیمت سے متعلق اصلاحی قوانین

خطہ عرب میں مال غنیمت ایک بہت بڑا ذریعہ آمدن تھا اور وہاں معاشرتی رواج یہ تھا کہ جنگ میں دشمن کے مال میں سے جو بھی کوئی لوٹ لے،اسی کا ہوگیا۔قرآن نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مال غنیمت انفرادی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ اسے ریاستی مرکز کے پاس جمع کروانا ہوگا۔(سورہ انفال۔آیت 41)۔اس تبدیلی سے نہ صرف یہ کہ ذریعہ آمدن کی حیثیت اجتماعی ہوگئی بلکہ جنگوں کا جذبہ محرکہ (Incentive) بھی یکسر تبدیل ہوگیا۔پہلے جنگوں میں شرکت کا جذبہ محرکہ لوٹ مار کا مال حاصل کرنا ہوتا تھا۔جس کے ہاتھ جو آئے،لے اڑے۔مگر اب جنگ وجدل کا جذبہ حقوق انسانیت کی حفاظت اور نگہداشت قرار پا گیا۔یہی وہ جذبہ ہے جسے قرآن ''قتال فی سبیل اللہ'' کا نام دیتا ہے۔یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔ایک نکتہ ذہن میں رکھیے۔جو کچھ انسانیت کے اجتماعی مفاد کے لیے کیا جاتا ہے،اسے قرآن کریم کی رو سے ''فی سبیل اللہ'' یعنی اللہ کی راہ میں کہا جاتا ہے۔

ارتکازِ دولت

دولت کے لفظی معنی گردش کرنے کے ہیں۔یہ مقصد دولت صرف اسی صورت پورا کر سکتی ہے جب یہ خود گردش میں رہے۔لیکن انسان کی انفرادی حرص اور زر پرستی اسے گردش میں رکھنے کی بجائے روک لیتی ہے۔اس سے معاشرہ کی معاشیات کا دھڑن تختہ ہو کر رہ جاتا ہے۔معاشرہ پر بھوک وافلاس کا عذاب طاری ہو جاتا ہے۔قرآن نے انتہائی سخت ترین الفاظ میں دولت کو روک کر رکھنے کو ایک سنگین ترین جرم قرار دیا ہے جس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے افراد دونوں بری طرح جھلستے اور جلتے ہیں (سورہ التوبہ۔آیت 35-34)۔یہ شعلے انسان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں (سورہ البقرہ آیت 7)۔اس آگ سے یہ لاکھ بچنا چاہیں،مگر یہ انہیں آوازیں دے کر بلاتی ہے اور آتش فشانی لاوے کی مانند ان کا سب کچھ تباہ وبرباد کر ڈالتی ہے۔(سورہ المعارج۔آیات 18-15)

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلہ میں اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کا مفہوم یہ نہیں کہ یہ اوپر کے طبقہ میں ہی گردش

کرتی رہے۔ بلکہ اسے پورے معاشرہ کی رگ رگ میں یوں گردش دی جائے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے (سورہ الحشر۔آیت 7)۔اور یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ خون جب تک گردش میں رہتا ہے،تب تک جسم میں زندگی موجود ہوتی ہے، جونہی خون کی گردش دل نے روک لی، نتیجہ فوری موت۔ پس اسی مثال سے آپ اندازہ کر لیں کہ ایک معاشرہ کی زندگی کے لیے سب افراد معاشرہ تک دولت کی گردش کس قدر ضروری ہے۔

الرباء: قرآنی نظام کے خلاف ایک جنگ

ارتکازِ دولت کے خلاف اس قسم کی تنبیہات کے بعد قرآن نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے اور اسے روک رکھنے کے مقصد اور جذبہ کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا گیا۔ پیسہ ضروریات زندگی کی خرید وفروخت کا ذریعہ ہے لیکن یہ بذاتِ خود کچھ پیدا نہیں کرتا۔آپ ایک ہزار روپے کے ایک نوٹ کو کسی الماری یا لاکر میں دس سال کے لیے رکھ دیں تو وہ دس برس بعد بھی ایک ہزار ہی رہے گا،اس میں اضافہ نہیں ہوگا۔اگر روپے کی حیثیت یہ ہو کہ وہ جب تک بھی پڑا رہے،اس میں کوئی اضافہ نہ ہو تو ظاہری بات ہے کہ روپیہ جمع کرنا بے وقوفی ہوگی۔لیکن وہی ہزار روپیہ اگر آپ کسی محتاج کو سود پر دیں تو وہ روپیہ بوقت واپسی اپنے ساتھ کچھ مزید روپے بھی لے آئے گا۔وہ روپیہ جو محنت سے نہیں بلکہ صرف روپوں سے پیدا ہو،قرآن اس روپے کو ''الرباء'' کہہ کر پکارتا ہے۔قرآن نے ربا کے متعلق واضح طور پر احکامات دے دیے ہیں کہ یہ حرام اور سنگین ترین جرم ہے۔ایسا جرم جسے قرانی ریاست کے مدمقابل ایک بغاوت سے تشبیح دی گئی ہے اور کہہ دیا گیا ہے کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ وہ باز آجائیں۔اگر وہ باز نہیں آتے تو پھر ہماری جانب سے اعلانِ جنگ سمجھیں۔(سورہ البقرہ۔آیت 275-276)

قرآن کہتا ہے کہ رباء سے تمہاری دولت میں بلاشبہ اضافہ ہوتا ہے مگر ایسے معاشی نظام اس قدر خطرناک ہیں کہ اس سے معاشرہ کی اجتماعی دولت میں بے حد کمی واقع ہوجاتی ہے۔ایک طبقہ دوسروں کی محنت پر پلنے لگ جاتا ہے،ان کے آؤٹ پٹ پر قابض ہوکر خود اپنی قوتِ عمل سے محروم اور انسانی اقدار سے عاری ہوجاتا ہے۔جبکہ دوسرا طبقہ اپنی محنت کی کمائی سے محروم ہوکر مفلس وقلاش ہوجاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت وانتقام کی آگ پہلے سلگتی ہے،اور پھر آخر کار بھڑک اٹھتی ہے۔(سورہ آل عمران۔آیات 120تا129)

یہاں ایک بات واضح رہے کہ قرآن نے صرف یہ نہیں کہا کہ کسی ضرورتمند کو کچھ روپیہ دے کر جو اس سے زائد لیا جائے،وہی

رباء ہے۔ بلکہ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جو بھی روپیہ تم دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کرلو کہ اس میں تمہیں کچھ زائد مل جائیگا، وہی ''رباء'' ہے۔ (سورہ الروم۔آیت 39)۔ اسے دور حاضر کی اصطلاح میں کاروباری سود (Commercial Interest) کہا جاتا ہے۔ نیز اس کیٹیگری میں مضاربت (Sleeping Partnership) اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ پر دینا) وغیرہ سب آجاتے ہیں۔

جیسا کہ مضمون کے اولین حصہ میں صراحت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بنیادی اصول بیان کیا ہے کہ ''لیس للانسان الا ما سعیٰ'' (سورہ النجم آیت 39) یعنی معاوضہ صرف محنت کا ہی جائز ہے، سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ رباء ہے خواہ اس کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو۔ اور رباء کو حرام قرار دے کر قرآن نے پیسہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔

اراضی کے متعلق اگلا قدم

زمین کے مسئلہ کو ہمارے ہاں سرمایہ داری عناصر نے جان بوجھ کر پیچیدہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی اتنا بڑا معمہ نہیں جسے سمجھا نہ جاسکے۔ زمین کے متعلق کچھ وضاحت کتابِ ھذا کے پہلے حصہ میں بھی کی گئی، مزید بھی کر دی جائے کہ اللہ نے قرآن میں خود کو ''الحی'' کہنے کے ساتھ ساتھ خود کو ''القیوم'' بھی کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی زندگی دینے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے زمین پر زندگی پیدا کی تو اس کے لیے جس قدر بھی سامانِ رزق اور اسباب کی ضرورت تھی، وہ بھی ساتھ ہی یہاں عطا کر دیے۔ زندگی کے باقی رہنے کے لیے ہوا، پانی، آگ، روشنی، حرارت اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس یہ سب کچھ انسان کی دنیا میں آمد سے پہلے ہی یہاں اللہ نے پھیلا دیں۔ ہوا، پانی، روشنی، حرارت تو عموماً زمین کی سطح پر موجود رہتے ہیں۔ البتہ خوراک سے متعلق اللہ نے فرمایا کہ وہ ذخائر زمین میں چھپا کر رکھ دئے گئے ہیں، انسان انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نکالتا جائے (سورہ الحجر۔آیت 21)۔ مزید فرمایا کہ:

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (سورہ الحجر۔آیت 20)

ہم نے تمہارے لیے سامانِ معیشت رکھا ہے، اور ان کے لیے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو۔

غور فرمائیں یہاں لفظ ''معیشت'' کا لفظ اللہ نے زمین کی پیداوار کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ

كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ (سورہ طٰہٰ۔آیت 54)

دوسری جگہ اس نے کہا ہے کہ:

مَتَاعاً لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (سورہ عبس۔آیت 32،سورہ النازعٰت۔آیت 33)

زمین اور اس پر ذرائع پیداوار انسان کی پیدائش سے پہلے ہی موجود تھے۔اب آپ خود سوچیں کہ کیا دنیا کے کسی بھی قانون یا ضابطہ کی رو سے کوئی شخص ان وسائل زندگی (روشنی،حرارت،پانی،ہوا،زمین)وغیرہ میں سے کسی کا انفرادی طور پر مالک قرار پا سکتا ہے جو تمام نوع انسانی کے لیے مشترکہ طور پر وجہ زندگی ہوں؟ آپ اپنے گھر یا جائیداد کے بارے میں پیچھے تک مڑ کر دیکھیں کہ وہ آپ تک کن ذرائع سے پہنچی تھی،ہر ذریعہ میں انسانوں کا نام آئیگا،کہ آپ کے باپ نے آپ کو دی،آپ کے باپ کو آپ کے دادا نے دی،انہیں ان کے باپ نے۔۔۔۔اور پھر اس شخص تک پہنچیں جس نے پہلی مرتبہ اس خطہ زمین کو اپنی ملکیت کہا تھا۔اس سے پوچھیں کہ اس نے اسے کس سے خریدا تھا؟ ظاہری بات ہے کہ آپ کی وہ زمین اس مقام پر جا کر ''چوری کی'' ثابت ہو جائیگی۔کہ اسے دھونس دھاندلی سے اپنی بنایا گیا تھا۔اب جو چیز شروع دن سے ہی ''چوری کی'' چلی آ رہی ہے یا کسی دھونس کے ذریعے مقبوضہ قرار دی گئی ہے،اس پر بعد والوں کا قبضہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

ذرائع پیداوار میں سے کسی ایک پر سانپ بن کر بیٹھ جانا نوعِ انسانی کے خلاف سنگین ترین جرم ہے جس کا تصور باطل قرار دینے کے لیے قرآن نے بہت مضبوط اور نا قابل تردید دلائل دیے ہیں،جو ہم مضمون کے آغاز سے ہی پڑھتے بھی آ رہے ہیں۔اور اسی وجہ سے اس زمین پر اللہ نے انسان کے لیے معاوضہ صرف اور صرف اس کی محنت کا ہی جائز قرار دیا ہے۔جو وہ پیداوارِ رزق اور زمین سے خوراک نکالنے کے لیے کرتا ہے۔اس سے زیادہ انسان کے لیے کچھ بھی جائز نہیں۔زمین پر انسان یہ جو بھی کرتا ہے،اس میں انسان کی صرف محنت ہوتی ہے،اور ذرائع پیداوار اللہ کے۔پس اللہ کہتا ہے کہ تم انسان اپنی محنت کا معاوضہ خود رکھے اور اللہ کے ذرائع پیداوار کا حصہ اسے دے۔وہ یہ حصہ بھوکوں اور محروموں کے لیے رکھے ہوئے ہے۔ومتاعاً للمقوین۔ان تک پہنچ گیا تو سمجھو اللہ کو مل گیا۔محنت کے معاوضہ سے متعلق پیچھے بہت تفصیلی گفتگو کر آیا ہوں۔فی الحال آگے بڑھیے۔

زمین کی حد بندی کے سلسلہ میں اس دوسری سٹیج پر کیے جانیوالے اقدامات:

قرآن نے زمین کے بارے میں جو حقائق بیان کیے تھے،ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا اور جو لوگ دورِ رسالت میں چالاکی سے بہت زیادہ اراضی کے مالک بنے بیٹھے تھے،ان کی ملکیتوں کی حد بندی شروع کر دی۔اس کام

کے لیے اس وقت معیار یہ تھا کہ ہر شخص کے پاس صرف اسی قدر خطہ زمین رہے گا جس کی پیداوار اس کے بال بچوں کی پرورش کے لیے کافی ہو۔ یوں زمین پر انفرادی ملکیت ختم کرنے کے پروگرام کی ابتدا کر دی گئی۔

سورہ الرعد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کے لیے میں نے اپنی ساری عمر صرف کر دی ہے، کیا وہ مجھے اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب ہوگا یا نہیں؟ تو اللہ نے جواب میں فرمایا کہ تم اس کی فکر مت کرو، اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ اس کی تکمیل تمہاری زندگی میں چاہے ہو یا نہ ہو، تمہارے ذمہ اس پیغام کو آگے پہنچانا ہے۔ اور یہ انقلاب ایک روز واقع ہو کر رہے گا۔ چاہے ایسا تمہاری زندگی میں ہو یا تمہاری وفات کے بعد۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ:

''ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ (ان پر ان کی ملکیت ختم ہوگی) اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔

سورہ الانبیاء میں بتایا گیا کہ انہیں اور ان کے اسلاف کو یہ زمین سامانِ زندگی حاصل کرنے کے لیے ملی تھی۔ لیکن جب کچھ عرصہ گزر گیا تو وہ اس پر غاصب ہو کر بیٹھ گئے۔ اب ہم رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے زمین کو نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے (سورہ الانبیاء۔ آیت 44)

پس یہ وہ دوسری سٹیج تھی جہاں قرآنی ریاست کے قرآنی نظام معاشرہ کے اجتماعی عملی قیام کی ابتداء کر دی گئی۔ اب ہم تیسری اور آخری سٹیج کی جانب بڑھتے ہیں۔

تیسری سٹیج: قرآنی مشن کی تکمیل

اب قرآنی ریاست کے قیام کی تیسری اور آخری منزل آ گئی ہے۔ اسلامی ریاست وجود میں آ چکی ہے اور اللہ نے تمام جہانوں کو پالنے (تمام افراد کو سامانِ نشوونما و رزق دینے) کی جو ذمہ داری اپنے سر لی تھی، اور جسے اس نے اسی قرآنی ریاست کے ذریعے اہل زمین پر پورا کرنا تھا، وہی اس ریاست کے قیام کی وجہ تھی۔ وہی اصل جواز تھا۔ چنانچہ سورہ حج میں فرمایا کہ:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (سورہ الحج۔ آیت 44)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔

اس آیت میں ایک قرآنی ریاست کی بنیادی اور اہم ترین ذمہ داری اور اس کے قیام کی غرض و غایت کو دو لفظی واضح موقت میں بیان کر رہی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ حصہ جات میں بھی بتایا گیا کہ قرآنی ریاست کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد مملکت میں ایسا نظام نافذ کرنا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محکومیت (کتاب اللہ کے قوانین کے نفاذ سے) عملی طور پر اختیار کی جاتی ہے۔ اور صلوٰۃ میں قرآنی قوانین کو اپنی زندگیوں پر محیط کرتے ہوئے تمام افرادِ معاشرہ کا وہ تمام ذمہ داریاں سرانجام دینا جو قرآنی ریاست کے شہری ہونے کی وجہ سے ان پر عائد کی جاتی ہیں، بھی شامل ہے۔ جس کے ذریعے ہر شخص اپنے اپنے فرائض منصبی کمال لگن اور تندہی سے سرانجام دیتا ہے اور یوں مملکت کی مضبوطی کا باعث بنتا ہے۔ دوسری جانب ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں ''زکوٰۃ دینا''۔ قرآن کے مطابق قرآنی ریاست کی ذمہ داری زکوٰۃ دینا ہے۔ ذرا غور فرمائیں نکتہ بڑا توجہ طلب ہے۔

ہمارے ہاں زکوٰۃ سے عموماً مراد لی جاتی ہے وہ خاص رقم جو ایک مالدار آدمی ایک خاص شرح کے مطابق اپنی دولت سے نکالتا ہے۔ اور حکومت کا فرض ہمارے ہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کر کے اسے متعین مصارف (حقداران) پر صرف کرتی ہے۔ یعنی ہمارے ہاں رائج مفہوم کے مطابق حکومت کا فرض لوگوں سے زکوٰۃ اکٹھی کرنا ہے۔ لیکن قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ''زکوٰۃ دینا'' ہے۔ لینا نہیں۔ دراصل معاملہ یوں ہے کہ زکوٰۃ کا یہ مفہوم قرآن میں کہیں بھی نہیں آیا کہ ایک مالدار آدمی اپنے مال کے ایک سال تک پڑا رہنے کے بعد اس میں سے ایک خاص شرح کے مطابق کچھ رقم نکالے۔ قرآن میں تو زکوٰۃ کے مصارف تک کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں ''زکوٰۃ کے مصارف'' بیان کیے جاتے ہیں، یہ تو دراصل صدقات کے مصارف ہیں، نہ کہ زکوٰۃ کے۔ (سورہ التوبہ۔ آیت 60)۔ اس بات کی وضاحت گزشتہ سطور میں کی جا چکی ہے۔

دراصل زکوٰۃ کا مطلب ہے ''پھلنا پھولنا، نشوونما پانا''۔ اس حساب سے قرآنی اصطلاح ''ایتائے زکوٰۃ'' کے معنی ہیں سامانِ نشوونما (رزق وضروریاتِ زندگی) فراہم کرنا۔ اب آپ کو بات شاید سمجھ آ گئی ہوگی۔ کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ نوع انسانی کی نشوونما کا سامان ہر کسی کو بلاتفریق و امتیاز بہم پہنچائے۔ اور یوں ربوبیت عالم اور رزاقیت کا جو ذمہ اللہ نے قرآن

میں اپنے سر لیا ہے، اسے پورا کرے۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ قرآنی ریاست مومنین کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو اللہ سے ایک خاص معاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (سورہ التوبہ۔آیت 111)

یعنی اس قرآنی معاشرہ کا رکن بننے والا اپنی جان و مال اللہ کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا کرتا ہے۔ میں پیچھے اسی عنوان کے تحت بتا چکا ہوں کہ یہ معاہدہ دراصل قرآنی ریاست کے ساتھ طے پاتا ہے۔ یوں ایک مومن شہری کی جان و مال انفرادی ملکیت کی بجائے قرآنی ریاست کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اسے اس دنیا میں بھی پرآسائش جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت جس کا وعدہ اللہ نے قرآن میں متعدد مقامات پر کر رکھا ہے۔ پس قرآنی نظام میں مال پر انفرادی ملکیت کسی کی نہیں رہتی۔ وہ ''اللہ کا مال'' ہو جاتا ہے۔ (سورہ النور۔آیت 33)

قرآنی نظام کا حتمی حکم: قل العفو

مندرجہ بالا تمام منازل طے کرنے کے بعد اب قرآنی ریاست ایک ایسی پوزیشن میں پہنچ چکی ہے کہ یہاں بالآخر قرآن وہ فیصلہ سناتا ہے جس سے مسئلہِ ملکیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہے؟ سنیے:

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (سورہ البقرہ۔آیت 219)

(اے رسول) وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی اپنی کمائی میں ان کا کیا حق ہے اور دوسروں کا کتنا؟ (یعنی کیا انفاق کریں؟) کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ قرآنی ریاست کی تحویل میں جائیگا جو تم سب کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ حتیٰ کہ اگر کبھی ایسا موقعہ آ جائے کہ دوسرے کی ضرورت تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو تم اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دو (سورہ الحشر۔آیت 9)

یہ تھا ایک اصولی حکم جو قرآنی ریاست کے قیام کے اس مرحلہ پر جماعتِ مومنین کو دے دیا گیا۔ کہ زائد از ضرورت (عفو)

مال دوسرے ضرورتمندوں کے لیے دیا جائے۔لیکن اس اصولی حکم کے علاوہ خود قرآنی حکومت سے کہا گیا کہ وہ زائد از ضرورت مال خود وصول کر کے اسے مناسب مقامات پر حسبِ ضرورت خرچ کرے۔سنئے:

"خذ العفو"۔(سورہ الاعراف۔آیت 199)

فتح الباری شرح بخاری میں حافظ ابن حجر عسقلانی اس حکم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"بعض علماء نے اس کے معنی "خز من عفا لك من اموالهم اى ما فضل" کیے ہیں،یعنی وہ مال جو ضرورت سے زائد ہو، لے لو۔اور یہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل کا حکم ہے۔" (فتح الباری شرح بخاری۔جلد 8،صفحہ 305)

بعض علماء کرام نے اس کا مطلب "درگزر کرنا" بھی کیا ہے،لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔کیونکہ لفظ "خذ" کا لغوی معنی ہی لینا،وصول کرنا(To receive) ہے۔جیسے سورہ حشر آیت 7 میں حکم ہے کہ "وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوه"۔اسے درگزر کے مفہوم میں لینا غلط ہے۔یہ مادی طور پر کچھ لینے کے معانی میں آئے گا۔

اسی حکم کی تقویت کے طور پر یہی حقیقت سورہ انفال میں ان الفاظ میں بیان کی گئی کہ:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ (سورہ الانفال۔آیت 1)

اے رسول وہ تجھ سے زائد از ضرورت مال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ان سے کہہ دو کہ اسے "اللہ و رسول "(مرکزی اتھارٹی) کی تحویل میں رہنا چاہیے۔

ہمارے ہاں عموماً انفال کا ترجمہ مترجمین "مالِ غنیمت" کرتے ہیں،یہ بالکل غلط ہے۔کیونکہ اول تو اللہ نے اموال غنیمت کے لیے قرآن میں "غنم،غنائم" وغیرہ جیسے الفاظ الگ الگ استعمال کیے ہیں۔دوسری بات یہ کہ مال غنیمت کے متعلق تو کہا گیا ہے کہ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ و رسول (قرآنی ریاست) کے لیے ہوگا اور باقی 4/5 حصہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائیگا(سورہ الانفال۔آیت 41)۔آیت میں "غنمتم" کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انفال اور غنائم دو مختلف اصطلاحات ہیں۔لہٰذا انفال کو مال غنیمت کہنا غلط ہے۔لفظ "انفال" نفل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں زائد۔جیسے ہمارے ہاں نمازوں میں فرائض کے بعد نوافل ادا کیے جاتے ہیں۔

مفہوم کے اعتبار سے اس کی مختلف اقسام ہو سکتی ہیں مثلاً:

(1) ہمارے ہاں انکم ٹیکس حکومت کے واجبات میں سے ہوتا ہے۔یعنی وہ ٹیکس جس کی ادائیگی واجب ہے۔اگر کوئی شخص انکم

ٹیکس کے علاوہ ضروری امور کے لیے حکومت کو کچھ عطیہ دیتا ہے تو یہ ''انفال'' کی کیٹیگری میں داخل ہوگا۔یعنی واجبات سے زائد۔اسی کو صدقات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

(2) انتظامی نکتہ نگاہ سے مرکزی حکومت مقامی حکومتوں کو اجازت دے کہ وہ اس قسم کی آمدنی از خود وصول کر کے اس میں سے اپنے اخراجات پورے کیا کریں۔اگر ایسا ہو کہ بعض اوقات کسی جگہ اخراجات پورے ہونے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جائے تو یہ انفال (زئد از ضرورت) ہوگا۔اسے پھر ریاستی مرکز کی جانب منتقل کر دیا جائیگا۔

(3) تیسری قسم ''العفو'' ہے۔یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد افرادِ ملت کے پاس کچھ بچ رہے۔فرمایا کہ یہ زائد از ضرورت مال حکومت کی تحویل میں جانا چاہیے۔

اب ظاہر ہے کہ جب زائد از ضرورت مال کسی کے پاس ہی نہیں رہے گا تو نہ تو ارتکازِ دولت کی کوئی گنجائش نکلے گی نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا ہوگا۔ویسے بھی یہ بات لوجیکل ہے کہ جب ہر شخص اور اس کے کنبے کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری قرآنی ریاست نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے تو پھر دولت کس لیے جمع کی جائیگی؟ یہی بنیادی وجہ ہے جو قرآن میں دولت جمع کرنے کے خلاف سخت تاکیدی اور وعیدی احکامات دئے گئے ہیں۔

مسئلہِ زمین

جیسا کہ اب تک کی گفتگو یہ امر واضح کر چکی ہے کہ قرآن کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔یہ تمام افرادِ انسانیت کے لیے یکساں طور پر سامانِ رزق کا ذریعہ بن کر کھلی رہے گی۔(سورہ الرحمٰن۔آیات 11 تا 12)۔اس لیے اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ یہ ذریعہ رزق تمام ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کھلا رہے۔''سواء للسائلین''(سورہ حٰم السجدہ۔آیت 10)۔یہ تمام بنی نوع انسان کے لیے رب کی جانب سے ایک عطیہ ہے۔

وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 20)

جو چیز تمام انسانوں کے لیے بطور عطیہ دی گئی ہو،اس پر کسی کو بھی حد بندیاں لگا کر ملکیت جتانے کا حق حاصل نہیں۔رزق کے ان سرچشموں کو آبِ رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیے۔تاکہ ہر ضرورتمند اپنی ضرورت بلا روک ٹوک پوری کر سکے، جو لوگ ان پر بند باندھ کر روک ٹوک کرتے ہیں،وہ ایسے لوگ ہیں جو لاکھ دیندار کہلائیں،وہ دین کی عملی تکذیب کر رہے ہیں۔ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے منہ پر دے ماری جائیں گی جنہیں یہ صلوٰۃ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔قرآن نے نہایت فکر انگیز انداز میں اس

صورتحال کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ

کیا تم نے ایسے شخص کی حالت پر غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟

فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ

یہ وہ شخص ہے جو یتیم اور بے سہارا شخص کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے، اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ

اگر یہ سمجھتا ہے کہ جو نماز (یا دیگر ''عبادات'') میں کر لیتا ہوں، وہی صلوٰۃ ہے اور اس سے میری دینی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس کی نمازیں اس کے لیے تباہی و بربادی کا باعث ہیں۔ ان کا انجام بہت ہی برا ہے جنہیں پتا ہی نہیں کہ صلوٰۃ ہوتی کیا ہے۔ یہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں۔

آیت میں وعید کا نشانہ بنائے جانے والے افراد ''مصلین'' کا ذکر بہت توجہ طلب اور معنی خیز ہے۔ عموماً اس سے مراد نمازیں نہ پڑھنے والے افراد لیے جاتے ہیں۔ روایتی ترجمہ بھی یوں کیا جاتا ہے کہ ''تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔ یعنی پڑھتے ہی نہیں''۔

لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔ نمازیں نہ پڑھنے والوں کو تو ''مصلین'' کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ اصطلاح انہی کے لیے استعمال ہوتی ہے جو نمازیں پڑھتے ہیں، صلوٰۃ پر عمل درآمد کرنے والے کو ہی مصلی کہا جا سکتا ہے۔ پس جب ''مصلین'' ہی کے لیے اللہ نے تباہی کی وعید سنا دی تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہی کہ یہ جو رسمی پرستش کے طور پر پانچ وقت ظاہری سجدہ دے آتے ہیں، انکی یہ نماز قرآنی صلوٰۃ نہیں۔ کیونکہ یہ سجدہ، یہ جھکنا، یہ خشوع و خضوع صرف مسجد کی چار دیواری کی حد تک محدود ہے، جبکہ عملی زندگی ان کی صلوٰۃ سے بالکل الٹ ہے۔ اب یہ جو اپنی عملی معاشی زندگی میں معاشرہ کا استحصال کرتے ہیں، سرمایہ داریت قائم رکھے ہوئے ہیں، اور ساتھ پانچ نمازیں بھی دکھاوے کے طور پر یا غلط فہمی میں ''صلوٰۃ'' سمجھ کر پڑھ رہے ہیں، تباہی و بربادی بالآخر ان لوگوں کا مقدر ہے۔

الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ

ایسا نمازی سمجھتا ہے کہ نماز کے ظاہری اراکین اور محسوس حالتوں کی پانچ وقت مسجد جا کر ادائیگی ہی اصلی صلوٰۃ ہے۔اور وہ انہیں ادا کرتا جاتا ہے۔ایک طرف دکھاوے کی یہ جعلی عبادت کرتا ہے

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (سورہ الماعون۔مکمل)

اور دوسری جانب رزق کے سرچشموں پر بند باندھ کر بیٹھ جاتا ہے۔کہ اس سے دوسرے لوگوں کو سامانِ رزق میسر نہ آسکے۔

یہ تکذیب دین نہیں تو اور کیا ہے؟

مسئلہ ملکیتِ زمین اور قوم ثمود کا واقعہ

اللہ نے اس زمین کی پوزیشن کو قوم ثمود کی تاریخی شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی مشکل ہی نہ رہی۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کا معاشی دارومدار زیادہ تر مویشی پالنے پر تھا۔ان کے قرب و جوار میں ہری بھری چراگاہیں اور پانی کے چشمے اور ندیاں تھیں مگر قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا۔جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزور اور لاچار افراد کے مویشی بھوکے پیاسے رہ جاتے تھے۔ان لوگوں کی جانب حضرت صالحؑ پیغمبر نازل ہوئے۔انہوں نے قوم کے سرداروں کے اس ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کی۔سرداروں نے حضرت صالح سے پوچھا کہ آپ کا مطالبہ آخر ہے کیا؟انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ:

هَـٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ

فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (سورہ اعراف۔آیت 73)

یہ زمین اللہ کی ہے، نہ تمہاری نہ میری۔اور یہ مویشی (اونٹنی) بھی اسی اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔اس لیے ان کو آزادی ہونی چاہیے کہ یہ اللہ کی زمین سے جہاں سے چاہیں چریں۔تمہیں کس نے حق دیا کہ تم ارض اللہ (اللہ کی زمین) پر یوں اپنی حد بندیاں قائم کرو کہ اس کی مخلوق تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جا سکے۔

ان سرداروں نے پوچھا کہ اب پھر کیا کیا جائے؟ حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھاؤ۔بہت آسان ہے۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا (سورہ الشمس۔آیت 13)

قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ (سورہ الشوریٰ۔آیت 155)

تم جانوروں کی باریاں مقرر کر دو۔ ہر کسی کا جانور بلا امتیاز وہاں سے اپنی اپنی باری پر پانی پی سکے۔

باریاں مقرر کرنے کا معنی ہی یہ ہے کہ یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں۔اس سے سب یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ایسا ہی واقعہ حضرت موسیٰ کے ساتھ مدین میں پیش آیا تھا جہاں علاقے کے بڑے سرداروں کے مویشیوں کے چرواہے کمزور اور بے بس لڑکیوں کے جانوروں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔(سورہ القصص۔آیت 23)

مندرجہ بالا مثال سے آپ نے غور فرمایا کہ ''ارض للہ'' کا کیا مطلب ہے؟ یہ کوئی محض تصوراتی یا نظری عقیدہ نہیں، یہ قرآن کے معاشی نظام کی وہ بنیاد ہے جو نظر بھی آتی ہے۔کہ زمین تمام نوع انسانی کے لیے ذریعہ معاش ہے۔اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔اس کی پیداوار پر کوئی فرد واحد یا گروہ قابض نہیں ہوسکتا۔

''ارض للہ'' پر محض ذہنی ایمان رکھنا اور عملی طور پر زمینوں کو اپنے انفرادی قبضہ میں لیتے جانا قرآن کی رو سے شرک اور تکذیبِ دین ہے۔

یہاں اس نکتہ کا سمجھنا بھی ضروری ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت صنعتی نظام وجود میں نہیں آیا تھا۔اس لیے قرآن نے صرف ''الارض'' سے متعلق ہی احکامات دیے ہیں۔لیکن انہی احکامات کی روشنی میں صنعتی نظام کے متعلق بھی یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی، وہ بھی مملکت کی ہی تحویل میں رہیں گی۔ کیونکہ صنعتیں بہر حال الارض (زمین) ہی پر لگائی جاتی ہیں۔

پھر یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ چونکہ وہ دور صنعتی نہیں تھا، مگر پھر بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں بعض ایسی ہدایات ملتی ہیں جن سے مزدور اور مالک کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک روایت میں ارشادِ گرامی ہے کہ:

''مزدور کو اس کی محنت کی پیداوار میں سے بھی حصہ دو۔ کیونکہ ''خدا کے عامل'' کو محروم و نامراد نہیں رہنا چاہیے'' (مسند احمد)

مزدوروں کا اندازِ زندگی کیا ہونا چاہیے، اس کا اندازہ بخاری شریف کی ایک روایت سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں فرمایا کہ:

''وہ (مزدور) تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے ماتحت کیا ہے۔پس جس کے ماتحت اللہ نے اس کے کسی بھائی کو کیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ جو خود کھائے، وہی اس کو کھلائے، جو خود پہنے، وہی اس کو پہنائے۔اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو، وہ اس کے سپرد نہ کرے، اور اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو تو پھر اس کی تکمیل میں اس کی مدد بھی کرے۔''

ان ارشاداتِ گرامی سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ مزدور کو صرف اجرت ہی نہیں ملنی چاہیے بلکہ پیداوار کے منافع میں بھی اس کا

حصہ ہونا چاہیے اور اجرت مقرر کرنے کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس سے ایسا ہی کھانا کھا سکے جیسا اس کی فیکٹری کا مالک کھاتا ہے۔اور بقیہ ضروریاتِ زندگی بھی ویسے ہی پوری کر سکے جیسے مالک کرتا ہے۔

ایک اعتراض: کیا سارے وسائل پیداوار کی مالک بن کر ریاست ظالم و جابر نہ ہو جائے گی؟

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب پیداوار کے تمام وسائل افراد کے پاس رہنے کی بجائے ریاست کی تحویل میں چلے جائیں گے اور کسی کے پاس ضرورت سے زائد پیسہ نہ رہے گا تو پھر تو ریاست ایسی ظالم و جابر بن جائیگی کہ جب جی چاہے افراد کا گلا گھونٹ دے۔انہیں بلیک میل کرنے لگ جائے۔پھر اس سے بدتر نظام اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ اعتراض اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم قرآنی معاشرہ اور اس کے اراکین کو موجودہ دور کے پیمانوں سے جانچنے لگتے ہیں۔قرآنی نظام کے قیام کے سلسلہ میں ایک نکتہ ہمیشہ یاد رکھا جائے کہ یہ وہ دور ہوگا جب کہ افراد ملت کے ذہن و قلب میں بھی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہونگی جن کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہونا ہے۔یہ سوال صرف ہماری موجودہ سوچ کی پیداوار ہے جہاں نہ ہمارا ذہن قرآنی ہے نہ ماحول قرآنی۔اور ہمارے دل میں یہ خدشات جنم لینے لگتے ہیں کہ شاید وہاں لوگ ایسا رویہ بھی دکھا سکتے ہے جو ہماری موجودہ معاشرت اور سرمایہ داریت میں لوگوں کی فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔ایسی بات نہیں۔

بیشک عام ریاستوں میں ایسا ہونا ممکن ہے،لیکن قرآن کی عملداری کی غرض سے وجود میں آنیوالی قرآنی ریاست کے قیام کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی نہ صرف طبعی نشوونما اور پرورش کا انتظام کرے بلکہ ان کی ذات اور انفرادیت کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچائے۔

اس ریاست کے شہریوں کی ذہنی اور فکری تربیت ایسی بہترین ہو چکی ہوتی ہے کہ یہ مقصد سامنے رکھنے والی ریاست کی تحویل میں جو کچھ بھی جاتا ہے،وہ اسے اپنی امانت سمجھتی ہے۔اور وہ صرف مقصد کے حصول کا ہی ذریعہ ہوتا ہے۔اگر ایک ریاست اپنی اس ذمہ داری کی انجام دہی میں قاصر ہے تو اسے کوئی حق ہی نہیں کہ وہ ذرائع پیداوار اور زمینوں کو اپنی ملکیت میں لے۔ان چیزوں کو اپنی تحویل میں لینا تو درکنار،ایسی حکومت کا تو کوئی حقِ حکومت ہی باقی نہیں رہتا۔یہی وجہ ہے کہ ہم مروجہ ''جمہوریت'' نامی فرعونیت اور ملوکیت کو قطعاً غیر قرآنی حکومت سمجھتے ہوئے ان کی حمایت اور انتخاب کو ''الحکم للہ'' کی سنگین خلاف ورزی قرار دیتے ہیں۔

ایک قرآنی ریاست کا فریضہ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہوتا ہے۔یہ ریاست تو افراد کی ذہنی و

جسمانی پرورش ونشوونما کے لیے وجود میں آتی ہے۔نہ کہ ان کا گلا گھونٹنے۔جن افراد کے ہاتھوں میں اس ریاست کا انتظام ہوتا ہے،ان کی سیرت وکردار اللہ کے اسی حکم میں دکھائی دیتی ہے۔کیا ایسے افراد کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ ذرائع رزق کو اپنی تحویل میں لے کر انسانیت کی آزادی کو سلب کرلیں گے؟

ایتائے زکوٰۃ کا ذکر چل نکلا ہے تو ضروری ہے کہ پیچھے زکوٰۃ کے متعلق جو کچھ لکھا جاچکا ہے،اس کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

زکوٰۃ کے متعلق ہمارا مروجہ تصور اور فقہی احکامات قرآن سے اس قدر متصادم ہیں کہ جب تک قرآنی تصور سامنے نہ آئے، مروجہ روایتی تصورات کا غیر قرآنی ہونا سمجھ میں نہیں آسکتا۔قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ اتنا مال سال بھر جمع کرتے رہو تو اس میں سے اتنی شرح سے رقم بطور زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔زکوٰۃ کا تو مفہوم ہی یہ نہیں۔

لفظ زکوٰۃ کے معنی ہیں پھلنا پھولنا،نشوونما پانا،بڑھوتری پانا وغیرہ۔قرآن میں ''واقیموا الصلوٰۃ وأتوا الزکوٰۃ'' کا حکم بار بار آیا ہے۔درحقیقت یہی دونوں ستون ہیں جن پر ایک قرآنی نظام قائم ہوتا ہے۔قرآنی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو یکساں طور پر سامانِ نشوونما اور رزق بہم پہنچائے۔جس سے ان کی جسمانی نشوونما بھی بخوبی ہوتی جائے اور ان کی ذات وصلاحیتیں بھی پروان چڑھتی جائیں۔یہی چیز ''ایتائے زکوٰۃ'' کہلاتی ہے۔یعنی نشوونما کا سامان فراہم کرتے جانا۔اللہ نے واضح طور پر بتادیا ہے کہ یہی قرآنی ریاست کا فریضہ ہے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (سورہ الشوریٰ۔آیت 41)

یہ (جماعتِ مومنین) وہ لوگ ہیں جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ

وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ (سورہ المومنون۔آیت 4)

یعنی یہ لوگ زکوٰۃ (افرادِ معاشرہ کو سامانِ رزق بہم پہنچانے) کے لیے مصروفِ کار رہتے ہیں۔

اب ظاہر ہے قرآنی ریاست افرادِ معاشرہ کی یکساں نشوونما اور انہیں سامانِ رزق پہنچانے کا فریضہ اپنی آمدنی سے ہی ادا

کرے گی۔اس اعتبار سے حکومت کی جملہ آمدن کو اصطلاحی طور پر زکوٰۃ کہا جا سکے گا۔یعنی ذریعہ کو خود مقصد کہہ کر پکارا جائیگا۔اس میں بھی ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔یعنی جب حکومت کی آمدن کوزکوٰۃ کہا جائیگا تو اس سے یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ اس آمدن کا مقصد کیا ہے؟

خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں کچھ قبائل نے بغاوت اختیار کی تھی۔ان کا جرم یہ تھا کہ وہ حکومت کو ''زکوٰۃ'' ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔یعنی وہ مرکزی حکومت کے واجبات کو ادا کرنے سے انکاری تھے۔اور مطالبہ کرنے پر بغاوت پر اتر آئے تھے۔یہ حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔پس ان کے خلاف جہاد کیا گیا۔

یہ تھا زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔اب کہاں ہمارا وہ روایتی تصور کہ سارا سال مال کے ڈھیر لگاتے جاؤ اور سال بعد کچھ حقیر سی رقم خیرات کر دو۔اور بقیہ مال کو ''پاک'' سمجھ کر اس پر پورا پورا تصرف کرو،اور کہاں قرآن کا پیش کردہ جاندار اور فلاحی تصورِ زکوٰۃ۔کتنا فرق ہے۔

مسلمانوں میں یہ تصور دور اول میں موجود نہیں تھا،وہاں ایک شرح مقرر کی گئی تھی۔بالفرض اڑھائی فیصد۔کہ اسی سے اس وقت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جاتی ہونگی۔اگر اڑھائی فیصد سے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریات پوری نہ ہوتیں تو پھر شرح زیادہ بھی مقرر کی جا سکتی تھی۔

لیکن ہم لوگوں نے اسے قیامت تک غیر متبدل سمجھ لیا۔قرآن کے معاشی نظام کی جگہ پھر سے سرمایہ داری نظام قائم ہو گیا۔لیکن پھر ہماری سرمایہ داریت اور اس کی آلہ کار مذہبی پیشوائیت کے لیے مسئلہ یہ بنا کہ قرآن کی جو آیات جن میں ارتکازِ دولت کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی،وہ ان لوگوں کے راستہ میں حائل ہوتی تھیں۔اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے وہی پرانا ایرانی حربہ استعمال کیا گیا۔یعنی روایت سازی۔وضعی روایات تراشی گئیں۔اور پھر اس پر سب سے بڑی حیرت کی بات یہ کہ اس کام کے لیے چنا کسے گیا؟ وہ عمر فاروقؓ جنکی تمام عمر سرمایہ داریت کے خلاف مجسم انقلاب تھی۔ذیل میں اس موضوع روایت کا کچھ تذکرہ کیے دیتا ہوں:

روایت

سورہ توبہ میں کہا گیا ہے کہ مال و دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے پھر سرمایہ داروں کے جسم داغے جائیں گے۔(سورہ التوبہ۔آیت 35-34)۔اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں مشکوٰۃ کے کتاب الزکوٰۃ میں ایک روایت درج ہے۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (سورہ التوبہ۔آیت 35-34)

تو مسلمانوں پر اس کا بہت اثر ہوا۔یعنی انہوں نے اس حکم کو بوجھ سمجھا۔حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری پریشانی کو دور کروں گا۔اس مشکل کو حل کروں گا۔پس رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور کہا کہ اے نبی یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رب نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔ابن عباس کہتے ہیں کہ نبی کا اتنا کہنا تھا کہ حضرت عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

تبصرہ: آپ نے دیکھا کہ ہماری ملوکیت اور اس کی آلہ کار مذہبی پیشوائیت نے قرآن کے حکم کو ایک طرح سے منسوخ قرار دینے اور سرمایہ داری کو پھر سے رائج کرنے کے لیے کس قدر توہین آمیز حربے استعمال کیے۔

کہا گیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ دولت کے ڈھیر جمع نہیں کر سکتے تو اس سے صحابہ کرامؓ میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کہ ہائے اللہ مارے گئے۔یہ کیا ہو گیا (معاذ اللہ)۔وہ صحابہؓ جن کی قرآن گواہی دے رہا ہے کہ وہ مال تو دور کی بات اپنی جانیں بھی قرآنی نظام ریاست کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں، کے بارے میں روایت کیا تاثر دے رہی ہے۔افسوس۔

پھر وہ بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں کہ بھئی رسول اللہ کے نوٹس میں یہ بات لاؤ۔''رولا پے گیا۔اے کی ہو گیا''۔

اب آگے ایرانی مجوسیت زدہ راویوں کی مکاری کا ایک شاہکار سامنے آتا ہے۔یہاں رسول اللہ ﷺ سے ''مذاکرات'' کرنے کے لیے شخصیت کونسی چنی جا رہی ہے؟ فاروق اعظمؓ۔توبہ۔وہ فاروق اعظم جن کی خلافت کی تمام عمر سرمایہ داریت کی بیخ کنی اور غرباء و مساکین کی فلاح و بہبود میں گزری۔وہ فاروق اعظمؓ جن کی سیرت میں خود اسی کتاب میں لکھا ملتا ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ ہونے کے باوجود ان کے کرتے اور تہمد میں پیوند لگے ہوتے تھے۔اس عمرؓ کو نمائندہ بنایا جا رہا ہے اس کام کے لیے کہ جا کر رسول اللہ ﷺ کو مطلع کرے کہ اس آیت کے نزول سے صحابہؓ بہت پریشان ہو گئے ہیں۔کہ وہ کچھ جمع ہی نہیں کر سکتے۔

قارئین دیکھتے جائیں عجمی افترا پردازی کا یہ عالم۔اللہ کا حکم نازل ہورہا ہےاور رسول ﷺ کی زبان مبارک سے صحابہؓ تک پہنچ رہا ہے۔اوروہ حکم سن کر مضطرب ہوگئے ہیں اور رسول اللہ سے ''احتجاج'' کرنے کا پروگرام بنارہے ہیں۔وہ صحابہ کرامؓ جن کے متعلق قرآن یہ گواہی دیتا ہے کہ جونہی کوئی حکم نازل ہوتا،وہ کہتے تھے کہ:

''سمعنا واطعنا''(سورہ البقرہ۔آیت 285)

ہم نے سن لیا۔اورہم اطاعت کریں گے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس جاتے ہیں اور جا کرعرض کرتے ہیں کہ کیا آپ کومعلوم ہے اس حکم سے آپ کے صحابہؓ پہ کیا ردعمل ہورہا ہے؟یعنی جیسے یہ حکم اللہ نے نہیں بلکہ نبی نے دیا ہو۔اور جا کران سے بات کی جارہی ہو کہ جناب ''آرڈیننس واپس لیں،اس پرتو Reaction بہت سخت ہورہا ہے''(معاذ اللہ)۔

حکم اللہ کا دیا ہوا۔اوراب نبی فرمارہے ہیں کہ جاؤان سے جا کرکہو کہ گھبرائیں مت۔انہیں دراصل سمجھ نہیں آئی۔انہیں کہہ دو کہ اگراڑھائی فیصدزکوٰۃ نکال دیا کریں تو اس آیت کا منشاء پوراہو جائیگا۔

آگے روایت کہتی ہے کہ جب عمرؓ نے واپس آ کرصحابہ کرامؓ کو یہ ''خوشخبری'' سنائی تو انہوں نے مل کرنعرہ تکبیر بلند کیا۔اللہ اکبر۔ موج ہوگئی۔

قارئین دیکھا آپ نے؟یہ جھوٹی روایت خودہی بتلارہی ہے کہ اسے مسلمانوں کے دورِملوکیت میں وضع کیا گیا۔تا کہ یہ ''قل العفو'' والی بات اورقرآن کا معاشی نظام مسلمانوں کے ذہنوں میں باقی نہ رہے۔یوں دین کومسخ کر کے مذہب بنادیا گیا اور زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم تبدیل کر کے اسے چند روپوں کی وہ ''خیرات'' بنادیا گیا جوکوئی لیتے وقت بھی شرمندگی اور ذلت محسوس کرے۔کہ وہ ''زکوٰۃ لے رہا ہے''۔

خیر۔۔۔بات ہورہی تھی قرآنی نظام کی اس آخری منزل کی۔یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ رسول اللہ نے اپن دور میں ہی اس معاشی نظام کی بنیاد رکھ دی تھی۔لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ کو بہت کم وقت مل پایا۔اور رسول اللہ کے دور میں یہ نظام مجموعی طور پراپنی ابتدائی سٹیج میں ہی رہا۔اسے اس کے عروج تک حضرت عمر فاروقؓ نے پہنچایا۔اب چونکہ رسول اللہ کے دور میں تو مسلمانوں پراس قرانی نظام کی پہلی سٹیج کے احکامات کا ہی اطلاق ہوتا تھا۔لیکن خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اس زمانہ میں بھی قرآنی نظام کی آخری اور حتمی منزل کے دور کی آئینہ دار تھی جس میں زائد از ضرورت کسی کے پاس نہیں رہتا۔اس

نظام کا آغاز رسول اللہ کی مکی زندگی میں ہی ہوگیا تھا جب قرآنی ریاست کا قیام تو ایک طرف، خود مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت بہت تنگدستی اور مفلوک الحالی میں زندگی بسر کر رہی تھی۔اس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ نے جماعت کے لیے کیا طریقہ اختیار فرمایا تھا، اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

''اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا اور رفاقتوں کی نوبت آ جاتی تو لوگ اپنے کھانے کی اشیاء کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر گروہ بنا کر تقسیم کر لیتے''

مدینہ پہنچنے کے بعد اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔رسول اللہ کی وفات کے وقت اس کی وسعت تقریباً دس لاکھ مربع میل پر محیط ہو چکی تھی۔لیکن اس سربراہ مملکت کی اپنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ کبھی بھی اپنے پاس ایک پائی بھی نہیں جمع کی۔ایک روایت میں ہے کہ:

''مرض الموت کے وقت رسول اللہ کے پاس چند دینار موجود تھے جو کہیں سے آئے تھے۔رسول اللہ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کر دو۔(یعنی بیت المال میں بھجوا دو)۔تا کہ اس سے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔لیکن پھر رسول اللہ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔کچھ دیر بعد آپ کو ہوش آئی تو آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ دینار لاؤ۔دینار کو رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ پر رکھا اور کہا کہ۔۔۔محمد کا اپنے رب کے متعلق کیا گمان ہوگا جب وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں خود صدقہ کر دیا (یعنی بیت المال میں بھجوا دیا)۔

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے ترکہ کا تعلق ہے، بخاری میں ہی یہ روایت موجود ہے کہ رسول اللہ نے فرما دیا تھا کہ:

''میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔میری بیویوں کی ضروریات اور انتظامی اخراجات کے بعد جو بھی بچے گا، وہ صدقہ ہوگا''

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

''حضور ﷺ نے کوئی درہم چھوڑا نہ دینار۔نہ بکری نہ اونٹ۔اور نہ ہی کسی چیز کی وصیت کی۔

بخاری میں ہے کہ رسول اللہ نے اپنے خچروں اور ہتھیاروں کے سوا کوئی چیز نہیں چھوڑی۔

یہ تھا رسول اللہ ﷺ کا عمل جو ہمارے لیے اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے۔قرآنی نظام کے قیام کی وہ پہلی سٹیج تھی، مگر رسول اللہ نے اپنے عمل سے اپنی امت کو یہ پیغام دیا کہ تمہیں اپنے پاس دولت جمع نہیں کرنی بلکہ اسے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ہر دم کھلا رکھنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایسی زندگی کیوں تھی؟اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔اس دور میں اگر چہ ریاست بہت وسیع وعریض تھی لیکن اس کے ساتھ عوام جس قدر مفلوک الحال تھے اور ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی جو عظیم ذمہ داری رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر لے رکھی تھی ،اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اپنا معیارِ زندگی بلند کر ہی نہیں سکتے تھے۔معیارِ زندگی تو فاروقِ اعظمؓ نے بھی بلند نہیں کیا جن کے دور میں مملکت خوشحال ہوگئی تھی۔یہ تو پھر رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس تھی۔

ریاست کی معاشی ذمہ داریاں:رسول اللہ کی زبانی

قرآنی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داریوں کا اندازہ رسول اللہ کے ان فرمودات کی روشنی میں لگایا جا سکتا ہے جو کتبِ تاریخ و روایات میں درج ہیں۔مسند احمد میں ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔اس بستی سے اللہ کی حفاظت اور نگرانی کا ذمہ ختم ہوگیا"۔(مسند احمد)

اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی کو بھی محسوس نہ ہونے دے کہ وہ یتیم، بے سہارا اور لاوارث ہے۔اسی لیے رسول پاک نے فرمایا کہ:

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو،اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول (یعنی قرآنی نظامِ ریاست) ہے۔(جامع ترمذی)

اگر کوئی شخص ایسے حال میں مر جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو اور وہ تنگدستی کی وجہ سے اسے ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی ریاست کے ذمہ ہوگی۔پس رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ:

"جس شخص کو اللہ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا اور وہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے سے لاپرواہ ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کی جانب سے لاپرواہ ہو جائیگا۔(سنن ابوداؤد)

ضرورت سے زائد مال اور عملِ رسول

جیسا کہ پیچھے واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کی رو سے کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد مال اپنے پاس سٹور نہیں کر سکتا۔اس کا دورِ رسالت میں عملی ثبوت ہمیں مسلم کی ایک روایت سے بھی ملتا ہے:

"ابوسعیدؓ خدری فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر پر جا رہے تھے۔اتنے میں ایک شخص آیا اور وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔آپ نے پوچھا کہ جس شخص کے پاس زائد سواری ہو،وہ اسے دے دے، کیونکہ اسے ضرورت ہے۔اور جس شخص کے

پاس زائد زادِراہ (سامانِ سفر) ہے، وہ اسے دے دے جسکے پاس نہ ہو، یا ضرورت سے کم ہو۔ یوں آپ نے بہت سی اشیاء کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد چیزیں اپنے پاس رکھنے کا حق حاصل نہیں۔"

حضرت بلالؓ سے مروی ہے کہ:

"رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے، اسے چھپا کر نہ رکھ۔ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے، اس میں کنجوسی و بخل سے کام نہ لے۔ میں نے پوچھا کہ اللہ کے رسول ﷺ یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپ نے فرمایا کہ یا یہ روش اپناؤ یا پھر جہنم کا ایندھن بننے کے لیے تیار رہو۔ (حاکم)

مسلم شریف میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

"حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ انسان میرا مال میرا مال کہتا رہتا ہے۔ حالانکہ اس مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اول وہ جو وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے، دوئم وہ جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے۔ سوئم وہ جو کچھ وہ دوسروں کو دے کر اپنے لیے سامانِ آخرت (ذات کی نشوونما) کر لیتا ہے۔ ان تینوں اشیاء کے علاوہ جو بھی اس کے پاس ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا پھر وہ دوسروں کے لیے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ چند آثار جو ہمیں قرآن کے معاشی نظام کی تائید میں کتبِ روایات و احادیث سے بھی ملتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں قرآن کے اس معاشی نظام (جسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے) کی صرف ابتداء کر چکے تھے، لیکن رسول اللہ کی اپنی حیاتِ طیبہ میں بھی اس کی انتہا (آخری سٹیج) کی جھلک نظر آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو ضرورتمندوں کے لیے وظائف مقرر کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ جسے صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانے میں مزید وسعت دی تھی۔ پھر حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اسے مزید تقویت دی۔

رسول اللہ ﷺ مختلف علاقوں میں اپنے عاملین سے کہتے کہ وہ ان علاقوں کے ضرورتمندوں کی فہرستیں مرتب کر کے مرکز کی جانب بھیجیں۔ مرکز سے ان کی مناسب امداد کی جاتی۔ نیز آپ ﷺ نے زرعی اصلاحات کا بھی آغاز فرما دیا تھا جس کی تفصیل آگے ایک الگ عنوان کے تحت دوں گا۔

قرآن کا معاشی نظام اور خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کا عمل

رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت کا بارِ امانت رسول اللہ ﷺ کے قریبی ساتھی حضرت صدیق اکبرؓ نے اٹھایا۔ ایک تو ان کا دور خلافت بہت مختصر رہا، دوسرا ان کا زیادہ تر وقت اندرونی اور بیرونی سازشیں ختم کرنے میں صرف ہو گیا۔ اس لیے انہیں بھی

اس معاشی نظام کواس کی انتہائی منزل تک پہنچانے کا موقع نہ مل سکا۔پھر بھی انہوں نے ریاست کے لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے تو وہ رسول اللہ کے اسوہ حسنہ کی ہو بہو کاپی تھے۔خلافت سے قبل آپ کا پیشہ تجارت تھا اور کافی خوشحال تھے۔جب خلیفہ بنے تو حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ سے مشاورت کے بعد انہوں نے بیت المال سے وظیفہ لینا قبول کرلیا لیکن وہ صرف اتنا ہی ہوتا تھا جس سے ان کی اور اہل خانہ کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں۔جسے آج کے دور میں ہم ''گزارہ کرنا'' کہتے ہیں۔جب وقتِ وفات قریب آیا تو آپ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کیا میں جتنا بیت المال سے اپنے لیے لے چکا ہوں،اتنی لوگوں کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔اس بے چینی کو رفع کرنے کے لیے انہوں نے اپنے اقرباء سے کہا کہ ان کے پاس ایک مختصر سا پلاٹ ہے،اسے فروخت کر دیا جائے اور انہوں نے اب تک جتنی رقم بھی بیت المال سے لی ہے،اسے اس کی قیمت سے واپس کر دیا جائے۔چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ اپنے حساب کو یہیں چکا کر اگلے جہان گئے۔اسی طرح دو مزید واقعات ایسے ہیں جن سے ان کی سیرتِ طیبہ روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک بار سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ الرسول کا وظیفہ کتنا ہونا چاہیے؟تو حضرت صدیق اکبرؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم سے کم اجرت کتنی ہونی چاہیے؟وہی اجرت آپ نے اپنے لیے وظیفہ مقرر کی۔کسی نے پوچھا کہ اتنی کم اجرت سے آپ کا کیسے گزارا ہوگا؟ فرمایا کہ جیسے اس مزدور کا ہوتا ہے،ویسے ہی میرا بھی ہو جائیگا۔البتہ اگر میرا گزارہ نہ ہو پایا تو میں پہلے مزدور کی وہ اجرت بڑھاؤں گا،تاکہ پھر میری اجرت بھی بڑھ جائے۔جیسے جیسے مزدور کی اجرت میں اضافہ ہوگا،میرا معیارِ زندگی بھی اسی طرح بلند ہوتا جائیگا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن کھانے کے بعد آپ نے زوجہ محترمہ سے پوچھا کہ گھر میں کوئی میٹھی چیز ہے؟بیوی نے فرمایا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے،اس میں کوئی میٹھی چیز نہیں ہوتی۔آپ خاموش ہوگئے۔بات آئی گئی ہوگئی۔کچھ روز بعد صدیق اکبرؓ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ میٹھا حلوہ بھی موجود ہے۔زوجہ سے پوچھا کہ گھر میں تو اتنا راشن نہیں آتا۔تو آج یہ حلوہ کیسے میسر آگیا؟زوجہ محترمہ نے جواب دیا کہ میں نے اس روز آپ کی خواہش کو محسوس کیا تھا کہ آپ کا میٹھی چیز کھانے کو دل کر رہا ہے تو میں نے پھر یہ کیا کہ جو غلہ روز گھر میں آتا تھا،اس میں سے مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی رہی۔کچھ روز بعد وہ اتنا ہوگیا کہ بازار میں اس کے عوض کھجور کا شیرہ منگوایا جاسکے۔یوں یہ حلوہ میں نے تیار کیا۔آپ نے اسے تناول کیا اور بیوی کا شکریہ

ادا کیا۔

کھانے کے بعد بیت المال کے منتظم کے پاس گئے اور اسے کہا کہ ہمارے ہاں راشن جس قدر آتا ہے، اس میں سے آج سے ایک مٹھی غلہ کم بھیجا کرنا۔ کیونکہ میرے گھر کے ایک ہفتہ کے تجربہ نے یہ بتایا ہے کہ ہمارا گزارا مٹھی بھر آٹا کم ملنے سے بھی ہوسکتا ہے۔

اللہ اکبر۔۔۔۔یہ تھی وہ مقدس ہستیاں جو قرآن کے ''قل العفو'' کے اصول کی عملی تفسیر تھیں۔ اگر ایک مٹھی بھر آٹا بھی ضرورت سے زائد ہے تو ایک مومن اسے بھی اپنے تصرف میں لانے کی بجائے معاشرہ کے دوسرے ضرورتمندوں اور محروموں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دے دے گا۔

ایسے ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھوں قرآنی ریاست کا قیام عمل میں آتا ہے۔

قرآن کا معاشی نظام اور عمل فاروقؓ

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا کہ کیسے حضرت عمرؓ کے دور میں یہ نظام قرآنی اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک بہت لمبا موضوع ہے، مگر فی الوقت اتنا بتانا ضروری ہے کہ انہیں اپنے اس فریضہ کا کس قدر شدت سے احساس تھا اور انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں اپنی زندگی کو کس طرح قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل میں رکھا۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ:

(1) ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ لیکن

(2) وہ اپنی اس ذمہ داری کو براہ راست پورا نہیں کرتا بلکہ قرآنی ریاست پورا کرتی ہے۔

اسی اصول کی تشریح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

تم میں سے کوئی شخص بھی رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا پھرے کہ اے اللہ مجھے رزق دو۔ آسمان سے رزق نہیں برسا کرتا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

غور فرمائیں۔ کس قدر دور اندیش نگاہ کے مالک تھے فاروق اعظمؓ

یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد، تو قرآن میں تو حقوق اللہ کا سوائے ایک مقام کے کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔ ہر جگہ حقوق العباد کا ہی ذکر ہے۔ یعنی انسانوں کے حقوق انسانوں کے ذمہ۔

صرف ایک جگہ سورہ الانعام میں حقوق اللہ کا ذکر آیا ہے۔ جہاں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کھیتوں کی فصلیں اور باغات کے پھل سب عطیاتِ خداوندی ہیں۔ پس ان سے کھاؤ پیو۔ لیکن:

وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (سورہ الانعام۔آیت 142)

فصل کاٹنے کے بعد اس میں سے اللہ کا حق بھی دے دو۔

اسی حق کے متعلق ایک دوسری جگہ فرمایا کہ "متاعاً للمقوین" (سورہ الواقعہ۔آیات 73-63) یعنی یہ بھوکوں اور محروموں کا حصہ ہے۔ یعنی جس ایک جگہ اللہ اپنے حق کا ذکر کر رہا ہے، اس کی بھی وضاحت کر دی کہ وہ دراصل ضرورتمندوں اور محتاجوں کا حق ہے۔

ایک مشہور "حدیث قدسی" (روایت پسندوں کے لیے)

حدیث قدسی احادیث کی ایک مخصوص قسم ہے جس میں اللہ کی جانب سے صیغہ متکلم میں بات کی جاتی ہے۔ اکثر آئمہ جرح و تعدیل کے نزدیک ایسی روایات جن میں اللہ کی جانب سے صیغہ واحد متکلم میں بات کی جائے، اکثر من گھڑت ہوتی ہیں۔ لیکن احادیثِ قدسی کو عام احادیث سے بھی زیادہ "مقدس" سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ قرآن کریم کی رو سے تو یہ تصور ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ اللہ کا کلام قرآن کریم سے باہر بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ایسی احادیث کے وضعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا جن میں اللہ خود کچھ بولتا دکھایا جائے۔ لیکن یہاں میں صرف اور صرف قارئین کو "ارض اللہ" اور "حقوق اللہ" کا مفہوم سمجھانے کے لیے درج کروں گا۔ تاکہ وہ لوگ جو ان روایات کو درست مانتے ہیں، ان پر واضح ہو جائے کہ حقوق اللہ دراصل حقوق العباد ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور فی سبیل اللہ کا قرآنی مفہوم بھی دراصل نوع انسانی کی اجتماعی فلاح و بہبود ہے۔

روایت کے مطابق:

رسول اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ:

اے آدمی۔ میں ایک بار بیمار پڑا تھا۔ تو میری عیادت کے لیے کیوں نہ آیا؟

آدمی جواب دے گا کہ اے پروردگار، تو کیسے بیمار پڑ سکتا ہے؟ تو تو کل کائنات کا خالق اور بیماروں کو شفا دینے والا ہے۔ اور سب کا رب ہے۔ اس پر اللہ جواب دے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تھا لیکن تم اس کی عیادت کے لیے نہیں گئے۔ اگر تم اس کی مزاج پرسی کے لیے گئے ہوتے تو مجھے اسی کے پاس پاتے۔

پھر اللہ پوچھے گا کہ اے آدمی۔ میں نے ایک بار تجھ سے کھانا مانگا تھا۔ تم نے تو مجھے وہ بھی نہ کھلایا۔ انسان

پوچھے گا کہ پروردگار میں تمہیں کیسے کھانا کھلاتا؟تم تو خود سب جہانوں کے پالنے والے ہو۔تو اللہ جواب دے گا کہ کیا تجھے یاد نہیں کہ ایک بار میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو تو نے اسے نہیں کھلایا۔اگر تو اسے کھلا دیتا تو اس کا اجر میرے پاس پاتا۔پھر اسی طرح اللہ پیاسے کو پانی پلانے سے متعلق سوال کرے گا۔

(صحیح مسلم،''العدل الاجتماعیہ''ازسید قطب۔مطبوعہ مصر)

تو یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے وہ حقوق جو ایک قرآنی ریاست کے وسیلے سے پورے ہوتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق نے ایک بار فرمایا کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک پیاس سے مر گیا تو قیامت کے روز عمر سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

کچھ روشن مثالیں: مشعلِ راہ

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کو مطلع کیا گیا کہ بیت المال میں ایک اونٹنی آئی ہے جو اندھی ہے۔اسے کیا کیا جائے؟جب حضرت عمر فاروقؓ نے دیکھا کہ اس کا کوئی مصرف نہیں تو فرمایا کہ اسے ذبح کرلو اور پھر اس کا گوشت صحابہؓ اور ازواج مطہرات کے گھروں میں تحفتاً بھیج دیا۔گوشت ملنے پر حضرت عباسؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین،آپ ہمارے لیے روز اسی طرح کیا کریں تو کتنا اچھا ہو۔اس پر آپ نے فرمایا کہ اے عباس،مدینہ میں بہت سی بھوکی عورتیں بھی ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔تم ان کا بھی خیال رکھنا۔

کسی بھی معاشرہ میں عورتیں سب سے زیادہ بے بسی کی حالت میں ہوتی ہیں۔اس لیے حضرت عمرؓ نے جب یہ کہنا چاہا کہ میں کچھ ایسا انتظام کرنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں کوئی بھی بھوکا نہ رہے تو آپ نے اعلان کیا کہ اگر میں زندہ رہا تو مدینہ تو ایک طرف،عراق تک کی بیواؤں کو ایسا بنا دوں گا کہ وہ میرے بعد کسی کی بھی محتاج نہ رہیں گی۔

کفالتِ عامہ کے سلسلہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ خلافت کی حدود میں ہر تنگدست کی بلا تخصیصِ مذہب وملت امداد کی جائے۔ہر مقروض کا قرض ادا کیا جائے،ہر کمزور اور مظلوم کی مدد کی جائے۔ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے اور ہر برہنہ کو لباس پہنایا جائے۔یعنی ہر ضرورتمند کی ضرورت پوری کی جائے۔

رزق کے معاملہ میں حکومتی ذمہ داری کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ اس قدر شدت برتتے تھے کہ ایک بار بستی کے رہنے والوں نے ایک پیاسے مسافر کو پینے کے لیے پانی نہ دیا اور وہ پیاس کی وجہ سے مر گیا تو آپ نے اس کا خون بہا ادا کیا اور پھر اسے بستی

والوں سے وصول کیا۔اسی فاروقی فیصلہ کی وجہ سے ہی یہ ایک قانون بن گیا کہ اگر کسی بستی میں بھوک پیاس سے کوئی شخص مر جائے تو اہل بستی پر اس کا خون بہا لازم ہو جاتا ہے۔

ایک بار دورِ فاروقی میں مدینہ میں قحط پڑ گیا۔حضرت عمرؓ خود فاقوں سے بدحال ہو گئے۔لیکن انہوں نے جب تک یہ اطمینان نہیں کر لیا کہ ہر بھوکے کو کھانے کو مل گیا ہے،تب تک اپنے منہ میں کھانے کا ایک لقمہ تک نہ ڈالا۔اور وہ لقمہ اسی کھانے سے تھا جو ہر ایک کو میسر آ گیا۔جب قحط ختم ہوا اور قافلے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے لگے تو حضرت عمرؓ انہیں رخصت کرنے خود تشریف لائے،وہ لوگ خوشی خوشی اپنا سامان لا در ہے تھے۔یہ منظر دیکھ کر فاروق اعظمؓ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔اہل قافلہ میں ایک شخص نے آپ سے عرض کی کہ اہل قافلہ کو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔وہ سب آپ کے ممنون ہیں۔اس پر فاروق اعظمؓ نے جواب دیا کہ:

”تم نے ایسا کیوں کہا؟ جو کچھ میں نے آپ لوگوں پر خرچ کیا ہے،یہ میرا یا میرے باپ خطاب کا مال نہیں تھا۔یہ اللہ کا مال تھا۔اس لیے میری ذاتی شکر گزاری کیسی؟“

واقعی مال اللہ کا ہوتا ہے۔سربراہ مملکت کی حیثیت صرف تقسیم کرنے والے کی سی ہوتی ہے جو پوری امانتداری اور دیانت سے اسے انسانوں میں تقسیم کرتا ہے۔اور حضرت فاروق اعظمؓ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی جسے ابن عباسؓ نے آپ کی شہادت کے بعد ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

”وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور برابر کی تقسیم کرتے تھے“۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا بھر کی خوراک اور صفائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے 13 بلین امریکی ڈالرز کی ضرورت ہے۔یہ وہ رقم ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ اور یورپ کے باشندے سالانہ صرف پرفیومز پر خرچ کر دیتے ہیں۔

اسی طرح اہل یورپ سالانہ 11 بلین امریکی ڈالرز صرف آئس کریم پر خرچ کر دیتے ہیں۔جبکہ پوری دنیا کو صاف ستھرا پانی مہیا کرنے کا سالانہ خرچ اندازاً صرف 2 بلین امریکی ڈالرز ہے۔

www.theodora.com/maps

انفرادی سے اجتماعی زندگی تک سفر کے دوران افراد کی ذہنی تربیت کے لیے قرآنی ہدایات

انفرادی نظام سے اجتماعی نظام تک کا سفر ایک انتہائی مشکل راستہ ہے جسے قرآن نے ''پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف'' کہا ہے۔اگر انسان کی کسی خاص راستے کی جانب رہنمائی نہ کی جائے تو وہ اپنے لیے ایسا راستہ منتخب کرتا ہے جو سب سے آسان ہو اور جس سے سب کچھ سمٹ کر اس کے پاس آجائے۔اسکی پیاس بجھتی نہیں، دنیا بھر کی دولت بھی سمیٹ لے تو حرص ختم نہیں ہوتی۔اسے قطعاً اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ دنیا میں موجود دوسرے انسانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ایسے انسان کی عقل اسے کہے گی کہ جتنا سمیٹ سکتے ہو سمیٹ لو، کل کو تم پر برا وقت آن پڑا تو کیا کرو گے؟ ایسے وقت میں کوئی دوست یار ساتھ نہیں دیتا، سب چھوڑ جاتے ہیں، ایسے میں وہ پیسہ ہی کام آتا ہے جو جمع کیا ہو۔

اور بات ہے بھی ٹھیک۔جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں، (یعنی سرمایہ دارانہ اور استحصالی معاشرہ)، اس کا چال چلن بھی یہی ہے۔دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔جس پر کوئی برا وقت آن پڑے، اس کا ساتھ کوئی نہیں دیتا، اس وقت وہی پیسہ ہی کام آتا ہے جو انسان کے پاس ہو۔

ظاہری بات ہے کہ ایسے معاشرے میں رہنے والے ایک نارمل انسان کو یہ نقطہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ زندگی کا صحیح طریقہ یہ نہیں کہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹتے جاؤ بلکہ درست اندازِ زندگی یہ ہے کہ ایک انسان جو کچھ کماتا ہے، اس میں اس کا حصہ صرف اتنا ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے، باقی جو کچھ بھی ہے، وہ دوسرے انسانوں کی پرورش کے لیے ہے۔

اب ایسی باتیں موجودہ دور کے انسان کو سمجھانا اس قدر مشکل ہے تو اسے عملی طور پر اس مقام تک لانا اور اسکی ذہنی تربیت کرنا کس قدر دشوار گزار کام ہوگا۔

قرآن اس مسئلہ سے بے خبر نہیں۔یہ تو وہ کتاب ہے جو حقائق کا سامنا کرتی ہے، اس سے کنی نہیں کتراتی۔چنانچہ قرآن نے واضح طور پر سورہ البلد میں بتا دیا ہے کہ انسان کے سامنے دو راستے کھلے پڑے ہیں۔ایک آسان راستہ ہے (ذاتی مفاد پرستی)، دوسرا راستہ دشوار گزار ہے (دوسروں کا مفاد مدنظر رکھنا)۔انسان کو ایک راستہ بہت آسان نظر آتا ہے اور وہ اسے

اختیار کر لیتا ہے، جبکہ دوسرا راستہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے، وہ اس پر چڑھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ انسان نہیں جانتا کہ یہ راستہ کونسا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس میں انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں سے آزاد کرایا جاتا ہے۔ یا معاشی بدحالی میں جب بھوک افلاس عام ہو جائے تو غریبوں کی روزی روٹی کا بندوبست کرنا، ان لوگوں کو سہارا دینا جو معاشرے کے اندر رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ ان مزدوروں کی فلاح و بہبود اور ذہنی نشوونما کا انتظام کرنا جنہیں ہمیشہ مٹی میں لت پت رکھا جاتا ہے کہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما نہ ہو پائے، انکی سوچیں ترقی کا تصور تک نہ کر سکیں۔

اب سوال یہ درپیش ہے (اور باب ھذا کا موضوع بھی) کہ انسان کو اس دشوار گزار راستے پر چڑھنے کے لیے کیسے تیار کیا جاسکتا ہے؟ انسانوں کو کس طرح موجودہ معاشرہ اور انفرادی زندگی سے قرآنی معاشرہ اور اجتماعی زندگی کی جانب لیجایا جاتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے کی پرورش کا ذمہ دار بنتا ہے؟ یہ ہے وہ سوال جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن اس سوال کا جواب نہایت شرح وبسط سے دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے قرآن کریم نے ایک مفصل اور موثر ترین پروگرام تشکیل دیا ہے جس کا احوال پیش خدمت ہے۔

تبدیلی کا عملی پروگرام

جو لوگ وحی کی رو سے انسانوں کے لیے مستقل اقدار کی شکل میں ضابطہ حیات کے نزول پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب سے پہلے ایک معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ معاشرہ سے مراد ایک سوشل نظام ہے جس میں اللہ کا دیا ہوا ضابطہ حیات عملی طور پر نافذ ہوتا ہے۔ کیونکہ دین نام ہی اجتماعیت کا ہے۔ اس میں انفرادی زندگی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا معاشرہ دورِ حاضر کی اصطلاح میں ریاست (State) کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی مکی حیات طیبہ میں اپنی تمام تر کاوشیں اور جدوجہد لوگوں کی ذہنی تربیت میں صرف کی تھی کیونکہ انکے پیش نظر بھی ایک اجتماعی ریاست کا قیام تھا جس کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے لوگوں کو ذہنی طور پر آمادہ اور تیار کیا جاسکے۔ جب ایک کامل الایمان جماعتِ مومنین تیار ہوگئی، تب مدینہ ہجرت کی گئی اور پہلی قرآنی فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔

ہر نظام کی طرح اس نظام مملکت میں بھی کچھ لوگ ایسے ہونگے جن کے ذمہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے فرائض ہوں۔ جبکہ باقی افراد معاشرہ ان فرائض کی انجام دہی میں ان کے دست بازو بنیں گے۔ لیکن ان کے درمیان حاکم ومحکوم کا

تعلق قطعاً نہیں ہوگا۔اس لیے کہ قرآن کی رو سے کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر اپنی حکومت چلانے کا اختیار نہیں۔یہ وہ نظام ہوتا ہے جس میں ہر کوئی قوانین خداوندی کا مطیع ہوتا ہے۔لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اطاعت چاہے قوانین الٰہیہ کی ہی کیوں نہ ہو، یہ بہر حال ایک عملی نظام کی شکل میں ہی ممکن ہے۔یہی حکومت کی مشینری کہلاتی ہے۔اور اس حکومت میں بھی ایک مرکزی اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے جو اللہ کے قوانین کو ریاست میں نافذ کرتی ہے۔اور ایسی ہی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت اللہ کی عملی اطاعت کہلائے گی۔افراد معاشرہ اس مرکز کے احکامات کی اطاعت کریں گے۔اور یہ مرکز ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔اور جن کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔جن میں سب سے پہلی ذمہ داری فراہمی رزق کی ہے۔

پہلا مرحلہ: ایمان کی درستگی

ہمارے ہاں جو غیر مسلم کلمہ پڑھ کر داخل اسلام ہو جائے، اسے ہم مسلمانوں کے گروہ کا ایک فرد سمجھنے لگتے ہیں۔ہم پیدائشی مسلمانوں کے لیے اس کلمہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔لیکن قرآن کی رو سے مسلمان ہونے کے لیے شرائط کچھ اور ہیں۔

ایمان صرف یہ نہیں کہ چند ان دیکھی چیزوں کو زبانی کلامی تسلیم کر لیا اور آپ صاحبِ ایمان ہو گئے۔بلکہ ایمان دراصل ان بنیادی حقائق کو عقل و فکر اور دلائل و براہین کی بناء پر تسلیم کرنے کا نام ہے جنہیں مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ان کی خصوصیات یہ ہوتی ہے کہ یہ نا قابلِ تغیر و تبدل ہوتی ہیں اور بذریعہ وحی ہی انسانوں کو عطا کی جاتی ہیں۔ان کی صداقتوں کا معیار خود ان پر عمل کے نتائج ہیں جو کہ خود بذریعہ وحی بتا دئے جاتے ہیں۔اس لحاظ سے ایمان کے لیے ہم Faith کی بجائے Conviction کہہ کر پکاریں تو یہ زیادہ بہتر تعریف ہوگی۔

ایمان کے تصورات میں پہلا تصور یہ ہے کہ انسان کے پاس خود اس کی عقل و حواس خمسہ کے علاوہ ایک ذریعہِ علم اور بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔اور جو انبیاء کرام کے ذریعے انسان تک پہنچائی گئی۔

اس کے بعد ایمان کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون کارفرما ہے۔چاہے وہ انسان کی یہ داخلی دنیا ہو یا خارجی کائنات۔اور وہی قانون جو خارجی دنیا میں از خود نافذ العمل ہے، اسے انسانوں کی اس دنیا میں بھی کارفرما ہونا چاہیے۔اور یہ کہ انسان وحی کے علاوہ کسی بھی دوسرے قانون کے تحت کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتا۔یہ وحدتِ قانون کہلاتا ہے، اور وحدت قانون کے معنی ہیں وحدتِ خالق۔اور پھر اسی سے وحدتِ مخلوق کا تصور ابھرتا ہے۔یعنی تمام نوع انسانی ایک

عالمگیر برادری ہے۔قرآن نے اس تصور پر بہت زور دیا ہے اور تمام انسانوں کو ایک ہی نفسِ واحدہ سے پیدا شدہ بتایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (سورہ الاعراف۔آیت 189)

وہی رب ہے جس نے تمہیں ایک جرثومہ سے تخلیق کیا تھا(تمام انسان ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں،ایک ہی عمارت کی اینٹیں اور ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔اس لیے سب سے مساوی سلوک کیا جانا چاہیے)۔

ایمان کا تیسرا جزو یہ ہے کہ انسان کی زندگی محض اسی جسم اور اسی دنیا کے ساتھ وابستہ نہیں۔انسان کے جسم کے ساتھ ساتھ اسے ایک ذات بھی عطا کی گئی ہے۔جیسے جسم کی پرورش ضروری ہے،اسی طرح ذات کی پرورش کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔انسانی جسم کی پرورش (لینے) سے ہوتی ہے جب کہ ذات کی پرورش کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ دیتے کتنا ہیں؟آپ دنیا کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے کس قدر حصہ ڈالتے ہیں؟آپ نوع انسانی کو کتنا فائدہ پہنچاتے ہیں؟ انسانی جسم موت کے بعد فنا ہو جاتا ہے مگر انسانی ذات موت کے بعد فنا نہیں ہوتی اور اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔آگے وہی بڑھے گا جس نے اپنی ذات کو دنیا کے اندر متوازن انداز میں نشو ونما دی ہوگی۔انسانی ذات کی تربیت کا راز اسی میں ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انکے نتائج (Output) کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دے،انکی پرورش کے لیے عام کر دے اور یوں رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ کی صفاتِ ربوبیت کا مظہر بن جائے۔یہ وہ عظیم مقصد ہے جس کے لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔اور اسے اختیار و ارادہ سے نواز کر وحی کی روشنی عطا کی گئی ہے۔تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھ سکے کہ اللہ نے انسانوں سے متعلق جو ذمہ داریاں اپنے سر لی ہیں،اسکی یہ مخلوق وہ ذمہ داریاں کس حد تک پوری کرتی اور اس زمین پر خدا کا رول ادا کرتی ہے۔جیسے خدا تمام کائنات کو پالتا ہے،اسی طرح وہ اس زمین پر انسان کو بھی حکم دیتا ہے کہ تم بھی اسی طرح اس زمین پر رب بن کر دکھاؤ۔تم بھی انسانیت کی پرورش کرو۔ہر وہ ذمہ داری پوری کرو جو میں نے انسانوں سے متعلق اپنے ذمہ لی ہے۔یہی وہ چیز ہے جو خدا انسان میں دیکھنا چاہتا ہے اور جو انسان یہ صفاتِ خداوندی اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے،اسکی ذات ارتقاء کی ایسی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے کہ موت کے بعد آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔اور جیسے ایک ننھے سے بیج کو دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے کہ یہ ایک قد آور پھلدار درخت آخر کیسے بن جاتا ہے؟بالکل اسی طرح انسان اپنے شعور کی موجودہ سطح پر رہتے ہوئے اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا کہ اگر وہ اپنی ذات کی یوں نشو ونما کرتا ہے تو کل کو اس دنیا کی خوشگواریوں کے ساتھ ساتھ اسکی موت کے بعد کی زندگی کس قدر حسین اور

دلفریب ہوسکتی ہے۔

انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔اوراس کا اثر یا چھاپ اس کی ذات پر پڑتی ہے۔اچھے کاموں کا اچھا نتیجہ اور برے کاموں کا برا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔برے کاموں کے ذریعے تباہ ہوجانے والی ذات کوواپس اچھائی کی جانب موڑنے اوراس کی نشوونما کا عمل دوبارہ سے بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان پھر سے وحی پر عمل شروع کردے۔

انسانی ذات کی حقیقت اور پرورش سے متعلق تفصیلات گزشتہ باب میں پیش کی جاچکی ہیں۔

المختصر یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جنہیں قرآن ایمان کے بنیادی تصورات کے طور پر انسان کو ذہن نشین کراتا رہتا ہے۔یہ ایمان کے بنیادی اجزاء کہلاتے ہیں۔یعنی اللہ، رسول، ملائکہ، آخرت، وحی وغیرہ کے وجود پر ایمان لانے کے بعد اپنی تخلیق کے حقیقی مقصد پر بھی ایمان لانا۔یہی وہ امر ہے جسے قرآن ''پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے'' سے تشبیح دیتا ہے۔سب سے پہلی کڑی انسان کے دل میں یہی ایمان پیدا کرنا ہے کہ وہ یہاں اپنے لیے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے بھی پیدا کیا گیا ہے۔اور جتنا زیادہ وہ دوسروں کے کام آئے گا، اسکی ذات میں خدا تعالیٰ کی صفات کی نمود ہوتی چلی جائے گی اور وہ بلند سے بلندتر ہوتا جائیگا۔

دوسرا مرحلہ: تعلیم وتربیت:

قرآنی نظام کے قیام کی جانب سفر کے لیے دلوں میں ایمان پختہ کرنے کے بعد لوگوں کی تعلیم وتربیت اور تدریس کا ہے۔یعنی جو لوگ ایمان لے آئے ہیں (ان الذین اٰمنوا)، ان کے اس ایمان کو اس ایمان کے ضابطہ حیات (قرآن) کی تعلیم وتدریس کے ذریعہ مستقل بنیادوں پر پختہ سے پختہ تر کیا جائے۔ان کے اندر ایک عالمگیر انسانی ربوبیت کی ذمہ دار جماعت بننے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ان کے دلوں میں اس تصور کو منقش کیا جائے کہ اس قرآنی نظام میں کوئی کسی کا حاکم یا محکوم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ تمام نوعِ انسانی کو کامل رضائے قلب سے ایک ایسی جماعت بن کر دکھانا ہے جس کا مقصدِ حیات پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اوران کی پرورش ہو۔جتنی زیادہ کوئی نوعِ انسانی کی پرورش کرتا ہے، اتنی ہی زیادہ اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے اوراسکی ذات صفاتِ خداوندی کی مظہر بن جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین اوران کے نفاذ کے لیے ان سے مطابقت رکھنے والے ذیلی قوانین کے سوا اور کوئی ضابطہ، قانون یا اصول کسی انسان کے لیے لائقِ اطاعت نہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَاداً لِّي مِن دُونِ

اللّٰہِ وَلَـٰکِن کُونُوا رَبَّانِیِّینَ بِمَا کُنتُمْ تَعْلَمُونَ الْکِتَابَ وَبِمَا کُنتُمْ تَدْرُسُونَ۔

(سورہ آل عمران۔آیت 78)

کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی بجائے میری اطاعت کرو۔اس کا کہنا صرف یہ ہوگا کہ تم قانونِ خداوندی کی تعلیم کو دلوں پر نقش کر کے ایسی جماعت بن جاؤ جو عالمگیر پرورشِ انسانیت کی ذمہ دار ہو۔

پھر جماعتِ مومنین سے یہ تقاضا کیا جائے کہ جو کچھ تم نے سیکھا، جانا اور سمجھا ہے، اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔انہیں بھی یہ علم دو، ان میں بھی شعورِ قرآنی پیدا کرو۔یوں اس قرآنی نظام کی فکر کو عام کیا جاتا ہے۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ نیک دل لوگ جو قرآنی نظام کی اہمیت اور مقاصد کو سمجھ جاتے ہیں اور اس کے قیام کے لیے انکے دلوں میں خواہش بیدار ہو جاتی ہے۔ان کے قلوب اذہان اپنے قدیم روایتی مذہب سے کٹ کر اس فکرِ قرآنی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور معاشرہ کے اندر ہی ایک معاشرہ کی تشکیل ہو جاتی ہے۔

لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے وقتی اجتماعات کا انعقاد:

لوگوں کے ذہنوں میں باہمی ہم آہنگی اور فکری یگانگت اور فکر و شعور کو یکساں سطح پر لانے کے لیے وقتی اجتماعات منعقد کیے جائیں تا کہ ایک ایسی فضا ہو جائے جس سے قرآنی نظام کا یہ شعور چار سو پھیل جائے اور لوگ اس نظام کے اغراض و مقاصد اور اللہ تعالیٰ کے احکامات سے مستقل بنیادوں پر شناسا ہوتے چلے جائیں۔یہی وہ مقصد ہے اور ایسی ہی فضا کے قیام کے لیے قرآن کریم نے ''قیامِ صلوٰۃ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے جسے آجکل ہم صرف ''نماز پڑھنا'' بنا بیٹھے ہیں اور اس کے حقیقی مقصد کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔

ہمارے ہاں ''قیامِ صلوٰۃ'' کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''نماز قائم کرو''۔اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ نماز کو پابندی سے پڑھو۔ اور مقصد اس سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی پرستش۔یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان یہ بات سمجھنے سے ہی قاصر ہے کہ اس ''پرستش'' کو معاشی امور سے کیا واسطہ؟ یہ ابہام نیا نہیں۔روز ازل سے ہوتا یہی آیا ہے کہ اللہ کی جانب سے ایک متوازن نظامِ دین (زندگی گزارنے کا طریقہ) ملتا تھا، لیکن انسان اسے آہستہ آہستہ مذہب میں بدل دیتے تھے، اور یوں دین کے وہ تمام اجزاء جو انسانی زندگی کی فلاح و بہبود سے متعلق ہوتے تھے، انہیں رفتہ رفتہ صرف پوجا پاٹ میں بدل دیا جاتا تھا اور انکا انسان کی روزمرہ کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا۔دین کا یہ حشر تمام سابقہ اقوام نے کیا، اور یہی حشر ہم مسلمانوں نے اسلام کا بھی

کرڈالا۔سورہ ہود کی 87ویں آیت میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت شعیبؑ اپنی قوم کودعوتِ صلوٰۃ دی تو انہوں نے سمجھا کہ شاید شعیبؑ اپنی کوئی نئے طریقے کی پوجا شروع کرنا چاہتا ہے،چنانچہ انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ اسے ایسا کر لینے دو۔جیسے چاہتا ہے پرستش کرلے،ہمیں کیا؟لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ شعیب جس صلوٰۃ کی دعوت دے رہا ہے،اس کا دائرہ کار عبادت گاہ تک محدود نہیں، بلکہ ہمارے مال و متاع اور جائیداد پر بھی اثر انداز ہونا چاہتی ہے۔چنانچہ انہیں بڑی حیرت وتشویش ہوئی اور انہوں نے شعیبؑ سے سوال کیا کہ:

قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ

(سورہ ہود۔آیت 87)

اے شعیب۔کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس بات کا بھی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے قوانین اور طریقوں کی پیروی ترک کردیں؟اور یہ کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں۔(یہ کیسی صلوٰۃ ہے بھئی؟)

قومِ شعیبؑ کے اس اعتراض پر غور کیجیے اور سوچیے کہ قرآن کریم کے دینِ حقیقی کی رو سے صلوٰۃ کا دائرہ کار کس قدر وسیع ہے کہ یہ انسان کی معاشیات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔قومِ شعیب تو اسے صرف پوجا پاٹ سمجھ بیٹھی تھی۔لیکن یہ کچھ اور ہی نکلی۔اسی طرح آج کا مسلمان بھی صلوٰۃ سے محض نماز مراد لیتے ہوئے قومِ شعیب ہی کے کردار کو دہرا رہا ہے اور جب ان سے صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ کا مفہوم اور آپسی تعلق بیان کرتے ہوئے صلوٰۃ کی حقیقت بیان کی جاتی ہے تو ان کا اعتراض بھی وہی ہوتا ہے جو قومِ شعیبؑ نے پیش کیا تھا۔

بہر حال،بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیش کردہ قرآنی فلاحی نظام (دین اسلام) کے قیام کے لیے دل میں ایمان اجاگر کرنے کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ چلتے پھرتے،اٹھتے بیٹھتے،روزمرہ کے معاملات کرتے ہر وقت اللہ تعالیٰ کے پیش کردہ ضابطہ حیات اور اس کے احکامات ذہن میں رہیں،ایسے اجتماعات منعقد کیے جائیں کہ تعلیماتِ قرآنی اور انسانی فلاحی نظام کے قیام کے اغراض و مقاصد،طریقہ کار،نتائج اور دیگر احکاماتِ خداوندی لوگوں کے دلوں پر نقش ہوتی جائیں،انہیں خدا کے قوانین یوں ازبر ہو جائیں کہ ہر دنیاوی معاملہ کرتے وقت انکے سامنے فوراً متعلقہ حکمِ خداوندی آجائے اور کبھی بھی وہ خدا کو بھولنے نہ پائیں۔(اقامتِ صلوٰۃ کے اس وسیع ترین قرآنی تصور کی مزید تفاصیل جاننے کے لیے آپ میری ایک کتاب 'نمازوں کو الوداع'' کا مطالعہ کرسکتے ہیں''۔

قرآن فہمی کے تربیتی وتدریسی اجتماعات منعقد کرنے کا ایک بڑا فائدہ

قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کا ایک بہت بڑا نتیجہ بتادیا ہے کہ:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (سورہ العنکبوت۔آیت 45)

اور صلوٰۃ قائم کرو۔یہ ایک حقیقت ہے کہ صلوٰۃ بخل اور کنجوسی (الفحشاء) سے روکتی ہے اور عقل بے باک کی اس اندھا دھند پیروی سے روک لیتی ہے جن کی وجہ سے انسان سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لینے کی فکر میں لگا رہتا ہے (منکرات)۔

دیکھئے صلوٰۃ کا ایک عظیم مقصد بیان کیا جارہا ہے کہ اس سے افرادِ ملت اندھا دھند دولت سمیٹتے جانے کی قارونی ذہنیت سے بچ جاتے ہیں۔عقل انسان کو مجبور کرتی ہے کہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لو۔کل کو نہ جانے تم پہ کیسا وقت آئے،اس لیے اسکے مقابلہ کے لیے تم جائز وناجائز، ہر ذرائع سے خوب روپیہ سمیٹ لو۔

اجتماعاتِ صلوٰۃ اور انسان کو قرآن کے معاشی نظام سے آگاہ کرتے جانے کی ٹریننگ (اجتماعاتِ صلوٰۃ) اسے سب کچھ اپنے لیے سمیٹتے جانے کے لالچ سے دور رکھتی ہے اور ایتائے زکوٰۃ کے ذریعہ انسانیت کی نشوونما کے لیے سب کو رزق بہم پہنچانے اور سب کی فکر کرنے کی رغبت دیتی ہے۔یعنی قیامِ صلوٰۃ سے انسان کی ذہنیت ہی تبدیل ہوجاتی ہے،اس کے قلب ونگاہ میں عظیم انقلاب واقع ہوجاتا ہے۔کل تک جو انسان سوچتا تھا کہ جائز وناجائز، ہر ذرائع سے اپنے لیے پیسہ سمیٹ لے۔کسی طرح اس کا بنک بیلنس دوست احباب سے بڑھ جائے اور اس کی دولت کا کوئی شمار نہ ہو،قیامِ صلوٰۃ کے بعد اسی انسان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ دنیا میں مفلسی اور غربت پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں،وہ چاہتا ہے کہ اس دنیا میں معاشی مساوات قائم ہوجائے،وہ اپنے لیے کم سے کم رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی امداد میں مسرت واطمینان محسوس کرتا ہے،وہ کسی غریب کے بچوں کو روتا بلکتا نہیں دیکھ پاتا۔اسے سرمایہ دار سے نفرت ہوجاتی ہے۔

قرآنی تعلیمات کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی عقل کو وحی کے تابع رکھا جائے،اسے اندھے جذبات کا غلام نہ بننے دیا جائے۔جیسا کہ گزشتہ ابواب میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کہتا ہے اگر انسان کو آوارہ اور بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹ لینے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔اسکی ہوس کی آگ کبھی بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔اسکی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پیسہ جمع کرتا رہتا ہے اور پھر بھر جانے پر تھیلی کا منہ اوپر سے بند کردیتا ہے۔وَجَمَعَ فَأَوْعَى (سورہ المعارج۔آیت 18)۔اس کی بھوک مٹتی ہی نہیں۔إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً (سورہ المعارج۔آیت 19)۔اور جب اس سے کچھ چھن جاتا ہے تو چیختا چلاتا ہے،شور مچاتا

ہے۔وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا(سورہ المعارج۔آیت 21)۔

یہی وہ چیز ہے جس کا علاج قرآن ذہنیتوں کی تبدیلی بتاتا ہے،اور ذہنیت کی تبدیلی کے لیے مستقل بنیادوں پر انسانوں کی تعلیم وتربیت،تدریس،اصلاحی اجتماعاتِ صلوٰۃ منعقد کرنے کا حکم ہے۔یہ ذہنیت عام لوگوں کی ہے۔لیکن جو انسان اس ذہنیت سے بچ جاتے ہیں،وہی نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔

إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ(سورہ المعارج۔آیات 23-22)

یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جو اجتماعاتِ صلوٰۃ منعقد کرنے اور لوگوں کی تدریس وتربیت سے آتی ہے،اس تبدیلی سے انسان اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہم جن صلاحیتوں سے کماتے ہیں،وہ ہماری پیدا کی ہوئی نہیں،اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ہم ان صلاحیتوں سے جو کچھ کماتے ہیں،اس کے ہم واحد مالک نہیں،ہمیں اس کی تقسیم اسی اللہ کی مرضی سے کرنی ہے جس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم نے یہ سب کمایا ہے۔یعنی ہماری کمائی میں ہر ضرورتمند (سائل) اور محروم کا حق ہے۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (سورہ المعارج۔آیت 25-24)

یہی وہ تبدیلی ہے جو انسان کو صحیح معنوں میں ''مصلی'' بناتی ہے۔مصلی وہ نہیں جو پانچ وقت مسجد جا کر سجدہ دے آئے اور اسکی کیفیت یہ ہو کہ سب کچھ اندھا دھند اپنے لیے سمیٹتا جائے،ہر جائز وناجائز ذرائع سے پیسہ کماتا جائے۔بلکہ مصلی وہ ہے جو اپنے اندر یہ انقلابی تبدیلی پیدا کر لے جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہنم میں جانے والوں کا جرم بتایا گیا ہے۔یہاں بھی صلوٰۃ کا معاشیات سے گہرا تعلق واضح ہوتا ہے۔جب جہنم والوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ایسا کونسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تم یہاں آئے؟ دیکھئے وہ کیا جواب دیں گے:

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ(سورہ المدثر۔آیت 43)

ہم مصلین نہیں تھے۔یعنی

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ(سورہ المدثر۔آیت 44)

ہماری حالت یہ تھی کہ معاشرہ میں جو لوگ معاشی حرکت اور کمائی کی صلاحیت سے محروم ہو گئے تھے،جن کی روزی روٹی کا پہیہ رک گیا تھا،ہم انکی روٹی کے لیے کوئی انتظام نہیں کرتے تھے،انہیں سامانِ پرورش نہیں فراہم کرتے تھے۔

وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (سورہ المدثر۔آیت 45)

البتہ ہم لوگ باتیں بہت بناتے تھے۔ بڑے بڑے وعظ کیا کرتے تھے، (لیکن عملی طور پر زیرو تھے)۔

سورہ ماعون میں بھی ایسے دو نمبر "مصلین" (صرف نمازیں پڑھنے والے) کے لیے خوفناک تباہی کا پیغام دیا گیا ہے۔ سنئے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ (4) الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (5) الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ (6) وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ

پس تباہی و بربادی ہے ایسے مصلین کے لیے جنہیں پتا ہی نہیں کہ صلوٰۃ ہوتی کیا ہے (غفلت میں صرف نماز کو ہی صلوٰۃ سمجھ رہے ہیں)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں اور رزق کے سرچشموں پر بند باندھ کر، ارتکازِ دولت کے ذریعہ انسانیت کی ایک کثیر آبادی کو انکے بنیادی رزق سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔

یہ آیات صرف نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو دیندار سمجھ لینے والے بے خبر لوگوں کے لیے ایک بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے جو لاعلمی اور میں دین کی تکذیب میں مصروف ہیں اور اپنے لیے تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

ہر قوم پکارے گی ہمارا ہے قرآن:

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت پر ایمان لاتے ہوئے قرآن کے اس عظیم نظام کو قائم کرنا چاہیں گے اور اس راہ کو اختیار کریں گے۔ یہ نظام ایسا نہیں ہوگا کہ لوگوں پر جبری طور پر ٹھونسا جائیگا۔ انکے دل و نگاہ میں وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر کشادگی پیدا ہو جائیگی کہ یہ اپنے واجبات کو خود اپنے اوپر لاگو کریں گے، یہ نظام ایسا ہوگا کہ ہر دل کی دھڑکن بن جائیگا۔ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ (سورہ الدھر۔آیت 7)۔ انہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ اگر ہم نے اس قسم کا معاشرہ قائم نہ کیا تو اسکی جگہ پھر غلط معاشرہ قائم ہو جائیگا جس میں برائی اتنی عام ہو جائیگی کہ لوگ بچنا بھی چاہیں تو اس سے بچ نہ پائیں گے۔

وَيَخَافُونَ يَوْماً كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيراً (سورہ الدھر۔آیت 7)

اس کے لیے لوگ اپنی خوشی سے اس بات پر آمادہ ہونگے کہ اپنے معاشرہ کے ان لوگوں کی روزی روٹی کا انتظام کریں جنکی معیشت کا پہیہ رک گیا ہو (مسکین) یا جو معاشرے کے اندر رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کریں، اور انکا کوئی والی وارث نہ ہو (یتیم)، یا جن میں معاشی حرکت تو ہو مگر وہ دیگر مسائل میں اس قدر گھر جائیں کہ ترقی و خوشحالی کی شکل نہ دیکھ پائیں (اسیر)۔

جماعتِ مومنین یہ سب کام کسی بھی صلہ یا ستائش کی خواہش کے بغیر کرے گی۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (سورہ الدھر۔آیت 9)

دین ہے ہی بنی نوع انسان کی پرورش وفلاح کا نام، جو یہ فرائض سرانجام نہیں دے گا، وہ دین کا منکر اور کافر ہے۔

قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ ''دین'' سے مراد انسانی فلاحی معاشی نظام کا قیام ہے۔اور اسکا بنیادی ذریعہ صلوٰۃ ہے۔جو یہ نظام قائم نہیں کرے گا، وہ دین کو جھٹلاتا ہے۔اور جو شخص صلوٰۃ سے صرف نماز پڑھنا مراد لیتا ہے، اور افرادِ معاشرہ کی پرورش اور غرباء کا خیال نہیں رکھتا، اسکی یہ صلوٰۃ اس کے لیے تباہی اور عذاب کا باعث بن جاتی ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ

کیا تم نے ایسے شخص کی حالت پر غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے؟

فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ

یہ (دین کا منکر) وہ شخص ہے جو معاشرے میں تنہا رہ جانے والے بے سہارا لوگوں کو دھتکارے رکھتا ہے۔خود سے دور رکھتا ہے، اور دوسرے لوگوں کو بھی ایسے محروم ومعذور افراد کی روزی روٹی کا انتظام کرنے کی ترغیب نہیں دیتا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ (4) الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ

پس جس صلوٰۃ کا نتیجہ اوپر بیان کیے گئے نتیجہ سے مختلف ہو، سمجھ لو وہ صلوٰۃ ان مصلین کی تباہی کا باعث ہے۔انہیں پتا ہی نہیں کہ صلوٰۃ ہوتی کیا ہے۔

دیکھئے جب ایک معاشرہ صلوٰۃ کو بالکل ہی ترک کر دے تو اس سے کم از کم یہ احساس تو ہوتا ہے کہ ہمارے مسائل اور بربادی کا باعث یہ ہے کہ ہمارے ہاں صلوٰۃ موجود ہی نہیں۔لیکن جب صلوٰۃ کو ''رسم نماز'' میں ہی تبدیل کر دیا جائیگا تو اس سے زیادہ تباہی وبربادی واقع ہوتی ہے۔کیونکہ ہر کسی کو جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ ہم صلوٰۃ کے پابند ہیں اور معاشرہ کی جو خراب حالت ہے، اس کا ذمہ دار کوئی اور چیز ہے۔ہماری صلوٰۃ نہیں۔یہ خوش فہمی زیادہ تباہ کن ہے۔یہ ہیں وہ مصلین جن کی صلوٰۃ دیکھنے میں صلوٰۃ نظر آتی ہے، مگر حقیقت میں وہ صلوٰۃ ہوتی نہیں، کیونکہ وہ صلوٰۃ صلوٰۃ ہی نہیں جس میں انسانیت کی فلاح و بہبود کا کوئی کام ہی نہ ہو۔

الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ

پس یہ دکھاوے کی صلوٰۃ ہے (جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا، نہ دنیا میں نہ آخرت میں) (مزید سورہ الانفال۔آیت 38)

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُون

ایک طرف انکا پورا زور نمازوں پر ہوتا ہے، پانچ وقت مسجد حاضری دیتے ہیں، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھو کیا ہے، یہ ہر جائز و ناجائز ذرائع سے دولت کے انبار لگاتے چلے جاتے ہیں، اتنا زیادہ رزق سمیٹ لیتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی ایک کثیر آبادی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جاتی ہے۔ کیونکہ رزق کے وہ سرچشمے جو آبِ رواں کی مانند بہنے چاہیے تھے، ان پہ یہ نمازی بند باندھے بیٹھے ہوتے ہیں۔ انکی حالت یہ ہے کہ مسجد کے اندر بہت خضوع و خشوع سے سجدے کر رہے ہوتے ہیں، لیکن جونہی باہر نکلتے ہیں، غریب مسکین لوگوں کو دھکے دیتے اور ڈانٹ پلاتے نظر آتے ہیں۔

محلے میں کوئی بیوہ عورت چاہے اپنے چار چار پانچ پانچ بچوں سمیت فاقہ کشی پر مجبور ہو، لیکن انکے پڑوسی حاجی صاحب دو دو تین تین بار حج عمرے کر آتے ہیں، پڑوس میں آس پاس کوئی شخص بیشک ساری رات بھوکا رہے، لیکن اسی جگہ کسی کے بچے کی پرتکلف دعوتِ ''روزہ کشائی'' چل رہی ہوتی ہے۔ یعنی اس معاشرے میں کسی کے بچے کو سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تو کسی کے جانور بھی سیبوں کے مربے کھاتے ہیں۔ یہی معاشرہ دین کا منکر اور جہنمی معاشرہ ہے اور یہی وہ نمازی ہیں کہ دہکتی ہوئی جہنم کی آگ انکا انتظار کر رہی ہے۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَا وَأَغْلَالاً وَسَعِيراً (سورہ الدھر۔ آیت 4)

یہ تو تھے جھوٹے مومنین یا جھوٹے مسلمان۔ اب قرآن نے سچے مومن کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ (سورہ المومنون۔ آیت 4)

(جیسا کہ اس کتاب میں اگلے حصہ میں زکوٰۃ کے عنوان کے تحت بھی وضاحت سامنے آئے گی)، آیت بالا میں للزکوٰۃ فاعلون نے معاملہ کس طرح واضح کر دیا ہے کہ زکوٰۃ ایک ایسا پروگرام ہے جس کی انجام دہی جماعتِ مومنین کے ذمہ ہے۔ یہی وہ مقصدِ عظیم ہے جس کے لیے ان کی حکومت وجود میں آتی ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي

(سورہ النور۔ آیت 55)

اللہ تم میں ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کرتا ہے جو اللہ کا دیا ہوا فلاحی نظام قائم کر کے اپنی ذات اور معاشرہ کی

اصلاح کرلیں گے، کہ انہیں دنیا میں اقتدار و استخلاف سے نوازا جائیگا جس طرح ان سے قبل ازیں اقوام کو نوازا جاتا رہا ہے، اور ان کے اس نظام زندگی کو مستحکم کر دیا جائیگا جس نظام زندگی (دین) کو ہم نے انکے لیے پسند کیا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے خوف کی حالت امن اور سکون سے بدل جائیگی اور وہ پورے اطمینان سے ہمارے قوانین کی اطاعت کرسکیں گے (یعبدونی)۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (سورہ الحج۔ آیت 41)

یہی (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے اور بنی نوع انسان کی پرورش کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

اس آیت میں دو نکات قابل غور ہیں۔ ایک تو ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ اس وقت ہی ادا ہو پائے گا جب ان کی اپنی ریاست قائم ہوگی، ظاہر ہے کہ اگر زکوٰۃ سے مراد خیرات دینا ہو تو اس کے لیے اپنی حکومت کی تو ضرورت ہی نہیں، یہ تو کفار کی حکومت میں بھی دی جاسکتی ہے۔ مسلمان بھی انگریز دور میں یہ ''زکوٰۃ'' دیتے تھے، اور اب بھی انڈیا میں مسلمان وہاں یہ خیرات زکوٰۃ کے نام پر دیتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایتائے زکوٰۃ سے مراد چند روپوں کی خیرات دینا نہیں، بلکہ اس سے مراد ایسا نظام حکومت قائم کرنا ہے جس کا مقصد بنی نوع انسان کے لیے سامانِ نشوونما اور یکساں رزق فراہم کرنا ہو۔

دوسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی ریاست زکوٰۃ ''دے گی''۔ یعنی اس حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہوگا، زکوٰۃ لینا نہیں۔ جو ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ زکوٰۃ وصول کرے تو یہ تصور زکوٰۃ کے قرآنی تصور کے خلاف ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ اسلامی حکومت کا فرض زکوٰۃ دینا (ایتائے زکوٰۃ) ہے، نہ کہ لوگوں سے زکوٰۃ دینا۔

یہ ساری الجھنیں دراصل زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم یعنی انفرادی خیرات کی پیدا کردہ ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث اگلے باب میں آئے گی۔ فی الحال ہم قرآنی نظام کی جانب سفر کے مراحل پر گفتگو جاری رکھتے ہیں۔

عمل پر آمادہ کرنے والے محرکات کی حفاظت و نگہداشت۔ تاکہ لوگوں میں جذبہ ختم نہ ہونے پائے:

معاشرہ کی بنیاد ایسے محرکات پر ہوتی ہے جو آدمی کو ہر وقت عمل پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ تمام افرادِ معاشرہ کی سیرت و کردار میں مستقل مزاجی، استقامت، توازن اور ہم آہنگیِ عمل پیدا کرنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہر اس محرک

(Incentive) کی نگہداشت اور حفاظت کی جائے جو قرآنی نظام پر عمل درآمد کے سلسلہ میں آدمی کو آمادہ بہ عمل کرتا ہے۔اس ضمن میں نہ تو کسی محرک کو کم یا ختم ہونے دیا جانا چاہیے اور نہ ہی اس میں کسی خارجی محرک کی آمیزش ہونی چاہیے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص قرآنی نظام کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے اور اسکو اس میں دلچسپی کم ہو جائے، آپ کو بذریعہ تربیت وتدریس ایسے لوگوں پر قرآنی نظام کی خوبیاں اور خوشگوار نتائج آشکار کرتے رہنا ہوگا۔پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص یا گروہ کسی خارجی عنصر کے لالچ میں آکر یا بیرونی عوامل کی وجہ سے قرآنی نظام پر عمل درآمد اور اجتماعات میں شمولیت سے ہچکچائے یا معذوری کا اظہار کرے، مثلاً جان و مال کا خوف، اندرونی یا بیرونی دباؤ، گھریلو مسائل یا کوئی اور وجہ۔ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام اراکین جماعت اور افرادِ معاشرہ سے مستقل رابطہ میں رہ کر انکے مسائل اور تحفظات کو دور کرتے رہنا چاہیے اور بذریعہ تعلیم وتدریس ان پر یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیے کہ انکی انفرادی واجتماعی فلاح و بہبود کا انحصار صرف قرآنی نظامِ معیشت پر ہی ہے۔یعنی لوگوں میں ہر طرح سے محرکات اور جذبہ عمل پختہ سے پختہ تر کرتے جانا چاہیے۔

یہ عظیم قرآنی انقلاب برپا کرنے کے لیے تبدیلی کے اس عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کہ جماعت اپنے اراکین سے اچھے کردار اور قرآنی رنگ میں رنگے جانے کا مطالبہ تو کرے، لیکن جن محرکات پر انکے کریکٹر بلڈنگ کی بنیاد ہے، انکا ہی خیال نہ رکھا جائے۔یعنی اپنے احکامات کی اطاعت ایسے افراد سے کروائے جو اپنے فطری تقاضوں کے برخلاف اس پہ عمل پر مجبور ہوں۔انہیں اس میں اپنی فلاح و بہبود کا عنصر دکھائی ہی نہ دے رہا ہو۔کسی بھی نظام کی کامیابی کا دارومدار صرف اور صرف اس بات پر ہے کہ وہ نظام اپنے لوگوں کو کیا جذبہ محرکہ فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ عمل پر آمادہ ہیں۔

اجتماعاتِ صلوٰۃ اس ہم آہنگی اور تمام معاشرتی اکائیوں میں فکر وعمل کی یکسانیت پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، بشرطیکہ ان اجتماعات کو ہر ممکن حد تک موثر ترین بنایا جائے۔

قرآنی نظام کی بنیاد جن جذباتِ محرکہ پر رکھی گئی ہے، وہ کس قدر پائیدار، مستحکم اور علم وبصیرت پر مبنی ہیں جس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن قیامِ صلوٰۃ کے ساتھ افرادِ معاشرہ کو اپنی کمائی منفعتِ عامہ کے لیے کھلی رکھنے (انفاق) کا درس بھی دیتا ہے۔یعنی ایسے مواقع سامنے لائے جاتے ہیں کہ لوگ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردیں۔قرآن میں اس کام کے لیے ''فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح آئی ہے۔

صدقہ، خیرات وغیرہ کی صورت میں جس قدر احکامات آئے ہیں، یہ عبوری دور کے لیے ہیں، یعنی ابھی قرآنی نظام اپنی مکمل

شکل میں قائم نہ ہوا ہو لیکن اس کے قیام کی کوشش کی جارہی ہو۔اس دور میں افراد کی تربیت یوں کی جاتی ہے کہ معاشرہ آہستہ آہستہ اپنی آخری شکل تک پہنچا جائے۔پس انہیں اس وقت سکھایا یہ جاتا ہے کہ اپنے لیے بھی رکھو اور انسانیت کے اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے بھی دو۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (سورہ الفرقان۔آیت 67)

وہ لوگ جو راہِ خدا میں دیتے ہیں (انفاق) تو ان کی روش ایسی نہیں ہوتی کہ کسی ایک ہی جگہ ضرورت سے زائد خرچ کر دیا جائے اور دوسرے شخص کی ضرورت رکی رہ جائے، بلکہ یہ ہر جگہ اعتدال سے انفاق کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرمان ہے کہ:

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 26)

اور قرابت دار کو اسکا حق دو، اور مسکین کو بھی۔اور ایسے مسافر کو بھی جس کے پاس سامان نہ ہو، اور مال کو بلاوجہ (فضول خرچی) صرف مت کرو۔

یہ وہ دور ہے جس میں کہیں محتاج اور غریب کی خفیہ اور اعلانیہ امداد کرنے کی تلقین کی جاتی ہے (سورہ البقرہ۔آیت 271)، کہیں حکم دیا جاتا ہے کہ دولت کو گردش دیتے رہو لیکن اس انداز سے کہ وہ صرف امیروں کے درمیان ہی نہ پھرتی رہے (سرمایہ کاری)

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (سورہ الحشر۔آیت 7)

کہیں انہیں دولت جمع کرنے کے ہلاکت خیز نتائج سے ڈرایا جاتا ہے۔(سورہ التوبہ۔آیت 24)

کہیں رباء خوری کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے۔(سورہ البقرہ۔آیت 275)

قارئین، انہی تدریجی احکامات سے افرادِ معاشرہ میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں ذاتی املاک بنانے اور جائیدادیں کھڑی کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔مثلاً:

(i) زمین کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔کیونکہ ''سواءللسائلین'' کے مطابق وہ تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یکساں طور پر کھلی رہے گی۔پس زمینیں خرید خرید کر زمینداری اور جاگیرداری کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

(ii) جب زمین پر ذاتی ملکیت ہی نہیں ہو سکتی تو ظاہر ہے مکانات کرائے پر دینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔جب زمین ہی نہیں ہوگی تو مکانات کہاں بنائے جائیں گے؟ مکان اپنی ذاتی رہائش کے لیے درکار ہوتا ہے، پس اس کی ذمہ داری خود

ریاست نے لے رکھی ہے۔اسی طرح زمین کو بھی مزارعت پر دینے کی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔

(iii) روپیہ پیسہ جمع نہیں کیا جا سکتا۔اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔نہ ہی اسے کسی قسم کی سرمایہ کاری کے ذریعہ طبقہ امراء میں گردش دی جا سکتی ہے۔

(iv) اپنی ضروریات پوری کرنے کے سلسلہ میں نہ تو اسراف کیا جا سکتا ہے نہ کنجوسی۔نہ ہی زائد از ضرورت خرچ کیا جا سکتا ہے نہ بخل کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔

(v) کسی کو روپیہ قرض دے کر اس سے سود نہیں لیا جا سکتا۔

قارئین اب خود ہی اندازہ کر لیجیے کہ اب کسی کے پاس زائد از ضرورت روپیہ ہو تو ان احکام کی موجودگی میں وہ اس روپے کا کیا کرے گا؟ یہ روپیہ تو اس کے لیے مصیبت بن جائیگا۔کیونکہ قرآنی احکامات کی رو سے روپیہ مرتکز کرنے یا جمع کرنے کی تو کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ اس روپیہ سے افراد نئی فیکٹریاں لگا سکتے ہیں، تجارت کر سکتے ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان فیکٹریوں اور تجارت سے جو روپیہ مزید پیدا ہوگا، اسکا کیا ہوگا؟ بات تو پھر وہیں پر آ گئی۔کہ انفرادی سرمایہ کاری بھی دولت کے ارتکاز کا ایک ذریعہ ہوگی۔(آخری باب میں اس موضوع پر بھی گفتگو پیش کی جائیگی)۔

قصہ مختصر، قرآن نے ان احکامات کے ذریعہ افراد کے پاس زائد از ضرورت روپیہ رکھنے کی کوئی جگہ ہی باقی نہیں چھوڑی۔جہاں تک افرادِ معاشرہ کی ضروریات کا تعلق ہے، وہ ریاست نے اپنے ذمہ لی ہوئی ہونگی۔یہ اسکی ذمہ داری ہے۔ ریاست افراد سے سب کچھ لے لینے کا مطالبہ صرف اسی وقت کر سکتی ہے جب وہ اس پوزیشن میں ہو کہ تمام افرادِ معاشرہ کو زندگی کی ضروریات فراہم کر سکے۔یہی وہ حتمی مقام ہے جسکی جانبِ مومنین کا قافلہ آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے۔

ذہنوں کو انفرادی کی بجائے اجتماعی زندگی گزارنے کا خوگر بنانا:

اس عملی تعلیم کے ذریعہ افرادِ معاشرہ میں ایسی ذہنی تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے کہ وہ انفرادی مفادات دیکھنے کی بجائے اجتماعی مفادات پر نظریں جمائے رکھتے ہیں۔اور حال کی کشش و جاذبیت کے باوجود اپنی کاوشیں انسانیت کے مستقبل اور اجتماعی مفادات کے لیے صرف کرتے ہیں۔

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ (سورہ البقرہ۔آیت 177)

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً (سورہ الدھر۔آیت 8)

اس سے آہستہ آہستہ ان کی حالت یوں ہو جاتی ہے کہ:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ(سورہ الحشر۔آیت 9)

وہ خودتنگی کی حالت میں گزارا کر لیتے ہیں، لیکن دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح ضرور دیتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں ،کامیابی جن کے قدم چومے گی۔

جب ایسی تبدیلی انسانوں کی قلب ونگاہ میں پیدا ہو جاتی تو پھر وہ مقام آجاتا ہے جہاں یہ جماعت اس مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لیے نمایاں طور پر میدان میں آجاتی ہے جو اس جماعت کا شروع دن سے نصب العین رہا ہے۔یا آجکل کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ ایک منظّم اور مشہور پارٹی کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔اس لیے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی معاشرہ میں اس وقت تک انقلاب برپا کرنا ناممکن ہے جب تک اس کام کے لیے ایک عدد جماعت یا پارٹی موجود نہ ہو۔انسانیت کا ارتقاء اور فلاح و بہبود کے نظام کا قیام ایک گروپ ہی کے ذریعہ عمل میں لایا جاسکتا ہے۔یہ گروپ یا جماعت دیگر افرادِ معاشرہ پر اثر انداز ہو کر انکی رہنمائی کرتا ہے۔

لیکن یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس مخصوص جماعت یا پارٹی کی تشکیل جبر و استبداد اور ڈنڈے کے زور پر نہیں ہونی چاہیے،اور نہ ہی اس کی تشکیل یا تشہیر و معاونت میں کسی عہدے،روپے یا شہرت کا لالچ پیش نظر ہونا چاہیے۔یہ پارٹی صرف اور صرف ان افراد پر مشتمل ہوگی جو برضا و رغبت،بخوشی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور پرورش کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے چکے ہونگے۔اس جماعت میں صرف وہی لوگ شامل ہونگے جن کے دل ونگاہ میں انقلابی تبدیلی پیدا ہو چکی ہوگی،اور اس تبدیلی کا اثر ان کی اجتماعیت اور مشترکہ فکر و عمل کی صورت میں نمایاں طور پر نظر آئے گا۔انکے جذبات میں ہم آہنگی واقع ہوگی اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اصلاحِ معاشرہ اور انقلاب کی بلند و بالا عمارت اٹھتی ہے۔

اس جماعت یا پارٹی کے تمام اراکین کے قلوب و اذہان میں فکری و عملی ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا ہونا اور اسکا برقرار رہنا انتہائی انتہائی ضروری ہے۔اس کے بغیر یہ کامیاب نہیں ہو سکتے نہ یہ کسی قسم کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں جو غلطیاں اور شبہات پیدا ہوتے ہیں،انکی زیادہ تر وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کے ماتحت زندگی گزارتے ہیں۔اگر ان سب کے جذبات میں باہمی ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ

ایک دوسرے کو بالکل درست سمت میں سمجھنے لگ جائیں گے۔

اس قسم کے افراد کا یکجا ہو کر اس عظیم مقصدِ حیات اور نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا نام ہی اجتماعی جماعتی زندگی ہے۔ کامیاب اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ اس میں ہر فرد دوسرے فرد کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے، ایک کی غلطی سب کی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ یہی انکا قانون ہوتا ہے اور اس قانون کی بنیاد بہت محکم اور ٹھوس ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ اس جماعت میں جو کچھ بھی ایک رکن کا ہوتا ہے، وہ سب کا ہوتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی کہا گیا کہ:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ (سورہ الحجر۔آیت 94)

قانون خداوندی کے مطابق دوسروں سے الگ ہو کر اپنی جماعت کی جداگانہ تشکیل کر لیجیے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (سورہ الحجر۔آیت 88)

جو لوگ اس نئے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے تیار ہیں، انہیں اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لو۔ اکٹھے کر لو۔

تمہارے اس تصادم میں جو تمہارا مفاد پرست لوگوں سے ہونے والا ہے، ذرا بھی پریشان نہ ہونا۔ کیونکہ:

حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ الانفال۔آیت 64)

اے رسول۔ خدا کا یہ قانون تیرے لیے بھی کافی ہے اور جماعتِ مومنین کے لیے بھی جو تیری اتباع کرتی ہے

یوں ایک نیا انقلابی معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں ہر ہر فرد کی زندگی کا نصب العین صرف اور صرف اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو پیدا کر کے تمام انسانوں کی پرورش وفلاح و بہبود ہوتا ہے۔ یہی وہ بلند ترین اور مشترکہ نصب العین یا منشور ہوتا ہے جس کے تحت افرادِ معاشرہ اپنے مرکز کے ساتھ ایک معاہدہ کرتے ہیں جس کے تحت افرادِ معاشرہ اپنی جان و مال سب کچھ اس مرکز کے سپرد کر دیتے ہیں جو قرآن کے عظیم معاشی فلاحی نظام کے قیام کا ضامن ہوتا ہے۔ اور اس کے بدلے مرکز انہیں ''جنت'' کی ضمانت دے دیتا ہے۔ یعنی ایک خوشگوار زندگی کی ضمانت:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (سورہ التوبہ۔آیت 111)

(اجتماعی نظام میں ریاست اور افراد معاشرہ کے درمیان اس معاہدہ پر تفصیلی گفتگو باب سوم میں پیش کی جا چکی ہے۔)

اس نظام کے قیام کے بعد تجارت میں انفرادی نفع کمانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی

اب جبکہ قرآنی نظامِ معیشت قائم ہو چکا ہوگا، ریاست کے اربابِ اقتدار دین پر عمل کرتے ہوئے تمام انسانیت کی پرورش و نشوونما میں مصروف عمل ہونگے اور تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر لے گا تو کسی فردِ واحد کو بھی نہ روپیہ اپنے پاس جمع کرنے کی ضرورت ہوگی، نہ اسے زمین جائیداد بنانے کا خیال آئے گا۔ اس وقت تجارت میں منافع کمانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ منافع تو ایک وقت، تجارت کا موجودہ نظریہ ہی تبدیل ہو جائیگا۔ اس وقت اشیاءِ ضروریہ تیار کرنے والے انہیں تیار کرتے جائیں گے، اور جنہیں انکی ضرورت ہے، ان تک یہ اشیاء پہنچا دی جائیں گی۔ اشیاء بنانے والے اور استعمال کرنے والے دونوں کے رزق کی ذمہ داری ریاست کے ذمہ ہوگی۔ ہمارا موجودہ معاشرہ اپنی پیدا کردہ مصیبتوں سے تنگ آ کر زیادہ سے زیادہ اس سوچ تک پہنچتا ہے کہ زر کی بجائے اجناس کا مبادلہ یعنی بارٹر سسٹم بہتر ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں کہا یہ بھی جاتا ہے کہ اس سسٹم کے تحت جن اشیاء کا تبادلہ کیا جائے، وہ قیمت میں برابر ہونی چاہیں۔

لیکن اس میں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں کو متعین کیسے کیا جائے؟ مثلاً بڑھئی نے ایک کرسی تیار کی ہے جسے وہ دوسرے کے ہاتھ گندم کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے، اب یہ کیسے متعین کیا جائیگا کہ کس قدر گندم اس کرسی کی قیمت کے برابر ہے؟

اب جس معاشرہ میں بڑھئی اور گندم فروخت کرنے والے کسان کے رزق کی ذمہ داری ریاست پر ہوگی، اس میں قیمت کا سوال ہی پیدا نہی ہوگا۔ وہاں سوال پیدا ہوگا ضروریات کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام معیشت کی اس آخری اور حتمی سٹیج میں پہنچ کر تجارت کا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ اس میں تجارت سے مراد صرف ''اشیائے ضرورت کی مناسب تقسیم''۔ جبکہ اس نظام کی اکائیوں کی ضروریاتِ زندگی ریاست کی جانب سے مہیا ہوتی رہتی ہیں۔ یہی ان کا منافع کہلائے گا۔

پھر اس نظام کی حتمی سٹیج میں محنت کشوں اور مزدوروں کی اجرتیں مقرر کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ وہ سب اپنی اپنی استعداد کے مطابق وہ کام کریں گے جو ریاست انکے ذمہ لگائے گی (اطیعوالرسول واولی الامر منکم) اور ریاست اس کے بدلے میں انکی ضروریات پوری کرتی جائیگی۔ یہی انکی محنت کی اجرت ہوگی۔

قرآنی نظام کی کامیابی: محیرالعقول کارنامے دکھاتا انسان:

قارئین اب آپ ذرا غور کیجیے کہ قرآن کے معاشی نظام ربوبیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا تھی؟ یہی نہ کہ انسان ڈرتا تھا کہ اگر اس نے اپنی کمائی دوسرے کو دے دی تو اس کا کیا بنے گا؟ کل کو برا وقت آیا تو اسے کون پوچھے گا؟ لیکن قرآنی

نظام نے انسانی عقل کو یقین دلا دیا کہ تم کل کے لیے پریشان مت ہو۔تمہارے اور تمہاری اولاد کے مستقبل اور رزق کی ذمہ داری ریاست کی ہے۔تم کیوں فکرمند ہوتے ہو؟تمہیں روپیہ جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔اپنی پوری صلاحیتوں سے وہ کام سرانجام دو جو ریاست نے تمہارے ذمہ لگایا ہے،اور تمہارا رزق اور تمہارے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ریاست کا کام ہے،اسی پر چھوڑ دو۔اگر کل کو تمہارے ساتھ کوئی حادثہ بھی پیش آ جاتا ہے اور تم اس دنیا میں نہیں رہتے یا کام کرنے سے معذور ہو جاتے ہو تو بھی ریاست تمہارے گھر کو ماں کی طرح پالے گی۔تمہیں پریشانی کی ضرورت ہی نہیں۔البتہ جب تک تم جوان ہو، چاک و چوبند ہو، کام کرنے کی صلاحیتیں رکھتے ہو، کام کرو۔اپنی صلاحیتوں سے اس دنیا کے حسن و جمال میں اضافہ کرو۔جو کچھ تم بننا چاہتے ہو،بن کر دکھاؤ،اس منزل تک پہنچنے کے لیے تمہاری جو بھی ضروریات ہونگی،وہ ریاست پوری کرے گی۔

اگر تمہیں کوئی گھریلو مشکل پیش آئے ،بیماری کا سامنا ہو،قدرتی آفت سے واسطہ پڑ جائے یا کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جائے تو تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔تم خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔ریاست تمہاری سرپرست ہے۔یہ تمہاری مشکل حل کرے گی۔

دیکھئے قارئین اس عظیم الشان قرآنی نظام کے قیام سے انسانی عقل کتنی بڑی فکر سے آزاد ہو گئی۔کیسے کیسے جھنجھٹ ختم ہو گئے۔

آپ خود تصور کیجیے کہ اگر ایک انسان اپنے معاش کی فکر سے آزاد ہو جائے اور اسے اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کی طرف سے پوری بے فکری ہو جائے تو وہ دنیا میں کس قدر حیرت انگیز ،محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتا ہے؟؟؟

یہ تو معاشی فکریں ،پریشانیاں ٹینشنز اور مستقبل کے متعلق عدم اطمینان ہے جو اس بیچارے انسان کی توانائیوں، صلاحیتوں اور کرشمات کو دبا دیتا ہے، ختم کر ڈالتا ہے، سلب کر لیتا ہے۔ورنہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ کس قدر بڑی قوتوں کا مالک ہے،انسان اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ وہ اس دنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسا معاشرہ (جس کے افراد کو نہ معاشی فکر ہو، نہ پریشانیاں، نہ مستقبل کے متعلق عدم اطمینان ستاتا رہے، نہ اسے بھوک و افلاس کا خوف ہو) دنیا میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے کہ انسانیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔یہ ایک طوفان کی مانند اٹھے گا اور کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرتا اور انکے فوائد کو انسانیت کی منفعت کے لیے بروئے کار لاتا چلا جائیگا۔کائنات میں چھپے مزید خزانے اسکے ہاتھوں میں آ جائیں گے جس سے انسانیت مزید خوشحال ہوتی چلی جائیگی اور انسان ترقی و عروج کے زینے طے کرتا کرتا اس کائنات کی وسعتوں میں کہاں سے کہاں جا پہنچے گا۔اس کا ہر فرد راستے کی

مشکلات کا یوں سامنا کرے گا جیسے چڑیا اپنے بچوں کی حفاظت کی خاطر سانپ سے بھڑ جاتی ہے۔اسکی راہ میں کائنات کی کوئی قوت یا مشکل ٹک نہیں سکے گی۔

مومن کی تعریف:

دین ایک ایسے پروگرام کا نام ہے جس سے انسان کی دنیاوی زندگی بھی کامیابی وکامرانی کی گزرتی ہے اوراخروی زندگی بھی ابدی سرفرازیوں اورخوشگواریوں سے بھرپورہوتی ہے۔اگرایک جملہ میں دین کی تعریف کرنی ہوتو اسکی حقیقی تعریف یوں ہوگی کہ دین کا نظام یہ ہے کہ فطرت کی تمام قوتوں کوحتی الوسع مسخر کیا جائے تا کہ اس دنیا کی زندگی خوشحالی بھری گزرے۔اورپھر ان قوتوں کومسخر کرنے کے بعد جو کچھ حاصل ہو،اسے اللہ تعالیٰ کے پیش کردہ قوانین کے مطابق منفعتِ انسانی کے لیے صرف کیا جائے۔تا کہ انسان میں خدائی صفات کی نمود ہوجائے اورحیات بعدالموت میں بھی انسانی ذات مزیدارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجائے۔اس لحاظ سے اگردیکھا جائےتو دنیا میں تین قسم کی اقوام پائی جاتی ہیں:

(i)وہ قوم جوفطرت کی قوتوں (ہوا،پانی،معدنیات،پہاڑ،کائنات وغیرہ) کومسخر کرکے انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرے۔اس قوم کی دنیاوی زندگی بھی عیش بھری ہوگی اورعاقبت بھی خوشگوارہوگی۔اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔

(ii)وہ قوم جوکائنات کی قوتوں کومسخر تو کرے،لیکن انہیں اللہ کےقوانین کے مطابق منفعتِ عامہ کے لیے استعمال نہ کرے بلکہ کائنات کی تسخیر انکی مفاد پرستیوں اورہوس کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہو۔اس قوم کودنیا میں تو خوشحالی نصیب ہوجاتی ہے،لیکن انکی عاقبت تاریک ہی رہے گی۔

(iii)وہ قوم جوکائنات اورفطری قوتوں کومسخر کرنے کے لیے کچھ بھی نہ کرے۔ایسی قوم کی دنیاوی زندگی پستی اورذلت بھری ہوتی ہے۔یہ دوسروں کی دستِ نگر ہی رہتی ہے۔جب فطرت کی قوتوں کومسخر ہی نہیں کرتی تو ان قوتوں کواللہ کےقوانین کے مطابق صرف کرنے کا بھی سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔یوں یہ انسانیت کو کچھ نہیں دے پاتی اوران کی آخرت تاریک ہوجاتی ہے۔یہ قوم کونسی ہے؟خودہی سمجھ جائیں۔ہم اگرعرض کریں گےتو شکایت ہوگی۔

ریاست ہوگی ماں کے جیسی:ہرشہری سے پیار کرے گی

یہ اس نظام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انسانیت صرف فکرِ معاش سے ہی آزادنہیں ہوتی،بلکہ اس میں ہرانسان کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ میں جو کچھ بھی دیتا ہوں،اس سے خودمیری ہی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔اس لیے میں جتنا زیادہ دوں

گا ،اتنا ہی میری ذات ارتقاء کی بلندیوں کو چھوتی جائیگی اور میں حیاتِ جاوید حاصل کرلوں گا۔خدا کی صفات کا مظہر بن جاؤں گا۔یہی وہ سوچ ہے جس کی بناء پر وہ زیادہ سے زیادہ دینے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر کے کماتا ہے اوراس عظیم فائدہ کو اپنے ذہن میں ہر وقت سمائے رکھتا ہے۔ضرورت پڑنے پر وہ اپنی جان بھی دے دینے سے گریز نہیں کرتا۔کیونکہ اسے پتا ہے کہ میرے بعد میرے بچے لاوارث نہیں رہ جائینگے۔ریاست انہیں اسی طرح پالے گی جس طرح میں باپ بن کر پالتا تھا۔اور جان دے دینے سے خود میری اپنی ذات ارتقاء کی بلندیوں تک پہنچ جائیگی اور میں حیاتِ جاوداں کا مستحق ہوجاؤں گا۔پس قرآنی نظام کی سربلندی کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل جانا اس فرد کے لیے ایک کامیابی کی کنجی ہوگا۔

قرآنی معاشرہ جس میں افراد مستقبل کی معاشی فکروں سے آزاد ہوں،دنیا میں کیا کچھ نہیں کرسکتا؟آج دنیا اسی بات پر حیران ہوتی رہتی ہے کہ اکیلے محمد ﷺ اورانکے ساتھیوں کی اتنی مختصرسی جماعت نے اتنے مختصرعرصہ میں اس قدر حیرت انگیز ترقی آخر کیسے کر لی؟ کہ اس دور کی دو سپر پاورز ایران اور روم کو روند ڈالا۔وہاں کے بے انتہا خزانے انکے قدموں میں آگرے۔مصر،عراق،یمن ان کے ہوگئے۔یہ سب صرف بیس تیس سال کے مختصر سے عرصہ میں کیسے ہوگیا؟؟؟؟؟ ساری دنیا حیران ہے۔لیکن شاید دنیا جانتی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اورانکے جانثار ساتھیوں کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ انہوں نے ایک ایسا معاشرہ قائم کرلیا تھا جو قرآنی نظامِ معیشت اپنائے ہوئے تھا اور ربوبیت عامہ کی فکر کرتا تھا۔یہ تمام محیرالعقول ترقیاں اسی نظام کا پھل ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جس معاشرہ کے افراد میں نہ موت کا خوف ہو نہ اپنے بعد اپنے بال بچوں اور پسماندگان کے معاش کی فکر،انکی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہوگا؟وہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی عملی تصویر بن جاتے ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا بھر کے 200 امیر ترین افراد کے اثاثہ جات پورے براعظم افریقہ کی جی ڈی پی (خام ملکی پیداوار) سے بھی زائد ہیں۔براعظم افریقہ میں 600 ملین لوگ آباد ہیں۔
www.theodora.com/maps

7 الرباءاورزکوٰۃ (مروجہ نظریات اور قرآنی مفہوم)

زکوٰۃ کا مروجہ تصور

زکوٰۃ قرآن کے معاشی نظام کی ایک جامع اصطلاح ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ کے بارے میں تصور یہ پایا جاتا ہے کہ کسی مالدار شخص کے پاس جب دولت ایک خاص مقدار میں جمع ہوجائے اوراس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ اپنی دولت کا ایک حصہ بطور خیرات دے دے۔ مال کی وہ مقدار جس پر (مروجہ مذہب کے مطابق) ایک سال کا عرصہ گزر جائے، زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔ اسے نصاب کہا جاتا ہے اور جس پر زکوٰۃ واجب ہو، وہ صاحبِ نصاب کہلاتا ہے۔ جبکہ وہ پیمانہ جس سے زکوٰۃ نکالی جاتی ہے، شرح کہلاتا ہے۔ نصاب کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(1) سونا ساڑھے سات تولہ

(2) چاندی ساڑھے باون تولہ

(3) اونٹ پانچ عدد

(4) گائے تیس عدد

(5) بھیڑ بکریاں چالیس عدد

اب ہماری مذہبی پیشوائیت یہ کہتی ہے کہ اگر حکومت اسلامی ہے تو پھر اس پر لازم ہے کہ وہ خود زکوٰۃ وصول کرے۔ لیکن اگر حکومت اسلامی نہیں تو پھر لوگ انفرادی طور پر خود اپنی اپنی زکوٰۃ دیں گے۔ اب یہ کام حکومت خود کرے یا لوگ انفرادی طور پر انجام دیں، زکوٰۃ کو خرچ انہی مصارف پر کیا جائیگا جن کا تعین قرآن نے کردیا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پیش کی جاتی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (سورہ التوبہ۔ آیت 60)

مسافروں کو۔فرض ہے اللہ کی طرف سے۔اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس ترجمہ کو پڑھیے اور دیکھیے کہ کیسے الٹے سیدھے الفاظ جوڑ جوڑ کر ترجمہ کچھ اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو آیت کا مفہوم ہی واضح نہ ہو پائے ۔ ہمارے ہاں مروج انہی ترجموں نے قرآن فہمی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ڈال رکھی ہے۔

آیتِ بالا میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے تو یہ مصارف ''صدقات'' کے بتائے ہیں، جن کا ترجمہ مترجمین ''خیرات'' کرتے ہیں۔ یہ زکوٰۃ کے مصارف تو ہیں ہی نہیں۔ پورے قرآن میں زکوٰۃ کا جہاں بھی ذکر آیا ہے، وہاں صرف لفظ زکوٰۃ ہی مذکور ہے۔اس کے ساتھ کسی قسم کے مصارف کی بات نہیں کی گئی ۔لہٰذا ہماری مذہبی پیشوائیت نے خود ہی زکوٰۃ کا مفہوم تبدیل کر کے اس کے ساتھ وہ مصارف نتھی کر دئے ہیں جن کا تعلق صرف صدقات سے ہے، نہ کہ زکوٰۃ سے۔ یوں زکوٰۃ کے وسیع وعریض مفہوم کو مسخ کر کے اسے چند روپوں کی وہ ''بھیک'' بنا دیا گیا ہے جو کوئی لینا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہے۔

نصابِ زکوٰۃ سے متعلق یہ تمام تفاصیل جو اوپر درج ہیں، کے بارے میں بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی مقرر کی ہوئی ہیں پس یہ غیر متبدل قوانین شریعت کا درجہ رکھتی ہیں۔ (جیسا کہ آگے بتایا جائیگا) ممکن ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے ہی متعین فرمایا ہو، لیکن اگر رسول اللہ ﷺ نے اسے متعین فرمایا بھی تھا تو اپنے دور کے مخصوص حالاتِ معیشت کے تحت ایسا کیا ہوگا۔ان کا منشاء یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ یہ مقداریں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹل بنا دی جائیں۔ مثلاً:

(1) نصاب میں سونے چاندی کا ذکر ہے۔اس زمانہ میں نقدی بے شک سونے چاندی کی شکل میں ہی ہوتی تھی۔لیکن موجودہ دور میں اب نقد مال اول تو سونے چاندی کی شکل میں ہوتا نہیں، بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے۔آج کے دور میں تو مال کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہوتا ہے یا بینک کی ہنڈیوں وغیرہ کی شکل میں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس کچھ روپیہ کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ہوگی تو کس شرح سے ہوگی؟ سونے کی شرح سے یا پھر چاندی کی شرح سے؟ اور اس فیصلہ کے لیے آپ کے پاس کیا سند ہوگی؟

(2) فرض کیجیے کہ آجکل سونے کا ریٹ 60 ہزار روپے فی تولہ ہے جبکہ چاندی کا بھاؤ چھ سو روپے فی تولہ۔اس حساب سے مروجہ نصاب (سونا: ساڑھے سات تولہ، چاندی: ساڑھے باون تولہ) کے مطابق جس شخص کے پاس پینتیس ہزار مالیت کے

چاندی کے زیورات ہونگے ،اس پرتو یہ زکوٰۃ واجب ہو جائیگی ،لیکن جو شخص چھ لاکھ روپے کے سونے کے زیورات ہونگے ، وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار پائے گا۔دیکھئے زکوٰۃ کے مروجہ قانون میں کتنا بڑا سقم موجود ہے۔پینتیس ہزار رکھنے والے پر زکوٰۃ واجب ہورہی ہے جبکہ چھ لاکھ روپے رکھنے والا زکوٰۃ سے بچ رہا ہے۔یہ فرق تو پھر بھی کم ہے۔مروجہ نصاب کی رو سے تو جس شخص کے پاس پینتیس ہزار روپے کی چاندی ہوگی ،اسے تو زکوٰۃ دینا پڑے گی ،لیکن اگر کوئی اٹھائیس گائے کا مالک ہو (نصاب سے صرف دو کم) جن کی مالیت آج کے دور میں تین لاکھ روپے فی جانور کے حساب سے چوراسی لاکھ روپے بنتی ہے،اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی ۔یعنی غریب پر زکوٰۃ واجب ہوگی ،اوراس سے نسبتاً امیر شخص زکوٰۃ سے ''شرعی'' طور پر بچ نکلے گا۔

قارئین معاملہ پرغور کیجیے۔اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ نصاب رسول اللہ ﷺ نے خود مقرر فرمایا تھا تو یہ انہوں نے اپنے دور کے معاشی حالات کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہی کیا ہوگا جب چاندی ،سونے ،مویشیوں وغیرہ کی قیمتوں کا تناسب ایسا ہوگا جس کی رو سے نصاب ہر سطح کے شخص کے لیے یکساں ہو جاتا ہوگا۔

مگر آج تو یہ صورتحال باقی نہیں رہی ۔آج اگر کسی کے پاس پینتیس ہزار روپے کے چاندی کے زیورات ہوں اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ان کو فروخت کر کے سونے کے زیورات بنالے۔یا تین چار گائے بھینس خرید لے تو پھر اس تکنیک سے وہ بھی زکوٰۃ دینے سے بچ جائیگا۔

شریعت کے قوانین ایسے ''پرسقم'' نہیں ہوا کرتے۔اس لیے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ نصاب رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ہمیشہ کے لیے غیر متبدل نہیں تھا۔تاریخ بھی ہمیں بتاتی ہے کہ کچھ اشیاء ایسی بھی تھیں جن پر عہدِ رسالت ﷺ میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تھی ،لیکن خلافتِ راشدہ کے دور میں انہیں زکوٰۃ کی مد میں شامل کیا گیا۔مثلاً تجارتی گھوڑے اور سمندر سے برآمد شدہ ااشیاء کو حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں فہرستِ زکوٰۃ میں شامل کیا۔

پھر مروجہ نصابِ زکوٰۃ کو لے کر ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے۔فرض کیجیے کہ زکوٰۃ کی یہ شرح مقرر ہے اور اس کے مصارف بھی وہی قرآن کے متعین کردہ ہیں ۔اب ظاہری بات ہے کہ اس شرح (اڑھائی فیصد) سے آمدنی بھی ایک محدود حد تک ہو سکے گی ۔اب اگر صورتحال یہ پیدا ہو جائے کہ معاشرہ کی وہ ضروریات جو زکوٰۃ سے پوری کی جاتی ہیں ،وہ اگر زکوٰۃ کی اس حاصل شدہ آمدنی سے زیادہ پڑ جائیں تو پھر کیا کیا جائیگا ؟ایسی صورت حال میں آپ کو یا تو بعض ضروریات کو ویسے ہی چھوڑ

دیناپڑے گا یا پھر تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے آمدن زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور اضافی مد سے حاصل کرنا پڑے گی۔

ان دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ و رسول ﷺ نے جو ہمیں مکمل دین دیا تھا اور اس میں جو زکوٰۃ مقرر کی گئی تھی، وہ ان ضروریات (مصارف) کو ہی پورا نہیں کرتی جن کے لیے اسے متعین کیا گیا تھا۔ پھر ہم اس دین کے متعلق یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ یہ اللہ کا آخری، مکمل اور عالمگیر دین ہے جو ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ غیر مسلموں کے نزدیک ایسی صورتحال میں ہمارا یہ دعویٰ نہایت مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اور صورتحال آج بالکل ایسی ہی ہے۔ زکوٰۃ کی اس شرح سے معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہو پاتی۔ چاہے اس کا استعمال شفاف ہی کیوں نہ ہو۔

ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر حکومت اسلامی ہو تو زکوٰۃ کا حصول اور اس کا خرچ کرنا حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن جب ایسی حکومت نہ ہو تو پھر زکوٰۃ انفرادی طور پر بھی دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زکوٰۃ ایک طرح کی بھیک خیرات ہی ہوگی۔ پاکستان میں بھی ایسی ہی صورتحال ہے۔ زکوٰۃ انفرادی طور پر ہی دی جاتی ہے۔ حکومت کو خود معلوم نہیں کہ زکوٰۃ کی وصولی یا صرف کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک زکوٰۃ کمیٹی مقرر کر رکھی ہے جو کشکول لے کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جس کا دل چاہتا ہے، زکوٰۃ کو فقیروں کی بھیک کی طرح اس کمیٹی کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ اور جو حکومت پر اعتبار نہیں کرتا، وہ خود ہی اپنی زکوٰۃ خرچ کرتا ہے۔ اس کمیٹی سے جس قدر روپیہ حکومت کے پاس آتا ہے، اس کے متعلق یقین دلایا جاتا ہے کہ اسے حکومت کی باقی آمدن سے الگ رکھ کر صرف انہی مصارف پر خرچ کیا جائے گا جو ''مصارفِ زکوٰۃ'' کہلاتے ہیں۔

ایتائے زکوٰۃ: ریاست کے تمام شہریوں کو یکساں طور پر سامان رزق فراہم کرنے کا حکومتی فریضہ

یہ تو تھا کچھ مروجہ تصوراتِ زکوٰۃ کا احوال۔ اب ہم قرآن سے رہنمائی لیتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کا کیا مفہوم بتاتا ہے؟ عربی لغت میں لفظ ''الزکوٰۃ'' کا بنیادی معنی ہے پھلنا پھولنا۔ نشوونما پانا (Growth and Development)۔ مادی نشوونما۔ جسمانی نشوونما۔ یہ اصطلاح خالصتاً مادی نشوونما کے لیے ہے۔ جیسے منی کا قطرہ اپنے قدرتی اصولوں کے مطابق ماں کے پیٹ میں جاتا ہے اور نشوونما پا کر ایک بچے کی شکل میں باہر آتا ہے، اور ایک چھوٹا سا بیج مٹی کے اندر جاتا ہے اور پھر وہاں سے پودا اور پھر پھلدار درخت بن کر اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ یہ ہے اس محسوس نشوونما کی مثال جو ایتائے زکوٰۃ کی غرض و غایت ہے۔ یعنی انسان کی معاشی نشوونما اور پرورش اس انداز سے کرنا کہ اس کے اندر جو بھی صلاحیتیں موجود ہیں، وہ نکھر کر

باہر آ جائیں اور وہ حسنِ معاشرہ میں اضافہ کا باعث بن سکے۔اسکی کوئی بھی ضرورت رکی نہ رہ جائے۔اور یہ قرآنی ریاست کا ایک انتہائی اہم اور بنیادی فریضہ ہے۔

قرآنی نظامِ ریاست کے دو بنیادی ستون ہیں جن پہ یہ ریاست قائم ہوتی ہے۔"واقیمو الصلوٰۃ واٰتو الزکوٰۃ"۔اور قرآن میں بھی یہ متعدد بار اکٹھی استعمال کی جانیوالی اصطلاحات ہیں۔صلوٰۃ کے موضوع پر تو میری ایک مفصل قرآنی تصنیف "نمازوں کو الوداع" کے نام سے موجود ہے۔البتہ یہاں زکوٰۃ کے موضوع پر گفتگو پیشِ نظر ہے۔

زکوٰۃ کے اس قرآنی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے قرآنی نظامِ ریاست جسے حکومتِ خداوندی بھی کہا جاتا ہے، کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ وہ انسانوں سے متعلق ان تمام تر ذمہ داریوں کو اپنے سر لے جنہیں پورے کرنے کا وعدہ اللہ نے لے رکھا ہے۔ایسی ریاست جب اللہ کے نام پر لوگوں سے اطاعت (بیعت) لیتی ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کے ان واجبات کو پورا کرے جن کا ذمہ اللہ نے خود لے رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سب سے پہلی آیت میں خود کو "رب العالمین" کہا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی ربوبیت (پرورش ونشوونما) کا ذمہ دار ہے۔ربوبیت کا معنی دراصل کسی چیز کو اس کے نقطۂ آغاز سے نشوونما دیتے دیتے بالآخر اس کی تکمیل تک پہنچا دینا ہے۔اسی آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح انسانیت کی عالمگیر نشوونما اور پرورش کا ذمہ بھی اپنے اوپر لیا ہوا ہے۔اسی ذمہ داری کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (سورہ ہود۔آیت 6)

زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو

اور خود انسانوں کے متعلق فرمایا کہ:

نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (سورہ الانعام۔آیت 152)

ہم ان کے اور ان کی اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہی ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے مومنین کے ذریعے قرآنی نظام قائم کیا جاتا ہے (انسانوں کو بااختیار بھی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ دیکھا جائے کہ یہ کس قدر اللہ تعالیٰ کی ذمہ داریوں کو زمین پر پورا کرتا ہے)۔یعنی ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کریں جس سے تمام افرادِ ملت کو ان کا رزق اور نشوونما کا سامان ملتا رہے۔یہ ہے وہ ذمہ

داری جسے اللہ تعالیٰ قرآن میں ''ایتائے زکوٰۃ'' کہہ کر پکارتا ہے۔اس حقیقت کو مندرجہ ذیل آیت میں مزید واضح کیا گیا ہے:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ

وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (سورہ الحج۔آیت 40)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں جنہیں اگر زمین میں اقتدار ملا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔

غور فرمائیں۔قرآنی ریاست کے بنیادی فریضہ میں ایتائے زکوٰۃ شامل ہے۔یعنی افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما عطا کرنا۔اس اعتبار سے اس حکومت کی ساری آمدنی زکوٰۃ کہلاتی ہے۔یعنی سامانِ نشوونما جو وہ ریاست کے شہریوں اور اس کے بعد پوری انسانیت کو دینے کے لیے حاصل کرے گی۔اب آمدنی کے لیے وہ کیا انتظام کرے گی؟ لوگوں کی کمائی سے کس قدر لے گی، اس کا تعین ہر دور کی ضروریات کے حساب سے کیا جائیگا۔زکوٰۃ کوئی مخصوص ٹیکس نہیں، بلکہ قرآن کی بنیاد پر قائم اسلامی ریاست کی پوری کی پوری آمدن ہی زکوٰۃ کہلاتی ہے۔

یعنی اب ''ایتائے زکوٰۃ'' کا مفہوم کچھ یوں ہوا:

''ایتائے زکوٰۃ'' قرآنی بنیاد پر قائم اسلامی ریاست کا ایک بنیادی فریضہ ہے۔یعنی تمام شہریوں کو بلا امتیاز سامانِ نشوونما و رزق بہم پہنچانا۔اس مقصد کے پیشِ نظر ریاست کی تمام آمدنی زکوٰۃ (سامانِ نشوونما) کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ہم جانتے ہیں کہ ایک ریاست میں بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات (Emergencies) بھی پیدا ہوجاتے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے حکومتی بجٹ میں گنجائش نہیں ہوتی۔مثلاً زلزلہ، وبا، سیلاب، قحط سالی یا جنگ وغیرہ۔ان کے لیے ریاست کو اپنے شہریوں سے خصوصی عطیات کی درخواست کرنا پڑتی ہے۔اب ایسے عطیات کو قرآن نے ''صدقات'' کہہ کر پکارا ہے۔سورہ توبہ کی آیت نمبر 60 جو پیچھے روایتی زکوٰۃ کے موضوع کے تحت درج کی گئی، اس میں جن مصارف کا ذکر ہے، وہ یہی صدقات ہی کے مصارف ہیں، زکوٰۃ کے نہیں۔

درج بالا تصریحات سے واضح ہوا کہ:

(1) آجکل جو کچھ زکوٰۃ کے نام سے دیا جاتا ہے، اسکا زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں، اسے آپ خیرات کہہ سکتے ہیں، زکوٰۃ نہیں۔کیونکہ خیرات لینے والے کا شرفِ انسانیت کچلا جاتا ہے۔لیکن جب قرآنی نظام کا فریضہ ہی ایتائے زکوٰۃ قرار پا جائے تو ہر شخص کامل اطمینان سے اسے اپنے حق کے طور پر لیتا ہے اور کسی کا کسی پر احسان نہیں ہوتا۔قرآن خیرات وعطیات

کو عبوری دور کی ضروریات کے لیے ہنگامی اور وقتی علاج بتاتا ہے جبکہ زکوٰۃ کو قرآنی نظام کا بنیادی فریضہ اور لازمی شعار۔

(2) زکوٰۃ کے لیے قرآنی ریاست کا ہونا ضروری ہے۔

(3) قرآنی ریاست ''زکوٰۃ'' دیتی ہے، لیتی نہیں۔ یہ ایتائے زکوٰۃ کرتی ہے۔ یعنی تمام افرادِ معاشرہ کو بلا امتیاز یکساں سامانِ زندگی و رزق بہم پہنچاتی ہے۔

(4) اس فرض کی ادائیگی کے لیے قرآنی حکومت کی ساری آمدن زکوٰۃ کہلا سکتی ہے۔ اس آمدنی کی نہ تو کوئی غیر متبدل شرح ہے اور نہ کوئی مخصوص نصاب۔ ہر دور کی ضروریات کے لحاظ سے حکومت اسے خود متعین کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور خلافت راشدہ کے ادوار میں بھی اسے اس زمانہ کی ضروریات کے مطابق مقرر کیا گیا تھا۔

(5) ہنگامی حالات کے تحت حکومت کی جانب سے اضافی رقم کی درخواست پر دیے جانے والے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

یہ ہے قرآن کی روشنی میں زکوٰۃ کا ایک بنیادی اصول۔ اس اصول کی جزئیات اور طریقہ کار ہر دور کے تقاضوں کے مطابق قرآنی ریاست خود طے کرے گی۔

صدقہ خیرات کا مروجہ تصور اور مسلمانوں کی یہودی ذہنیت

قرآن میں یہودیوں کی ایک ذہنیت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاں بھی صدقہ و خیرات کو ایک بہت ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ یہ ''ثواب'' کمانے کے لیے وہ کرتے کیا تھے؟ اپنے اپنے رشتہ داروں کو دشمن کی قید میں دانستہ دے دیا کرتے تھے، پھر بعد میں ان کی جانب سے فدیہ ادا کر کے انہیں دشمن کی قید سے چھڑواتے تھے اور اسے بہت بڑا کارِ خیر سمجھ کر اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔

آج یہی حالت مسلمان سرمایہ داروں کی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کا خون چوس کر خود امیر بنتے ہیں اور انہیں غریب و محتاج کر دیتے ہیں۔ دوسروں کی محنت کی کمائی کو ڈکار کر بڑی بڑی کوٹھیاں کھڑی کرنے والے یہ مترفین اور الملاء غریبوں کی جانب خیرات کے چند پیسے پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس نیک عمل سے ان کی آخرت سنور جائیگی۔ جیسے ہمارے ہاں اہل تصوف گناہ کو اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر زمین پر گنہگار باقی نہ رہیں تو اللہ اپنی صفتِ رحیمی کا مظاہرہ کیسے کرے گا؟، اسی طرح قوم میں غریبوں، فقیروں اور محتاجوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہے تو پھر صدقہ خیرات کے

احکامات کی تکمیل کیسے ہوگی؟یعنی دنیا سے غربت کے خاتمہ کے لیے کوششیں کرنا ''از روئے شریعت'' ایک باطل عمل ہے۔ان لوگوں کے بقول قرآن معاشی مساوات کا قائل نہیں۔اگر سب برابر ہوجائیں تو لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے کہاں سے لائے جائیں؟ پھر تو یہ حجام،موچی،راج مستری،مزدور،خوانچہ فروش وغیرہ کا تو وجود ہی مٹ جائیگا۔پھر یہ حقیر کام کون کرے گا؟

اس دلیل کا بودا پن ملاحظہ فرمائیں: کہ اس حساب سے پھر تو لوگوں کی صحت کا بھی قطعی خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ایسی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ لوگ تندرست وتوانا رہیں۔کیونکہ اگر لوگ تندرست رہیں اور بیمار نہ پڑیں تو پھر ہسپتال بند کرنا پڑیں۔نہ دوائیوں کی ضرورت باقی رہے نہ ڈاکٹروں کی۔

دیکھیے کہ ان ''دلائل'' کی رو سے سرمایہ داری نظام کا زہر کس قدر مہلک اور دوررس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔قرآن نے ایسے ہی یہودی ذہنیت کے حامل عناصر کا پردہ چاک کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ:

فَمَا جَزَاء مَن يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 85)

تم لوگ امن وآشتی قائم رکھنے کے معاہدہ جات کے باوجود خونریزیاں کرتے پھرتے ہو اور اپنے غریب بھائیوں کو گھروں سے نکال باہر کرتے ہو۔اور بجائے اس کے کہ تمہارا معاشرہ ان مجرمین کے خلاف کوئی کاروائی کرے،تم الٹا ان غرباء کیخلاف ظلم واستبداد میں ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہو۔کہیں کم زور کو مزید کمزور کرنے اور کہیں ظالم کی حوصلہ افزائی کے ذریعہ۔اور ستم ظریفی یہ کہ جب ان گھروں سے نکالے ہوئے تمہارے بھائیوں کو دشمن لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم بڑے خداترس بن کر آگے بڑھتے ہو اور ان کا زرِفدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔اور اس سے تم سمجھتے ہو کہ تم نے بہت بڑا نیکی کا کام کیا ہے حالانکہ تم مجرم ہو۔تم نے انہیں پہلے ان کے گھروں سے نکالا تھا،جو تمہارے لیے سنگین جرم قرار دے کر منع کیا گیا تھا۔سو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم خدا کے ضابطہ حیات کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو۔خداوندی ضابطہ حیات کے یوں ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔جیسے ایک جسم ٹکڑوں میں نہیں بٹ سکتا۔یہ تو اسے مکمل تسلیم کیا جائیگا،یا مکمل انکار۔اسی طرح جو قوم اللہ کے نازل کردہ ضابطہ حیات کے کچھ حصوں پر تو عمل کرتی رہتی ہے اور کچھ کو ترک کر دیتی ہے،اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس قوم کی حال کی زندگی بھی ذلت ورسوائی کی ہوگی اور ان کا مستقبل اور آخرت بھی ہولناک تباہیوں سے لبریز۔یعنی

دنیاوآخرت دونوں برباد۔

قرآن ہمیشہ ریاست کے اندر ایک نظام قائم کرنے کی بات کرتا ہے۔مذہب،پوجا پاٹ،پرستش،رہبانیت وغیرہ سے تو اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔قرآن میں تو مذہب کا لفظ تک نہیں آیا۔وہ تو دنیا بھر کے مذاہب کو مٹانے کے لیے ایک چیلنج بن کر نازل ہوا تھا۔لیکن ہمیشہ کی طرح سرمایہ داروں نے مذہبی پیشوائیت کی مدد سے اس کی فلاحی تعلیم کو بھی مسخ کر ڈالا اور اسلام کو مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا۔

قرآن ایک دین پیش کرتا ہے۔اور دین میں ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی اور کفالت کا ذمہ حکومت کے سر ہوتا ہے۔جو حکومت اس ذمہ داری کو پورا نہ کر سکے،اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظام میں یہ تصور بھی محال ہے کہ محتاجوں اور غریبوں کی جماعت کا کوئی مستقل وجود برقرار رکھا جائے۔البتہ بعض انفرادی اور مقامی صورتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جن میں فوری امداد کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔یا بعض ایسے حوادث یا قدرتی آفات سے واسطہ پڑ جاتا ہے جن میں حکومت کا بجٹ کم پڑ جائے اور وہ ریاست کے شہریوں سے رضا کارانہ طور پر صدقات کے ذریعے فنڈ اکٹھا کرنے کی اپیل کرے۔لیکن اس قسم کے واقعات جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہنگامی ہیں۔اس لیے شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ریاست کی عام حالت یہی ہوگی کہ ملک میں حکومتی نظام غریبوں اور محتاجوں کی خود بہترین کفالت کرے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدِنظر رکھیں کہ اسلامی نظام میں خیرات وصدقات کی ضرورت ایسے عبوری دور میں بھی ہوتی ہے جب قرآنی نظامِ ریاست ابھی وجود میں نہ آیا ہو۔ایسے میں لوگ انفرادی طور پر یا فلاحی جماعتوں کی شکل میں صدقات و عطیات فنڈز کے ذریعے محتاجوں اور محروموں کی امداد کا بندوبست کریں گے۔

قرآنی اسلام میں اس سوچ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ریاست میں غریبوں اور محتاجوں کا ایک مستقل وجود ہو اور پھر ان کی جانب خیرات کے چند سکے پھینک کر اپنی ''آخرت'' سنواری جائے۔یہ سراسر سرمایہ دارانہ نظام کا دیا ہوا ایک فریبِ نگاہ ہے جسے مذہبی تقدس میں سرمایہ داروں کی ایجنٹ مذہبی پیشوائیت لپیٹے رکھتی ہے۔اور اس کا نتیجہ پھر وہی ''حبطت اعمالھم'' کی صورت نکلتا ہے۔یعنی صدقہ وخیرات کے باوجود قوم میں محتاجوں اور غرباء کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔لوگ فاقہ کشی کر رہے ہیں، خودکشیوں پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔یہ سب سرمایہ دارانہ غیر قرآنی نظام کی بدولت ہے اور ہمارے ہاں ہر جگہ رائج ہے۔جسے بدلنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔کیونکہ اسے ''شریعت'' کی سند عطا کر دی گئی ہے۔

سود کا روایتی تصور اور قرآنی نظریہ الرباء

ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ سود خوری حرام ہے۔ جب سود کی تشریح کے سلسلہ میں وضاحت طلب کی جاتی ہے تو بتایا جاتا ہے کہ کسی کو نجی ضرورت کے لیے قرضہ وغیرہ دے کر اس پر کچھ رقم زائد وصول کرنا سود کہلاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک کاروباری سود (Commercial Interest) جائز ہے۔ یعنی کسی کو تجارت کی غرض سے قرض دینا۔ بعض لوگ بینکوں کے سود کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ کوئی سود مفرد کو تو جائز کہتا ہے، مگر سود مرکب (سود در سود) کو حرام قرار دیتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ قرآن ان تمام معاملات سے بحث ہی نہیں کرتا۔ وہ ایک اصطلاح استعمال کرتا ہے ''الرباء'' کے نام سے۔ رباء دراصل ایک ایسی بنیاد کا نام ہے جس پر ایک ایسے معاشی نظام کی عمارت قائم ہوتی ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی ضد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام سے اس قدر متصادم ہونے کی وجہ سے قرآن نے رباء کو اللہ اور رسول (قرآنی نظام مملکت) کے خلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن کی رو سے الرباء کی جامع تعریف ان الفاظ کے اندر موجود ہے جو سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279 میں موجود ہیں۔ یعنی:

وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ

(سورہ البقرہ۔ آیت 279)

اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے راس المال ہے۔

اس آیت سے گزشتہ آیت میں یہ کہا گیا کہ اگر تم رباء لینے سے باز نہ آئے تو اسے اللہ و رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائیگا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں حکم ہوا کہ اگر تم رباء لینے سے باز آ جاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ پھر اس کے بعد حکم ہوا کہ:

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (سورہ البقرہ۔ آیت 279)

اس سے نہ تم کسی پر ظلم کروگے، نہ تم پہ ظلم ہوگا۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل احکامات واضح ہوتے ہیں:

(1) اگر قرض وغیرہ کے معاملات میں اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پہ ظلم نہیں ہوتا۔

(2) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائیگا تو وہ مقروض پہ ظلم ہوگا۔

اسی کو رباء کہتے ہیں۔یعنی اصل دے کر اصل سے زیادہ بھی کچھ لینا۔اس تشریح میں نہ کسی قسم کی پیچیدگی ہے نہ الجھاؤ۔معاملہ واضح ہے۔

یہ جو ہمارے ہاں تصور ہے کہ سود در سود یعنی سود مرکب تو حرام ہے،مگر سود مفرد جائز ہے،تو یہ غلط استدلال مندرجہ ذیل سے کیا جاتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (سورہ آل عمران۔آیت 129)

روایتی ترجمہ:اے ایمان والو۔یہ دوچند،سہ چند ہونے والا سود کھانا چھوڑ دو۔

یہاں مضعفۃ دراصل لفظ ''ضَعف'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کم کرنا،ضِعف سے نہیں،جس سے مراد بڑھانا ہے۔لہٰذا آیت کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''یہ رباء جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے پیسے میں اضافہ کرتا ہے،بڑھاتا نہیں،بلکہ یہ دراصل روپے پیسے کو کم کرتا ہے۔اس سے معاشرہ کی دولت گھٹتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سود خور کی کمانے کی استعداد اور قوتوں میں بھی خاطر خواہ کمی واقع ہوتی ہے۔اس سے ملکی معیشت کا پہیہ سست ہو جاتا ہے۔اور بدحالی مسلط ہو جاتی ہے۔

اور بات ہے بھی حقیقت۔رباء خوری سے معاشرہ کے کمانے والے افراد کی جسمانی وفکری صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں اور یوں پیداوار میں کمی کے باعث قومی دولت میں بھی نمایاں کمی آتی جاتی ہے۔

''الرباء'' کا اطلاق صرف قرض نہیں بلکہ تمام معاملات پر ہے۔

قرآن کی رو سے الرباء کے معنی ہیں اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ہمارے ہاں خیال یہ ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض اور لین دین کے معاملات سے ہے۔یہ خیال درست نہیں۔الرباء تو ایک بنیادی اصول ہے جو قران نے دیا ہے اور اس پر قران کے معاشی نظام کی تمام تر عمارت قائم ہوتی ہے۔کیونکہ یہ سوال بنیادی نوعیت کا ہے کہ معاوضہ محنت کا ہی ہوسکتا ہے یا سرمایہ پر معاوضہ بھی لیا جاسکتا ہے؟

اسی سوال پر مضمون کے اولین حصہ میں بھی میں سیر حاصل گفتگو پیش کر چکا ہوں،یہاں بھی موضوع کی مناسبت سے یہ واضح کرتا چلوں کہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ:

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (سورہ النجم۔آیت 39)

انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا ہی حقدار ہے۔

سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ یہ تو پہلے سے ہی کسی نہ کسی کا کمایا ہوا معاوضہ ہے۔پس اسی اصول کے تحت لین دین کے کسی بھی معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ پر لیا جانیوالا معاوضہ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، وہ الرباء کے زمرے میں آتا ہے اور قران کی رو سے حرام ہے اور اللہ و رسول کے خلاف ایک جنگ۔

الرباء کی مختلف صورتیں

غور کیجیے کہ ایک کاشتکار آپ سے دس لاکھ روپے قرض مانگتا ہے کہ وہ اس سے ایک قابل کاشت قطعہ زمین خرید کر وہاں کھیتی باڑی کرے اور اس آمدن سے اپنے کنبہ کی کفالت بھی کرے اور ساتھ ساتھ آپ کا قرض بھی ادا کر دے۔آپ اسے دس لاکھ روپے بطور قرض نہیں دیتے، بلکہ اسی رقم سے وہ قطعہِ زمین خرید کر اسے پٹہ یا بٹائی پر دے دیتے ہیں۔اب وہ سارا سال اس میں محنت سے فصل بوتا ہے اور اس فصل کی نصف پیداوار آپ رکھ لیتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا چلا جاتا ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی آپ کا قرض بدستور برقرار رہتا ہے۔کیا یہ رباء نہیں؟

یا ایک دوکاندار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تا کہ وہ اس سے اپنے کاروبار کو وسیع کر سکے۔آپ اسے رقم دید یتے ہیں۔لیکن بطور قرض نہیں، بلکہ بطور حصہ دار۔اب وہ دن رات کی محنت سے کاروبار کرتا ہے لیکن آپ گھر بیٹھے ہی اس کے منافع میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔وہ آپ کو منافع کا حصہ بدستور دیتا چلا جاتا ہے، لیکن آپ کا اصل زر بدستور اس کے ذمہ رہتا ہے۔یہ بھی رباء ہی ہے۔

یا آپ اس بزنس مین کو براہ راست قرض نہیں دیتے بلکہ اپنی رقم بینک میں جمع کرا دیتے ہیں اور بینک والے اس روپے کو بطور قرض اس بزنس مین کو دے دیتے ہیں۔وہ اس قرض پر جو سود بینک کو ادا کرتا ہے اس میں سے ایک مقررہ حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے اور آپ کا اصل زر بھی بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے جو آپ کبھی بھی نکلوا سکتے ہیں۔ یہ بھی رباء ہے اور قرآن کی رو سے قطعی طور پر حرام۔چاہے اسے سود مفرد کے کھاتے میں ڈالا جائے یا سود مرکب کے۔

غور فرمائیں تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں، اس کی مندرجہ ذیل مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً:

(1) عطیہ یا تحفہ: اس میں نہ محنت کرنا پڑتی ہے نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفہ کے طور پر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ لین دین کے زمرے میں نہیں آتا۔ یہی صورت حال صدقہ کی ہے جسے کسی ضرورتمند کو امداد کی غرض سے دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ ضرورتمند اس امداد کو معاشرہ سے بطور خیرات نہیں، بلکہ بطور حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(2) اجرت: یہ محنت کش کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس میں سرمایہ نہیں لگایا جاتا۔

(3) الرباء: اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد اس سرمایہ کے ساتھ کچھ زر زائد بھی وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا بلکہ اس کا روپیہ ہی روپیہ کما کر لاتا ہے۔ یعنی دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وہ وصول کر لیتا ہے۔

(4) تجارتی منافع: اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(5) جوا، سٹہ: اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے اور نہ ہی محنت کی جاتی ہے۔

درج بالا شقوں میں پہلی شق کے علاوہ جہاں بھی معاوضہ محنت کا نہیں، قرآن اسے حرام قرار دیتا ہے۔ کیونکہ قرآن کا تو بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ ''لیس للانسان الا ماسعیٰ'' یعنی معاوضہ صرف محنت کا ہی جائز ہے۔

تجارتی منافع اور رباء میں بنیادی فرق:

یہ بنیادی اصول چونکہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا، اس لیے ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ بیع (تجارت) کے منافع اور رباء میں آخر کیا فرق ہے؟ ایک آدمی ایک ہزار روپے کی چیز خرید کر بارہ سو روپے میں فروخت کرتا ہے، اسے اصل زر سے دو سو زائد وصول ہو جاتے ہیں، دوسری جانب ایک دوسرا آدمی کسی کو ایک ہزار روپے قرض دے کر اصل زر سے دو سو روپے زائد وصول کرتا ہے تو اسے بھی اصل زر سے دو سو زائد ملتے ہیں۔ وہ پوچھتے تھے کہ جب ان دونوں صورتیں بنیادی طور پہ اصل سے زائد ہیں تو ان میں پھر فرق کیا ہے؟

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا

(سورہ البقرہ۔ آیت 275)

وہ بیع اور رباء کو ایک جیسا سمجھتے تھے:

قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کی بھول ہے۔ دونوں معاملات یکساں نہیں۔ تجارت (بیع) میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے

ہیں ۔سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس مل جاتا ہے اوراس کے ساتھ ہی دوکاندارکواس کی محنت کا معاوضہ بھی اس سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔اس محنت کا معاوضہ جواس نے چیز کو کارخانوں سے لاکر عام صارف تک پہنچانے میں کی۔

دوسری طرف ہم رباء کودیکھیں تو اس میں محنت تو کچھ بھی نہیں ہوتی ،صرف سرمایہ ہی لگایا جاتا ہے(Investment)،پس اس میں جو کچھ بھی زائد ملتا ہے،وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے۔گزشتہ مثال میں دوکاندار نے ایک ہزار روپے کی چیز لاکر دوسو روپے میں فروخت کی، یہ اس کی (سرمایہ)چیز کی لاگت+ محنت پر مشتمل ہے۔جبکہ سرمایہ دار کی جانب سے ایک ہزار روپے قرض دے کر بارہ سو وصول کرنا رباء ہے پس حرام۔کیونکہ یہ منافع سرمایہ +سرمایہ کا منافع پر مشتمل ہے۔پس قرآنی اصول یہ ہوا:

''محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے جبکہ صرف سرمایہ پر زائد لینا حرام''

مزید برآں،اگر تجارت میں کوئی بھی شخص اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ بھی رباء ہے۔کیونکہ وہ پھر سرمایہ کا معاوضہ ہوجائیگا، نہ کہ صرف محنت کا۔اوراس بات کا تعین ریاست ہی کرے گی کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے،اور وہ اس مقررہ مقدار سے زائد منافع نہیں لے سکتا۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ تجارت میں انسان خطرہ(Risk)مول لیتا ہے،یعنی اس میں نفع نقصان دونوں کے یکساں چانسز ہوتے ہیں۔جبکہ رباء میں رسک فیکٹر نہیں ہوتا۔لیکن حلت وحرمت کے ضمن میں ایسے معیارات درست نہیں۔اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط صرف رسک فیکٹر ہی ہے تو پھر جوا تو عین حلال ہونا چاہی کیونکہ اس کا تو ہر داؤ ہی ایک Risk ہوتا ہے۔بیع اور رباء میں فرق وہی ہے جو درج بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے۔یعنی:

بیع (تجارت)= راس المال (اصل زر)+ محنت کا معاوضہ۔۔۔حلال

الرباء=راس المال+ راس المال کا معاوضہ۔۔۔حرام

دیکھا آپ نے؟ قرآن پر غور کرنے سے رباء کا معاملہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے؟ اس کے سمجھنے میں جو بھی مشکلات آجکل پیش آتی ہیں،ان کی وجہ یہ ہے کہ:

(1) رباء کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جنہیں قرآن تو حرام قرار دیتا ہے مگر ہماری مروجہ شریعت اسے حلال کہتی ہے۔مثلاً

زمین کو بٹائی پر دینا (مزارعت) یا مضاربت (کاروبار میں ایسی پارٹنر شپ جس میں ایک فریق محض سرمایہ پر منافع وصول کرتا ہے، اور تجارت میں بے حساب منافع وغیرہ۔

ہماری مذہبی پیشوائیت کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کریں۔ وہ رباء کی تعریف ہی کچھ ایسی کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا شکلیں رباء کی زد میں نہ آسکیں۔

دوسری جانب مترفین کا ایک دوسرا گروہ ہے جو پہلے گروہ (مذہبی پیشوائیت) کا مالی سرپرست بھی ہے۔ یہ طبقہ بھی بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ محنت کے تصور سے ہی انہیں پسینہ آنے لگتا ہے۔ اس لیے یہ نہیں چاہتے کہ قرآنی اصطلاح رباء کا حقیقی مفہوم لوگوں کے سامنے آئے اور ان کے دوسروں کی محنت کی کمائی پر پلنے کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ مذکورہ دونوں گروہ قرآن کے معاشی نظام کی آواز کو دبائے رکھنے میں پیش پیش ہیں۔

المختصر: زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ نے ہوا پانی اور روشنی وغیرہ کی طرح نوع انسانی کی پرورش کے لیے مفت میں عطا کیا ہے۔ اس لیے اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین ہمیشہ ریاست کی تحویل میں رہے گی تا کہ وہ اس سے تمام افراد کو یکساں رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد صرف جگہ کی ملکیت نہیں، بلکہ اس سے پیدا ہونے والی خوراک، غلہ اور مصنوعات تک سب کچھ اس میں آجاتا ہے جو اس کرہ ارض پہ پیدا ہوتا ہے۔

اس نظام کے تحت کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت نہیں رہ سکتی۔ اس لیے لوگوں کی جانب سے جائیدادیں کھڑی کرنے یا روپیہ پیسہ کو بینک بیلنس کی شکل میں محفوظ کرتے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن کی رو سے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری نظامِ ریاست پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کسی کو اپنی ضروریات کے لیے کسی انسان کا محتاج نہیں ہونا پڑتا بلکہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکومت (قرآنی نظام ریاست) کا ہی محتاج ہوتا ہے، جس نے اس کے رزق کا روز ازل سے ذمہ لے رکھا ہے۔

اور۔۔۔ اس نظام میں انفرادی تجارت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اس میں دوکاندار کا فریضہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ ریاست کی جانب سے اشیائے ضرورت کو صرف لوگوں میں تقسیم ہی کرے گا، اسے ذاتی منافع خوری کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ ایسا ہوگا بھی کیوں؟ جب ریاست اس دوکاندار کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ دار ہوگی اور اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے اسے ریاست کی جانب سے معاوضہ دیا جا رہا ہوگا تو وہ ذاتی طور پر منافع خوری کیوں کرے گا؟

یہی وجہ ہے کہ اس قرآنی نظام ریاست میں انفرادی طور پر رباء خوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رباء چونکہ صرف سود کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے ظالمانہ معاشی نظام کا حصہ ہے جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔

قرآن کے معاشی نظام میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کم سے کم اپنے پاس رکھتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جتنا زیادہ دے رہا ہے، اس سے اسی کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اس کے برعکس غیر قرانی نظام معیشت میں ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور معاوضہ زیادہ سے زیادہ اسے ملتا چلا جائے۔ اور اس کی جیبیں بھرتی جائیں۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے شدید متصادم ہیں۔ قرآن رباء پر مبنی نظام معیشت کو خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیتا ہے۔ یہ اللہ و رسول کے خلاف بغاوت ہے۔ ایسی صورتحال میں کسی بھی طرح ممکن نہیں کہ ہم ایسے باطل نظام سرمایہ داری کو جوں کا توں چلتا رہنے دیں، اور سمجھیں کہ اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے رباء خوری کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیں گے تو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہوگی۔

کمیونزم کی آڑ میں قرآنی نظام کو نقصان پہنچانے کے لیے مذہبی پیشوائیت کا مذموم حربہ

کمیونزم کا نظام چونکہ نظام سرمایہ داری کے ردعمل کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ اس لیے ظاہری بات ہے کہ اس نظام کی کچھ شقوں کی قرآن کے معاشی نظام سے کسی قدر مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ دونوں نظام (قرآنی اور کمیونزم) نظام سرمایہ داری (Capitalism) کے خلاف ہیں اس لیے یہ ایک فطری امر ہے کہ دونوں میں کچھ مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔

اس کے برعکس یہ بات بھی حقیقت ہے کہ کمیونزم کا فلسفہ حیات بھی قرآنی فلسفہ حات سے یکسر متصادم ہے۔ وہ اللہ، وحی، رسالت وغیرہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور یہی ایک بہانہ ہے جو ہماری مذہبی پیشوائیت قرآن کے معاشی نظام کی آواز کو دبانے کے لیے استعمال کرتی نظر آتی ہے۔ معاملہ کچھ یوں ہے۔ غور سے سنئے:

(1) (جیسا کہ اگلے باب میں بھی تفصیل سے بتایا جائیگا) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا آپس میں گٹھ جوڑ شروع دن سے چلا آ رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت (ملا، پنڈت، پادری، ربی، راہب وغیرہ) دراصل سرمایہ داریت کی ہی ایک شاخ ہے۔ چونکہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ محنت کیے بغیر دولت حاصل ہوتی جائے۔ اب دیکھئے۔ محنت نہ تو مذہبی پیشوا کرتے ہیں نہ سرمایہ دار۔ سرمایہ دار تو پھر بھی کچھ روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں، لیکن مذہبی پیشوا تو بغیر روپیہ لگائے ہی دوسروں کی محنت کی کمائی مذہب کے نام پر بٹور لیتے ہیں۔ یہ نظام سرمایہ داری کی بدترین شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی

پیشوائیت کی جانب سے قرآن کے معاشی نظام کی مخالفت کرنا ایک فطری امر ہے۔

(2) لیکن ان میں اتنی جرات نہیں کہ یہ کھل کر سرِ عام قرآن کے معاشی نظام کی مخالفت کر سکیں، نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رو سے یہ قرآن کے معاشی نظام کو خلافِ اسلام قرار دے سکیں، اس لیے یہ کرتے کچھ یوں ہیں کہ:

(3) جونہی کسی جگہ قرآن کے معاشی نظام کا ذکر ہونا شروع ہو، یہ لوگ فوراً شور مچا دیتے ہیں کمیونسٹ کمیونسٹ۔ یہ اشتراکی ہے، دہریہ ہے، ملحد ہے۔ (جیسا کہ اوپر میں نے ذکر بھی کیا کہ) قرآنی نظامِ معیشت اور کمیونزم کے معاشی نظام میں بعض جزئیات میں باہم مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام عوام اور سطحی سا علم رکھنے والے لوگ فوراً ان مولویوں کے فریب میں آجاتے ہیں اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

قرآن کے معاشی نظام کی مخالفت کے لیے مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا مفید ثابت ہو رہا ہے۔ عوام اتنی دور اندیشی نہیں رکھتے۔ وہ بھیڑ چال چلنے کے عادی ہیں۔ اس لیے اکثر انہیں یہ سمجھانا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ قرآن کے معاشی نظام اور کمیونزم کے معاشی نظام میں اگرچہ بعض شقیں ملتی جلتی ضرور ہیں، لیکن ان شقوں کو پیش کرنے والا ضروری نہیں کہ کمیونسٹ یا دہریہ ہو۔ وہ ایک سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ کمیونزم اور قرآن کے معاشی نظام میں تو اگرچہ کوئی فرق نہیں، لیکن ان دونوں کے فلسفہ ہائے حیات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور کمیونزم کے فلسفہ حیات کو ماننے والا بلاشبہ مسلمان نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ حیات بعد الموت کے قائل نہیں، ان کے نزدیک زندگی بس طبعی ہی ہے اور انسان کا بنیادی مسئلہ صرف روٹی کا مسئلہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا ایمان خدا، رسالت اور الہامی کتابوں پر نہیں۔ لیکن یہ ان کا صرف فلسفہ حیات ہے۔ جو غیر قرآنی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ قرآن کے معاشی نظام کے ساتھ عین مطابقت رکھتا ہے جہاں زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ممکن نہیں اور یہ ریاست کی تحویل میں ہونی چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ طرزِ عمل منطقی طور پر ہی غلط ہے کہ جو شخص قرآن کے معاشی نظام کو پیش کرتا ہو، وہ لازماً دہریہ یا کمیونسٹ بھی قرار دیا جائے۔ دہریہ یا کمیونسٹ انسان تب بنتا ہے جب وہ خدا، وحی، رسالت اور حیات بعد الموت سے انکار کرے۔

اگر قرآن کے معاشی نظام اور کمیونزم، سوشلزم کے معاشی نظام کا ہی باہم ملنا کسی کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو پھر اس اعتبار سے تو ہمارے تمام علماء کرام اور مفتی حضرات کمیونسٹ ہیں۔ کیونکہ کمیونزم میں بھی سود حرام ہے اور یہ حضرات بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کو تو کوئی کمیونسٹ نہیں کہتا۔ اس کے برعکس اگر کوئی اٹھ کر یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت قرآنی اسلام

کے خلاف ہے تو اسے یہ سب مل کر کمیونسٹ، سوشلسٹ، دہریہ وغیرہ وغیرہ پکارنا شروع کر دیں گے۔ اس لیے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کا انکار اسلام کے خلاف ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ مولوی خود اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا کے سات امیر ترین افراد اس کرہ ارض سے غربت کا خاتمہ کر سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انکی مجموعی دولت اس کرہ ارض پر موجود ایک چوتھائی انتہائی غریب افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔

دنیا کی کل آبادی کی بنیادی ضروریاتِ زندگی خوراک، پینے کا صاف پانی، تعلیم، طبی سہولیات ہیں جو کہ دنیا کے 225 امیر ترین افراد کی دولت کا صرف 4 فیصد خرچ کرنے سے غریب دنیا کو میسر آسکتی ہیں۔

www.theodora.com/maps

8 ملوکیت، سرمایہ داریت اور مذہبی پیشوائیت (شیطانی مثلث)

ایک قدیم اصول ہے کہ ''چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔یہ کسی بھی معاملہ میں حقائق فہمی کا ایک موثر ترین کلیہ ہے۔قرآن نے بھی اپنے بنیادی ترین حقائق کو بنی نوع انسان کو سمجھانے کے لیے یہی طریقہ اپنایا ہے۔یعنی وہ دو باہم متضاد یا مخالف اشیاء کو آمنے سامنے لا کر حقیقت کی وضاحت کرتا ہے۔مثال کے طور پر:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّور

(سورہ الفاطر۔آیات 21-19)

یا درکھو اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔اندھیرا اور روشنی کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاء وَلَا الْأَمْوَاتُ (سورہ الفاطر۔آیت 22)

اور زندہ و مردہ کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔

یعنی اگر آپ نے یہ حقیقت جاننی ہو کہ زندہ کسے کہتے ہیں تو ایک مردہ پر غور کرو۔جو بات مردے میں ہو، سمجھو وہ زندہ میں ہے۔جس میں یہ بات ہوگی، وہ زندہ ہوگا، جس میں نہیں، وہ مردہ۔

پس اگر تم جاننا چاہو کہ اللہ کی طرف سے بھیجا گیا دین دراصل ہے کیا؟ اس کا پیغام کیا ہے؟ وہ کیا نظام زندگی پیش کرتا ہے؟ تو اس بات پر غور کرو کہ اس دین کی مخالفت کس کس طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔جس طبقہ کی جانب سے دین کی مخالفت کی جاتی رہی ہو، سمجھو دین اسی طبقہ کے نظام کی ضد تھا۔دین اسی کو ختم کرنے آیا تھا جس کا علمبردار وہ طبقہ تھا۔

قارئین یہ وہ اہم ترین مطالعہ تھا جس کے لیے اللہ نے ہمیں انسانوں کی لکھی Biased تاریخ کا محتاج نہیں رہنے دیا۔بلکہ قرآن میں اللہ نے دین کی روزِ ازل سے رسول اللہ تک تاریخ مرتب کر کے خود ہی محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا دی۔اس کے بعد کسی قسم کی تاریخ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

قرآن نے ہمیں بتایا کہ اللہ کے رسول مختلف ادوار میں انسانوں تک دین پہنچاتے رہے۔اس سلسلہ میں قرآن نے ابتداء

حضرت نوحؑ سے کی ہے اور اختتام رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس پر کیا ہے۔قرآن یہ کہتا ہے کہ دین
یعنی نظامِ زندگی اپنی ابتداء سے لے کر آخر تک ایک ہی رہا ہے۔اور اس کی مخالفت بھی شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کے طبقات کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔یعنی وہ اربابِ حکومت جو اپنی ذاتی مرضی دوسروں پر چلانا چاہتے تھے اور وہ سرمایہ دار جو دوسروں کی کمائی پر تن آسانی اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔اور مذہبی پیشوائیت جو خدا کے خود ساختہ نمائندے بن کر اول الذکر دونوں گروہوں کے مفادات کی حفاظت کرتے تھے۔

یہی وہ شیطانی مثلث تھی۔جب بھی خدا کا کوئی رسول نازل ہوا،تو ان تینوں گروہوں نے اس کے پیش کردہ دین کی مخالفت کی۔

لہٰذا آج بھی اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ اللہ کا پیش کردہ دین کیا ہے تو اسی پہلے بیان کردہ اصول ''تعارف بالضد'' کے اصول کے مطابق جاننے کی کوشش کرو۔اس کا معیار یہ ہے کہ جس نظریہ کی مخالفت ان گروہوں کی طرف سے ہو،سمجھ لو کہ وہ دین کے عین مطابق ہے اور جس چیز کی تائید ان تینوں میں سے کسی ایک یا تینوں کی جانب سے ہو،سمجھ لو وہ دین کے خلاف ہے۔

یہ ایک نہایت آسان واضح اور روشن اصول ہے جو قرآن نے ہمیں دیا ہے۔اور جس کا تفصیلی تذکرہ مضمون کے اس حصہ میں پیش کیا جائیگا اور بتایا جائیگا کہ کیسے شروع دن سے کونسا طبقہ اللہ کے دین کی مخالفت کرتا آیا اور ایسا وہ کیوں کرتا رہا؟

سرمایہ داروں کے لیے قرآن نے عام طور پر دو اصطلاحات استعمال کی ہیں۔''الملاء''اور''مترفین''۔

(1) الملاء۔ ملاء یملا،وغیرہ کے لغت کے مطابق بنیادی معنی کسی چیز کو بھر دینا ہیں۔اسی مناسبت سے الملاء ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے گھر ضروریاتِ زندگی سے بھرے ہوئے ہوں،جنہیں سامانِ رزق بڑی آسانی سے حاصل ہو یعنی ''رجّے پُجّے''۔چونکہ غیر قرآنی باطل نظام میں عزت اور تکریم کا معیار دولت اور پیسہ ہوتا ہے،اسی لیے ایسے لوگ عموماً قوم یا قبیلہ کے سردار بھی ہوتے تھے۔اسی لیے یہ لفظ الملاء قوم کے سرداروں کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔لیکن اس لفظ سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار اور دولتمند طبقہ ہی تھا۔

(2) مترفین: وہ لوگ جن کے پاس روپیہ پیسہ کی کثرت ہو،اور بہت عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہوں،اور اسی بناء پر وہ تن آسان اور بہت خودسر ہو جائیں،قرآن نے انہیں مترفین کہہ کر پکارا ہے۔یعنی دوسروں کی محنت کی کمائی پر پلنے والے۔خود کوئی محنت کیے بغیر دوسروں کی محنت کا بہترین حصہ اپنی جیب میں ڈال لینے والے۔قرآن نے کہا کہ یہ وہ

لوگ ہیں:

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالاً وَأَوْلَاداً وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ (سورہ السباء۔آیت 35)

جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی کثیر مقدار میں دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور گروہ بھی بہت بڑا ہے۔ جو ہمارا دل چاہے گا، وہ کریں گے۔ ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟

حضرت نوحؑ بمقابلہ سرمایہ دار

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اللہ کے دین کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں وہ آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی اول حضرت نوحؑ کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ:

"ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی قوت نہیں جس کی اطاعت کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنی موجودہ روش پر بضد رہے تو پھر مجھے لگتا ہے کہ تم پر بہت بڑی تباہی مسلط ہوگی" (سورہ الاعراف۔آیت 59)

قارئین حضرت نوحؑ کو اللہ کا پیغام ملا اور یہ انہوں نے اپنی قوم کو پڑھ کر سنا دیا۔ پیغام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ پوری قوم کے لیے تھا۔ لیکن اس پیغام سے قوم میں کونسے طبقہ کو زیادہ آگ لگی اور وہ بھڑک کر اٹھا؟ سنیے:

قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (سورہ اعراف۔آیت 60)

اس قوم کے دولتمند اور سرمایہ دار طبقہ (جو سردار بھی تھے) نے کہا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم عجیب ہی غلط راہ پر چل نکلے ہو۔ (ہمیں تو اپنے راستے پر چلنے سے اس قدر مال و دولت حاصل ہے) اور تم کہہ رہے ہو کہ ہم پر اس راستے کی وجہ سے تباہی آجائیگی؟"

سورہ ہود میں بھی اس کی تفصیل دی گئی ہے:

"اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہمارے خیال سے تو تم بھی ہماری طرح کے ہی ایک انسان ہو۔ اس لیے ہم کیسے مان لیں کہ تم رب کے نبی ہو؟ اور باقی رہے وہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں، تو انکی اوقات ہی کیا ہے؟ یہ تو ہم سے پست طبقہ کے لوگ ہیں۔ اور یہ صاف لگ رہا ہے کہ انہوں نے سوچ سمجھ کر تمہارا مسلک اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ہمیں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی کہ جس کی وجہ سے تمہیں ہم پر برتری حاصل ہو۔ پس ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو۔ (سورہ ہود۔آیت 27)

یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا اور جو دولتمند اور طاقتور لوگ تھے،

انہوں نے اس کی مخالفت کی۔پھر اس کے بعد یہ مطالبہ سامنے رکھا گیا کہ اگر تم ان غریب غرباء اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر شائد ہم تمہاری بات سننے کے لیے راضی ہو جائیں۔اس پر حضرت نوحؑ نے فرمایا:

"تم اس پر غور کرو کہ جو کچھ میں تمہاری بھلائی کے لیے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔لیکن میں ایسا تو ہرگز نہیں کرسکتا کہ جو اس دین کی صداقت پر ایمان لائے ہیں، میں ان بیچاروں کو نکال دوں۔صرف اسی لیے کہ وہ غریب و نادار ہیں۔اور صرف اس لیے کہ تم انہیں ذلیل وحقیر جانتے ہو۔

میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں تو تم تو خوش ہو جاؤ گے، مگر ذرا سوچو کہ اللہ کے قانون کی رو سے اس جرم کی جو سزا مجھے ملے گی، اس سے مجھے کون بچائے گا؟

تم تو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم ذلیل وحقیر گردانتے ہو، اللہ کے ہاں بھی ذلیل ہی ہونگے اور انہیں کسی قسم کی خوشگواری میسر نہیں آسکے گی، لیکن یہ قانون خداوندی سے متصادم سوچ ہے۔اللہ کے قانون کی رو سے انسان کی عزت وتکریم اور اس کا خیر وشر کا مستحق ہونا اس کے ذاتی اعمال کی بدولت ہے۔رب کی نظریں کسی انسان کی دولت پر نہیں بلکہ اس کے دل پر ہوتی ہیں۔اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر تو میں بھی تم جیسا ہی ظالم ہو جاؤں گا۔(سورہ ہود۔آیات 30-29)

قارئین دیکھیے قومِ نوح کے سرداروں نے اس بات کا کیا جواب دیا۔وہی جو ہر دولتمند اور سرمایہ دار دولت وقوت کے نشے میں دھت ہو کر دیا کرتا ہے۔وہ بولے:

"اے نوح۔ہم نے تو تم سے بس ویسے ہی بات کی تھی۔اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جارہے ہو۔ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔جس تباہی کی دھمکی تم ہمیں دیتے رہتے ہو، جاؤ اسے لے ہی آؤ۔ہم بھی دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے"(سورہ ہود۔آیت 32)

سورہ الشعراء میں ہے کہ قوم کے ان امراء نے کہا کہ:

"اے نوح۔تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا قائد مانتے ہوئے تمہاری جماعت میں شامل ہو جائیں؟ جہاں معاشرہ کے وہ لوگ شامل ہیں جو تمہاری طرح پست اور ذلیل ہیں۔اور گھٹیا درجے کے کام کرتے ہیں۔وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔کیا ہم اس جماعت میں شامل ہو کر ان لوگوں کو اپنے برابر کھڑا کرلیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟(سورہ الشعراء۔آیت 111)

اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ:

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میں یہ جانتا پھروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے۔ میرے نزدیک تو یہی بات قابل غور ہے کہ کوئی سچائی کے آگے کس حد تک سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور اس نظام خداوندی کے قیام کے لیے کیا کرتا ہے جسے میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک یہ غریب اور لاچار لوگ ہی وفادار ہیں جو نظام کے قیام کے لیے میرے ساتھی بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ قابل عزت ہیں جو اس نظام ِ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ (سورہ الشعراء۔ آیات 112-111)

سورہ مومنون میں ہے کہ:

پھر ان سرداران قوم نوح نے اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ تم اس شخص سے بہت محتاط رہنا۔ یہ تو ہم پر برتری حاصل کرنے کے چکروں میں ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ یہ اپنا نظام تم پر مسلط کر دے۔ اس کا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ پاگل ہو گیا ہے یہ جو کہتا ہے کہ امیر اور غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم بس کچھ دن مزید انتظار کرو، اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائیگی۔ (سورہ المومنون۔ آیت 24)

لیکن بعد میں جو کچھ ہوا، وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی اپنی انہی غریبوں اور ناداروں کی جماعت محفوظ رہی اور وہ جو دولت کے نشے میں بدمست ہوئے پڑے تھے اور حضرت نوحؑ کو بار بار دھمکیاں دے رہے تھے، وہ سب طوفان میں غرق ہو گئے۔ حق و باطل کی یہ سب سے پہلی کشمکش کی پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ:

"اس داستان میں تمہارے لیے میرے قانونِ مکافات (جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے) کی بڑی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ میں غلط نظام کو کیسے الٹا کر رکھ دیتا ہوں۔ (سورہ المومنون۔ آیت 30)

حضرت ہودؑ بمقابلہ سرمایہ دار

قوم نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قوم عاد کی کہانی آتی ہے جن کی جانب رب نے حضرت ہودؑ کو بھیجا۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے وہی انسانی فلاحی نظام دین رکھا جسے حضرت نوحؑ لے کر آئے تھے۔ اور اس کا Reaction بھی وہی ہوا۔ قوم کے بڑے بڑے "الملاء" دولتمند سرداراس دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم ہوش و حواس کے ساتھ ساتھ عقل بھی کھو بیٹھے ہو۔ تم جو کہتے ہو کہ ہمارا اندازِ زندگی ہمیں تباہی و بربادی کی جانب لے جا رہا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے (ہم تو بہت خوشحال ہیں)۔ (سورہ المومنون۔ آیت 33، سورہ الاعراف۔ آیت 66)

اس قوم کو رزق کی بہت فراوانیاں میسر تھیں اور اسی کے بل بوتے پر انہوں نے خلقِ خدا پر کیسے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل آیت سے لگائیں:

"حضرت ہود نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں سا قدر سامانِ رزق میسر ہے۔ بہت بڑا قبیلہ، بڑی تعداد میں مویشی اور کثیر مقدار میں مال و دولت، سرسبز باغ اور ان کے ساتھ بہتے چشمے۔ یہ سب اللہ کے عطا کردہ رزق ہیں جسے اس نے انسانوں کی پرورش کے لیے پیدا کیا تھا۔ لیکن تم انہیں کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہو۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی عظمت کے اظہار کے لیے بلند و بالا پہاڑیوں پر اس قسم کی یادگاریں بناتے ہو جن کا کوئی استعمال نہیں۔ بھلا ان سے نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور تم بڑے بڑے ساز و سامان (اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لیے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کی جا سکے، بلکہ اس لیے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی شکنجے کی گرفت کمزور نہ پڑنے پائے اور تمہارا ظلم و استبداد اور غلبہ ہمیشہ قائم رہے۔ تم اپنے اس چال چلن کو چھوڑ دو اور اللہ کے قوانین کی پیروی و حفاظت کرو" (سورہ الشعراء۔ آیات 135-128)

قرآن نے پھر اس طبقہ کا ردِ عمل بھی بتایا کہ:

(انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت حقارت اور طنز سے بولے کہ آپ کے اس خطبے کا شکریہ، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے) ہمارے لیے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا نہ کرنا یکساں ہے۔ خدا، اس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب جس سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو، یہ سب پرانے زمانے کے لوگوں کے گھڑے ہوئے قصے کہانیاں ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آسکتی۔ (سورہ الشعراء۔ آیات 136 تا 139)

اب وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم بھی نہیں تھی۔ ان کے پاس:

"سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں، سوچنے سمجھنے کے لیے دماغ تھے۔ لیکن انہوں نے جب قوانین خداوندی کی یوں مخالفت کی تو ان کے یہ حواسِ خمسہ کچھ کام نہ آئے۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکے جس کا وہ کھلا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (سورہ احقاف۔ آیت 26)

حضرت ہودؑ نے انہیں بتا دیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنا یہ چال چلن نہ بدلا تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جس کا نظام تمہارے نظام سے مختلف ہوگا۔

قوموں کے عروج و زوال کا اللہ کے ہاں قانون یہی ہے جس کی رو سے وہ قوم جو غلط نظامِ زندگی کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہی قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

حضرت صالحؑ بمقابلہ سرمایہ دار

قومِ عاد کے بعد ہمارے سامنے قومِ ثمود آتی ہے جس کی دعوتِ انقلاب حضرت صالح لے کر اٹھے تھے۔ ان کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ معیشت کا کلی طور پر انحصار مویشیوں پر ہوتا تھا۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا دارومدار سرسبز چراگاہوں اور پانی کی ندیوں ،چشموں پر تھا۔

اس قوم کے امیر کبیر سردار طبقے نے ان ذرائع رزق کو اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزور اور غریب لوگوں کے جانوروں کو وہاں داخل ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا اور ان کے جانوروں کو پانی پلانے کی باری آتی ہی نہیں تھی۔ خاندانی اعتبار سے حضرت صالح کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا، مگر انہوں نے اپنے ہی اس طبقہ کے اس ظالمانہ چال چلن کے خلاف اعلانِ بغاوت بلند کیا تو وہ سب یکجان ہو کر بولے کہ:

”اے صالح۔ ہمیں تو تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، تم تو ہماری نگاہوں کا مرکز تھے، مگر یہ تم کیا کرنے لگ پڑے؟“ (سورہ ہود۔ آیت 62)

اب پھر غور فرمائیں۔ یہ کہنے والے کون لوگ تھے؟ وہی

قَالَ الْمَلأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُواْ مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُواْ لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحاً مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ قَالُواْ إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ (سورہ الاعراف۔ آیت 75)

جنہوں نے دولت کے نشے میں دھت ہو کر اودھم مچا رکھا تھا۔

اب پہلے حضرت ہودؑ نے ان سے ایسا کیا کہا تھا کہ جس پر وہ یوں بگڑ بیٹھے تھے؟ سنیے:

وَاذْكُرُواْ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاء مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُوراً وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتاً فَاذْكُرُواْ آلاء اللّهِ وَلاَ تَعْثَوْاْ فِي الأَرْضِ مُفْسِدِينَ (سورہ اعراف۔ آیت 74)

”دیکھو خدا نے تمہیں سا ملک میں اقتدار دیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو، پہاڑوں کو کاٹ کر وہاں گھر بناتے ہو، تم خدا کی ان نعمتوں کو پانے سامنے رکھو اور ملک میں فساد برپا مت کرو“

پھر انہوں نے مزید فرمایا کہ:

''ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام ایسا ہی رکھا جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں تو کیا پھر تمہاری یہ عیش وعشرت یوں ہی چلتی رہے گی؟ یہ جو سرسبز باغات، چشمے، زرخیز زمینیں، نخلستانوں میں درختوں پر پھلوں کے خوشگوار خوشے جو تہہ بہ تہہ لٹک رہے ہیں، اور یہ قلعہ نما محل جو تم پہاڑوں کو کاٹ کر بڑی کاریگری سے بناتے ہو، اور پھر غرور کرتے ہو کہ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو کیا تم ہمیشہ اسی طرح بیٹھے رہو گے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام تر خوشحالیاں یونہی ہمیشہ قائم رہنے دی جائیں گی؟'' (سورہ الشعراء۔ آیات 146-149)

اس پند و نصیحت پر انہوں نے وہی ہتھکنڈہ اختیار کیا جو ابلیسی سیاست کے علمبردار کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت صالح کو تو کچھ نہ کہا۔ کیونکہ ان کا خاندان بھی انہی میں سے تھا اور بڑا تھا۔ لیکن معاشرہ کے وہ غریب، کمزور اور لاچار لوگ جو ان کے ساتھ تھے، انہیں ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔

''اس پر قوم کے سرکش سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا، مومنین کی جماعت (جنہیں اکابرین ان کی غربت وافلاس کی وجہ سے بہت حقیر اور کمزور سمجھتے تھے)، کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالح اللہ کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پھر تمہیں یہ پتا چل جانا چاہیے کہ ہم تو اسے کوئی رسول تسلیم نہیں کرتے۔ اور اب تم خود ہی سمجھ لو کہ جس بات کو ہم نہیں مانتے، اس پر چلنے سے تم لوگوں کا کیا حشر ہوگا'' (سورہ اعراف۔ آیات 75-76)

جب یہ دھمکی بھی مفید ثابت نہ ہوئی تو انہوں نے حضرت صالح سے Compromise کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور ان سے کہا کہ بھئی سیدھی طرح بتا دو کہ تم چاہتے کیا ہو؟

حضرت صالح بولے کہ میں اور کچھ نہیں چاہتا، صرف اتنا کر دو کہ اللہ نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لیے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لیے کھلا رکھو۔ اس پر بندشیں مت لگاؤ۔ ہر ایک کے جانور چراگاہ میں چریں، اور سب اپنی اپنی باری پر اپنے مویشیوں کو چشموں سے پانی پلائیں۔

اس پر سردار راضی ہو گئے۔ لیکن حضرت صالح نے ان سے کہا کہ ایسے نہیں، مجھے اس کا عملی ثبوت بھی ملنا چاہیے کہ تم میرے ساتھ اس معاہدہ پر عمل پیرا ہو۔ تمہاری حالت تو اس وقت یوں ہے کہ تم نے زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر حدیں باندھ رکھی ہیں۔ کہ یہاں سے مویشی چر سکتے ہیں اور یہاں سے نہیں۔ میرے ساتھ یہ ایک اونٹنی ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ نہ تمہاری اونٹنی ہے

نہ میری۔یہ:

هَـذِهِ نَاقَةُ اللّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِيْ أَرْضِ اللّهِ(سورہ اعراف۔آیت 73)

یہ خدا کی اونٹنی ہے۔جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم میرے بتائے ہوئے تجویز کردہ معاشی نظام پر عمل پیرا رہو گے۔لیکن تم نے اگر اسے روکنے کی کوشش کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم کوئی تبدیلی نہیں چاہتے اور اپنے موجودہ چال چلن پر ہی قائم رہنا چاہتے ہو۔

قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن نے کیسے اپنے معاشی نظام کو چار لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ ''ھٰذا ناقۃ اللہ۔تاکل فی ارض اللہ۔۔۔خدا کی زمین۔۔۔مخلوق خدا کی پرورش کے لیے۔قرآن میں جن چیزوں کی نسبت خدا کی جانب دی گئی ہے،اس سے مراد یہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے لیے کھلی رہے۔اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔مثلاً اللہ نے کعبہ کو بیت اللہ کہہ کر پکارا تو اس کی وضاحت بھی ساتھ ہی کر دی کہ

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ (سورہ آل عمران۔آیت 95)

وہ اولین گھر جسے تمام بنی نوع انسان کے لیے قائم کیا گیا۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (سورہ البقرہ۔آیت 125)

اور اس گھر کو عالمگیر بنی نوع انسان کا مرکز بنایا

جَعَلَ اللّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَاماً لِّلنَّاسِ (سورہ المائدہ۔آیت 97)

اللہ نے کعبہ کو تمام انسانیت کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا ذریعہ بنایا

جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاء الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَاد(سورہ الحج۔آیت 25)

جس کے دروازے تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر کھلے رکھے جائیں گے۔چاہے وہ وہاں کے مقامی ہوں یا پھر غیر ملکی۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے جو ارض اللہ کی اصطلاح استعمال کی ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔وہ تمام انسانیت بلکہ تمام مخلوق کے لیے ذریعہ پرورش ہے۔قرآنی معاشرہ کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ اس سے

تمام معاشرہ کے رزق کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔یہی وہ بنیاد ہے اس معاشی نظام کی جس کا اعلان حضرت صالح نے کیا تھا۔

حضرت صالحؑ کی قوم کے سرداروں نے اس بات کو تو مان لیا۔مگر جب کچھ عرصہ بعد صورتحال دیکھی کہ انکے اور غریبوں کے مویشی اکٹھے چر رہے ہیں،انہیں اور غرباء کو یکساں بنا دیا گیا ہے تو ان کے دلوں میں حسد و انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔۔۔(سورہ الشوریٰ۔آیات 158-157)۔انہوں نے غصہ میں آ کر اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے سابقہ استبدادی نظام کی جانب لوٹ گئے۔اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا(سورہ الشمس۔آیت 14)

اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات نے انہیں آلیا اور انہیں غرق کر کے رکھ دیا۔

حضرت شعیبؑ بمقابلہ سرمایہ دار

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پھر حضرت شعیبؑ کو قوم مدین کی جانب مبعوث کیا۔ان کا پیشہ بھی گلہ بانی تھا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ تجارت پیشہ بھی تھے۔اس قوم کی حالت کا اندازہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اسی بستی میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے لگائیں:

جب حضرت موسیٰ مصر سے نکل کر روانہ ہوئے تو مدین کے قریب پہنچ کر انہوں نے ایک سایہ دار ٹھنڈی جگہ پر کچھ دیر آرام کرنے کا سوچا۔وہاں انہوں نے یہ منظر دیکھا کہ قریبی چشمے پر کچھ مویشی پانی پی رہے ہیں جبکہ دوسری جانب دو لڑکیاں دور کھڑی دیکھ رہی ہیں اور ان کے جانور پیاس کے مارے ان کے ہاتھوں سے نکل کر بیتابی سے پانی کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روک رہی ہیں۔حضرت موسیٰ کو اس معاملہ پر تعجب ہوا کہ وہ لڑکیاں اپنے مویشی چشمے کی جانب جانے سے کیوں روک رہی ہیں۔انہوں نے ان سے جا کر پوچھا تو لڑکیوں نے جواب دیا کہ:

”جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر چلے نہ جائیں گے،ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔اس لیے کہ یہ لوگ بہت سردار قبیلہ سے تعلق رکھنے والے اور بہت بااثر ہیں۔جبکہ ہمارے پاس کوئی مرد نہیں،صرف ایک بوڑھا اور لاغر باپ ہے۔“(سورہ القصص۔آیت 23)

حضرت موسیٰؑ نے یہ سن کر سوچا کہ میں تو مصر میں فرعون کی جانب سے بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے ہی پریشان تھا،لیکن یہاں تو صورتحال اس سے بھی زیادہ پریشان کن نظر آئی۔وہاں تو ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی،مگر یہاں تو قوم کا ہی ایک سردار

اور سرمایہ دار طبقہ دوسرے کمزور طبقہ کو پانی کے بھی قریب نہیں آنے دیتا۔دل میں سوچا کہ ان غریب لڑکیوں کی مدد کی جائے۔اٹھ کر ان لڑکیوں کی بکریوں کو پانی پلایا اور پھر درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔(سورہ القصص۔آیت 24)

''خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟''

یہ تھی قوم مدین کی معاشی حالت، جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق تھا،تو ان کی معیشت ویسی ہی تھی جیسی ایک سرمایہ دارانہ ذہنیت کے حامل عناصر کی ہوتی ہے۔یعنی ناپ تول میں ڈنڈی مارنا۔حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ:

''تمہیں چاہیے کہ اپنے معاشی نظام میں مساوات پیدا کرو۔ناپ تول کو پورا رکھو۔لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔اور معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہونے پر انہیں درست کرو۔اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو تو۔اور ایسا نہ کرو کہ زندگی کی ہر راہ پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔جو لوگ سچے نظام خداوندی کی آواز بلند کرتے ہیں،انہیں دھمکیاں دے دے کر اس راستہ سے نہ روکو اور انسانیت کی راہ میں مشکلات کھڑی کرنے کے ہی درپے نہ رہو''(سورہ الاعراف۔آیت 85،سورہ الشعراء۔آیات 181تا184)

شروع شروع میں اس قوم نے حضرت شعیب کی اس دعوت کو سنجیدگی سے نہ لیا اور ان سے صرف اتنا کہتے رہے کہ

قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ(سورہ الشعراء۔آیت 185)

ہمیں لگتا ہے کہ تم پر کوئی جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے جو کہتے ہو کہ خدا تم سے باتیں کرتا ہے،اور قوم کے مصلح بننے کی کوشش کر رہے ہو۔

انہوں نے کچھ عرصہ بعد خیال کیا کہ یہ شعیبؑ ایک مذہبی قسم کا مصلح ہے اور کسی نئے طریق پر پوجا پاٹ وغیرہ کرنا چاہتا ہے۔اس لیے اسے اس کی پوجا پاٹ کر لینے دو،اس سے ہمارا کیا جاتا ہے؟ پس انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری صلوٰۃ کی راہ میں مزاحمت نہیں کریں گے۔تم جیسے چاہتے ہو،ویسے پرستش کر لیا کرو۔

لیکن کچھ عرصہ بعد قوم کے سرداروں نے محسوس کیا کہ یہ شعیب جو کرنا چاہتا ہے،وہ تو صرف پرستش یا پوجا پاٹ ہے ہی نہیں،یہ تو کچھ اور ہی ہے۔پس انہوں نے شعیبؑ سے پوچھا کہ:

قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا

مَا نَشَاء (سورہ ہود۔آیت 87)

اے شعیب۔تم جو کچھ کہتے آئے ہو،اس سے تو ہم نے سمجھا تھا کہ تم پرستش وغیرہ کا کوئی نیا طریقہ لے کر آئے ہو،اس لیے ہم نے تجھے کچھ نہیں کہا۔ہمارا خیال تھا کہ تم ہمارے طریقہ کار کی بجائے اپنے کسی نئے طریقے سے پوجا وغیرہ کرنا چاہتے ہو،لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پرستش کا نہیں،تیری صلوٰۃ پرستش نہیں ہے۔یہ تو ہماری روزمرہ زندگی کے عملی شعبوں میں بھی دخل اندازی کر رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں۔کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ کہتی ہے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے اسلاف عبادت کرتے آئے ہیں،اور ہم جس طرح دولت کما رہے ہیں،اسی طرح اسے خرچ کرتے آئے ہیں،ویسے نہ کریں،اور ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے مطابق چلے۔یہ کیا معاملہ ہے؟یہ کیسی صلوٰۃ ہے؟

قارئین دیکھا آپ نے ؟مذہب میں صلوٰۃ کا مفہوم کیا ہوتا ہے اور دین میں صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟اس آیت سے واضح ہو گیا کہ دین کی رو سے صلوٰۃ قوم کے معاشی دائرہ کار کو بھی اپنے اندر سمو لیتی ہے اور اسی نظام کے قائم کرنے کا حکم رب نے ہمیشہ دیا ہے۔

بہر حال جب قوم نے دیکھا کہ یہ معاملہ تو ''بگڑتا'' چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک تو کچھ اور ہی ہے تو انہوں نے کھلے عام دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔

''اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے جو طاقت کے نشے میں دھت ہو رہے تھے،کہا کہ اے شعیبؑ،اب دو ہی کام ہونگے،یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ہمارا وہی پرانا مسلک دوبارہ اختیار کرنا ہوگا جسے تم سب چھوڑ چکے ہو،ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بستی سے نکال باہر کریں گے۔اب خود ہی سوچ لو کہ کیا کرنا ہے''(سورہ الاعراف۔آیت 88)

لہٰذا اس قوم نے اپنے پرانے چال چلن کو نہ چھوڑا اور وہ بھی اپنے غلط نظام سمیت تباہ و برباد ہو گئی۔(سورہ العنکبوت۔آیت 37)

حضرت موسیٰؑ بمقابلہ سرمایہ دار

پھر حضرت موسیٰ کا دور آتا ہے جنہیں بیک وقت اس شیطانی مثلث کے تینوں اراکین (ملوکیت،مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داریت) سے واسطہ پڑتا ہے۔فرعون: ملوکیت اور استبداد کا پیکر۔۔۔ہامان :مذہبی پیشوائیت کا سربراہ۔۔۔اور قارون: نظام سرمایہ داری کا خون آشام پیکر۔

جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے اپنی حکومت کو قائم رکھنے کے لیے اپنی قوم کو معاشی بلیک میل ہی کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ:

"اے میری قوم کے لوگو۔ ذرا غور کرو کہ یہ جو نہریں میرے کنٹرول میں چل رہی ہیں اور جن پر تمہاری ساری معیشت کا دارومدار ہے، کیا یہ میری نہیں؟ (سورہ الزخرف۔ آیت 51)

یہ درحقیقت قوم کو ایک بہت بڑی دھمکی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے موسیٰ کا ساتھ دیا تو اس پر نہروں کا پانی بند کر دیا جائیگا۔ فرعون کی حضرت موسیٰ کے ساتھ جنگ کی داستان بہت طویل ہے، یہاں فی الحال یہی بتانا مقصود ہے کہ فرعون تو ایک دوسری قوم کا فرد تھا جس نے ایک دوسری قوم (بنی اسرائیل) کو اپنی محکومیت کے پنجرے میں بند کر رکھا تھا لیکن:

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَى (سورہ القصص۔ آیت 76)

قارون تو خود موسیٰ کی ہی قوم کا فرد تھا۔

یعنی نظام سرمایہ داری ایسی بلا ہے جس میں کوئی باہر کا آدمی آپ کی قوم کا خون نہیں چوستا بلکہ اندر ہی سے ایک طبقہ اٹھ کر دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی غیر کی غلامی کو ہر شخص دل سے محسوس کرتا اور اس سے نجات کی کوششیں کرتا ہے (سوائے کچھ غداروں کے)۔ لیکن سرمایہ داریت ایسی لعنت ہے کہ یہ زیادہ تر قوم کے اندر ہی پیدا ہوتی ہے اور ہر شخص کے دل میں یہ حسد آمیز جذبہ پیدا کرتی ہے کہ وہ بھی ان عیش کرنے والے لوگوں جیسا بن جائے۔ لوگوں میں ہوس جنم لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

"ایک طرف وہ لوگ تھے جو قارون کو درست نظام پر عمل پیرا ہونے کی نصیحت کرتے تھے اور دوسری جانب وہ طبقہ بھی تھا جن کی نگاہوں کا مرکز زندگی کی عیش پرستیاں تھیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ جب قارون ٹھاٹھ باٹھ سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی ملتا۔ یہ بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے۔ (سورہ القصص۔ آیت 79)

دوسری طرف قارون کو نصیحت کرنے والے جب اسے کہتے کہ بھئی تمہیں کیا حق ہے کہ تم دوسروں کی محنت کی کمائی کو یوں قبضہ کر کے اکٹھی کرتے جا رہے ہو۔ تو وہ بھلا کیا جواب دیتا؟ وہی جو ہر زمانے کا سرمایہ دار دیتا چلا آیا ہے:

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ عِندِي (سورہ القصص۔ آیت 78)

میں نے یہ دولت اپنی ہنرمندی اور چالاکی سے حاصل کی ہے، اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق کیسے ہو گیا؟ اور کون مجھ سے اس بارے میں باز پرس کر سکتا ہے؟

یہ کشمکش جاری رہی حتیٰ کہ:

جب قارون کی بداعمالیوں کے نتائج کا وقت آ گیا تو ہم نے اسے اس کے مال و دولت سے بھرے آشیانے سمیت تباہ و برباد کر دیا۔اس وقت کوئی بھی ایسا نہ نکلا جو اس کی رب کے مقابلہ میں مدد کر پاتا۔نہ وہ خود ایسا کر سکا کہ اس تباہی کو روک لیتا۔سرمایہ دار کی ٹھاٹھ باٹھ اور جاہ و حشمت کے زمانے میں ایک گروہ ایسا ضرور دکھائی دیتا ہے جو لگتا ہے کہ اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیگا۔لیکن جب سرمایہ دار پر برا وقت آتا ہے تو کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔نہ ہی اس کی ہنرمندی اسے بربادی سے محفوظ رکھ پاتی ہے"۔(سورہ القصص۔آیت 81)

حضرت داؤدؑ بمقابلہ سرمایہ دار

پھر حضرت داؤدؑ کا دور آیا جس میں معاشی نظام کچھ ایسا تھا کہ قرآن اسے ایک قصہ کی شکل میں بیان کرتا ہے۔نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ بڑا سرمایہ چھوٹے سرمائے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے جیسے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں۔یوں امیر امیر سے امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ایک بار حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں:

ایک فریق نے کہا کہ فریق ثانی میرا بھائی ہے،لیکن دیکھو یہ میرا بھائی ہو کر میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہ رہا ہے۔اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی،جو میری کفالت کا واحد سہارا ہے۔اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے،یہ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دے دو۔چونکہ یہ امیر شخص ہے اور بااثر بھی۔پس یہ مجھے اپنی باتوں میں پھنسا لیتا ہے اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔یہ ہے اس بھائی کا مجھ سے سلوک۔اب بتائیں کہ کیا اس کا یہ مطالبہ برحق ہے؟(سورہ صٓ۔آیت 23)

یہ صرف اس غریب کے ساتھ ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ پورے معاشرے کی یہی حالت تھی۔اسی کی اصلاح کے لیے حضرت داؤد کو مبعوث کیا گیا تھا۔چنانچہ انہیں حکم ہوا کہ:

"(تم بلاخوف و خطر اور پرسکون رہ کر معاشرہ کی اصلاح کرو)،ہم نے تمہیں حکومت دی ہے،اس لیے کہ تم لوگوں کے معاملات میں برحق فیصلے کیا کرو۔اور کسی کے جذبات اور خیالات کو خود پر غالب کرنے کی ضرورت نہیں۔اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیں گے"(سورہ صٓ۔آیت 26)

حضرت عیسیٰؑ بمقابلہ سرمایہ دار

مسیحِ انسانیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب کا مقصد ہی یہودی سود خوروں کی بیخ کنی اور استبدادی رومی حکومت کے خلاف بغاوت تھا۔ یہودی خود سامنے نہیں آتے تھے، جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کے خلاف ہامان (مذہبی پیشوا) کو کھڑا کیا تھا، بالکل ایسے ہی یہودی احبار و رہبان حضرت عیسیٰ کے سامنے نہیں آتے تھے۔ ان مذہبی پیشواؤں پر حضرت عیسیٰؑ کی دعوتِ دین کی زد کیسے پڑتی تھی، اس سے آگاہی کے لیے لیے انجیل برناباس کا ایک اقتباس یہاں درج کرنا ضروری ہے:

''تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ بن گیا تو ہم کیا کریں گے؟ بہت بڑی مصیب کھڑی ہو جائیگی۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی عبودیت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ تقلیدی رسومات کو باطل قرار دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت میں ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقینی طور پر ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیے جائیں گے تو ہم پھر مجبور ہو جائیں گے اور پھر اپنی روٹی بھی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔

آخری فقرہ پر غور کریں۔ حقیقت یہی ہے کہ مذہبی پیشوائیت جہاں بھی رہی ہے، اس کا مسئلہ مذہبی ہوتا ہی نہیں، معاشی ہوتا ہے۔ چونکہ دینِ خداوندی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو تعمیری کام کیے بغیر دوسروں کی کمائی پر عیش کرے۔ اسی لیے مذہبی پیشوائیت کی اس نظام میں گنجائش ہوتی ہی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی احبار و رہبان حضرت عیسیٰ کی اس انقلابی دعوت کی شدید مخالفت پر اتر آئے تھے۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ بمقابلہ سرمایہ دار

پھر وہ دور آیا جب دین آخری (Ultimate) روپ میں مکمل کر کے انسانیت کے حوالے کر دیا گیا۔ اب مزید کسی ''انگلی پکڑ کر چلانے والے'' نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ انسانیت اتنی پختہ (Mature) ہو چکی تھی کہ وہ خدائی انگلی پکڑے بغیر خود صرف ہدایات پر چلتے ہوئے اپنے لیے انسانی فلاحی نظام قائم کر سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک آخری، جامع ترین اور مکمل ضابطہ حیات کا پیش کرنا ضروری ہو گیا تھا جو ہمیشہ انسانوں کے پاس محفوظ رہے کہ یہ جب بھی بھٹکیں، خود ہی اس سے رہنمائی پا لیں۔

پس نبوت کا آخری تاج عرب کے محمد بن عبداللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو پہنایا گیا۔ پھر کیا ہوا؟ نظامِ سرمایہ داری کے حاملین اور قبیلہ قریش کے سرداروں کی جانب سے اس کی مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ اپنے پرائے سب دشمن بن گئے۔ سگا چچا ابولہب،

ابوجہل وغیرہ اس دعوتِ انقلاب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس سے قبل تولیتِ کعبہ وحج وغیرہ کی کمائی کھا رہے تھے۔یعنی مکہ کی مذہبی پیشوائیت۔

ہمارا مروجہ مذہبِ اسلام جو کہ قرآنی دین نہیں بلکہ ہمارے دورِ ملوکیت کا تیار کردہ نصاب ہے، جسے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد صرف اتنا بتاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب قبیلے بدترین رسومات میں مبتلا تھے۔شراب خوری، جوا، قمار بازی، باہمی جنگ وجدل، فساد، تو ہمانہ رسومات ان کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن کر رہ گئی تھیں اور رسول ﷺ انہی رسومات کو مٹانے کے لیے تشریف لائے تھے۔وہ لوگ بت پرست تھے اور آپ ﷺ اسے شرک قرار دیتے تھے۔

یہاں میرا سوال یہ ہے کہ یہ جو نبی کی اپنی قوم قریش اور ان کے ساتھی قبائلِ عرب نے اس انقلابی دعوت کی مخالفت میں جانوں تک کی بازی لگا دی تھی، کیا اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ ان عادات ورسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جو عام اخلاقی اصولوں کی رو سے ہی قابلِ نفرت تھیں۔زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ بت پرست تھے، اور بت پرستی چونکہ شرک ہے، پس رسول اللہ ﷺ اسی کی بیخ کنی کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے تو خود مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ کفار کے معبودوں کو گالیاں مت دو، انہیں برا بھلا مت کہو۔پس رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ میں اشتعال انگیزی کا عنصر تو موجود ہی نہیں تھا۔دوسری بات یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے زبردستی تو روک سکتے ہی نہیں تھے، بیشک وہ بت پرست ہی تھے۔تو پھر آخر وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا خطہ عرب رسول اللہ ﷺ کی اس دعوت کے خلاف میدان میں اتر آیا تھا؟ خصوصاً جب جماعتِ مومنین مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ بسے تھے۔تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور مسلسل چھ سات سال تک زور کے معرکے ہوتے رہے۔دونوں فریق اپنی جانیں گنواتے رہے۔۔۔؟؟؟

اس سوال کا جواب ہمارا مذہبی طبقہ تو بالکل ہی نہیں دے سکتا۔اس کا جواب البتہ ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے۔کہتا ہے کہ:

”جب چین میں امریکہ کے کٹھ پتلی چیانگ کائی شیک کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو کس قدر شرمندگی اٹھانی پڑی، وہ ظاہر ہے۔امریکی حیرت زدہ تھے کہ ان کی اتنی سپورٹ کے باوجود کائی

شیک یوں ناکام کیوں ہوگیا؟ایک مشہور امریکی صحافی جیک بیلڈن نے چین کا دورہ کرنے کے بعد ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام تھا(China shakes the world)۔اس کتاب کے مقدمہ میں وہ انقلابِ چین کے اسباب دریافت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"نہ تو امریکی حکومت اور امریکی پریس اور نہ ہی امریکی عوام اور ان کے نمائندے جو فارایسٹ کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں،اور نہ ہی کاروباری وفوجی حلقے اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد سے آگے لے جاتے ہیں تا کہ وہ چین والوں کے درد اور جذبات سے بھرپور دلوں تک پہنچ سکیں"

اس کے بعد بیلڈن نے اس عظیم انقلاب کی وجوہات ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

"ان تمام لوگوں کو جو اس انقلاب کی حقیقی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں،محمد کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ:

"نہیں۔تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ بیٹھے ہو۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تمہارہ جاتا تھا۔اور ایکدوسرے کو اس بات کی تلقین نہیں کرتے تھے کہ جس کی چلتی گاڑی رک جائے،اس کی معاش کا بندوبست کرنا کتنا ضروری ہے"(سورہ الفجر۔آیات 15تا18)

یہ تھا رسول اللہ ﷺ کا وہ انقلاب جس کی اہل مکہ مخالفت کرتے تھے۔رسول اللہ ﷺ ان کے پورے سماجی،سیاسی اور معاشی نظام کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔قریش بہت بڑے تاجر تھے۔اتنے بڑے کہ قرآن بتاتا ہے کہ:

إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ(سورہ قریش۔آیت 2)

انکے تجارتی قافلے سارا سال ادھر ادھر رواں دواں رہتے تھے۔

ایک جانب تجارت،دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔اسی سے ان کا پورا معاشی نظام سرمایہ داری چلتا تھا۔اور رسول اللہ کا انقلابی پیغام اسی کو ختم کرنے کے لیے اٹھا تھا۔وہ اب اس پیغام کی مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟

سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ ابوجہل نے جب کعبہ کے غلاف کو پکڑ کر جب اس نئی تحریک کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی تو اس نے یہ کہا تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں مزدک (ایران میں اشتراکی نظام کا داعی) لے کر آیا تھا۔محمد ﷺ کو یہ نیا سبق سلمان فارسی نے پڑھایا ہے (معاذ اللہ)

انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ مفاہمت کرنے کے لیے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا،اس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا(سورہ المدثر۔آیت 12)

وہ بہت مال و دولت رکھتا تھا۔

ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو، تم نے اگر اپنا چال چلن درست نہ کیا تو تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو تم سے پہلی قوموں کا ہوتا رہا ہے۔ وہ بھی بہت مال و دولت اور قوت رکھتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ (سورہ الروم۔ آیت 9)

اب ان کے صرف تباہ شدہ کھنڈرات ہی باقی بچے ہیں۔ (سورہ القصص۔ آیت 58)

اس لیے تم جو اپنے مال و دولت پر نازاں ہو، تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا، کیونکہ اللہ کا یہ اٹل قانون ہے کہ:

"جو بھی مال و دولت جمع کرتا ہے اور پھر گنتی کرتا جاتا ہے، اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔" (سورہ الھمزہ۔ آیت 3-1)

یہ جو تم کعبہ سے اپنی نسبت رکھ کر اتنے مفادات حاصل کرتے ہو کہ تمہیں نہ بھوک کا کوئی خوف ہے نہ کسی قسم کا خطرہ لاحق، تو تمہیں عملی محکومیت بھی اسی رب کی اختیار کرنی چاہیے جس کا یہ کعبہ ہے۔ (سورہ القریش۔ آیت 4-1)

لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں بڑھتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کے بدترین انجام پر رب نے مہر تصدیق ثبت کر دی تو پھر قرآن نے ان ہی کے ایک نمائندہ ابولہب کا نام لے کر اسے تباہی کی وعید سنائی:

مَا أَغْنَى عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ (سورہ الہب۔ آیت 2)

اس نے جس قدر دولت کے انبار لگا رکھے تھے، وہ اس کے کسی کام نہ آئے۔

قصہ مختصر، اللہ کی جانب سے جو دین ہمیشہ سے پیش کیا جاتا رہا ہے، اس کی مخالفت اسی شیطانی مثلث (ملوکیت، سرمایہ داریت اور مذہبی پیشوائیت) کی جانب سے ہوتی آئی ہے۔ اور ان تینوں عناصر میں سرمایہ دارانہ ذہنیت غالب ہے۔ اللہ نے واضح الفاظ میں اس بات کا اشارہ دے دیا:

"(اس اصولی حقیقت کو سامنے رکھو کہ) کوئی قوم اور بستی ایسی نہیں تھی کہ وہاں ہم نے اپنا رسول نہ بھیجا ہو جو انہیں ان کی بدچلنی اور غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے آگاہ نہ کرتا تھا اور وہاں کے دولتمند اور سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس تو مال و دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور ہماری افرادی قوت بھی بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کسی کی کیا مجال کہ کوئی ہمارا کچھ بگاڑ سکے۔ (سورہ سباء۔ آیت 35)

یعنی اب تک جو بات یہاں انبیاء کے تذکرہ کے ساتھ بتدریج بیان ہو رہی تھی، اسے قرآن میں اللہ نے ایک آیت میں ہی بیان کر دیا کہ دین جہاں بھی ہوگا، اس کی مخالفت صرف سرمایہ دار طبقہ ہی کرے گا۔ جن کے مفادات پر اس سے زد پڑتی

ہے۔جہاں بھی دین آیا،مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ہر جگہ۔ہر دور میں۔اوران کے پاس دلیل بھی یہی ہوتی تھی کہ یہ نظامِ سرمایہ داری ہمارے اسلاف سے چلتا آ رہا ہے،پس ہم اسے ترک نہیں کر سکتے۔

"اوراسی طرح ہم نے کسی بستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولت مند طبقہ (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس راہ پر چلتے دیکھا ہے،ہم اس راستہ سے ایک قدم بھی ہٹنے کو تیار نہیں"
(سورہ الزخرف۔آیت 23)

سورہ الانبیاء میں ان لوگوں کے انجام کو بہت دلچسپ انداز میں بتایا گیا ہے کہ:

"اگر تم نے اپنی زندگیوں کو قرآن کے مطابق ڈھال لیا تو تمہیں عظمت وسربلندی حاصل ہوگی،لیکن اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جیسے تم سے پہلی قومیں مٹ گئی تھیں جنہوں نے ظلم وناانصافی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔وہ تباہ ہوگئیں اوران کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی" (سورہ الانبیاء)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آتے ہیں تو:

"ان کا سرمایہ دار طبقہ مال و دولت کے نشے میں دھت ہو کر تمام حدیں پار کر جاتا ہے۔محنت کی بجائے سرمایہ کی کمائی کھانے کی عادی ہو جاتی ہیں،سرمایہ داریت قوم پر بری طرح مسلط ہو جاتی ہے اور درست نظام کو چھوڑ کر غلط راستے پر قائم رہتی ہے۔یوں پھر وہ ہلاک ہو جاتی ہے اوراس کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہتا۔(سورہ بنی اسرائیل۔آیت 16)

قوموں کی تباہی میں سب سے زیادہ عتاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر نازل ہوتا ہے۔کیونکہ غریبوں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو لٹ جائے یا انہیں لٹنے کا ڈر ہو۔

"حتیٰ کہ اس قوم کا عیش کرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر بری طرح واویلا مچاتا ہے"
(سورہ المومنون۔آیت 64)

فیصلہ کن نکتہ

قرآن کی جانب سے پیش کردہ قوموں کی تاریخ اوران کی بداعمالیوں کے سبب تباہی کی اصلی وجہ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔اور یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ دین کی رو سے سرمایہ پرستی کا کی کیا پوزیشن ہے۔یہاں دودھ کا دودھ،پانی کا پانی ہو چکا ہے،مگر پھر بھی قارئین کے دلوں میں کوئی اضطراب یا کنفیوژن ہے تو پھر ذرا یہ بھی سن لیجیے:

جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اوراس میں پڑے بدکردار چلا رہے ہیں۔پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ان سے

کیا جرم سرزد ہوا ہے؟ جو اس قدر شدید عذاب میں گرفتار ہیں؟

یہ سوال ہے۔ اب اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُتْرَفِينَ (سورہ الواقعہ۔ آیت 45)

یہ سابقہ سرمایہ داروں اور مفت خوروں کا طبقہ ہے۔

اس پہ مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

سرمایہ داریت کا طریقہ واردات

ہوتا یہ رہا ہے کہ جب تک اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم رہتا تھا، نظام سرمایہ داری کے حاملین کی کوئی پیش نہیں چلتی تھی۔ اسی لیے وہ دوسرا حربہ اختیار کرتے تھے۔ وہ اسی دین کے ہی نام لیواؤں میں سے کچھ مفاد پرست لوگوں کے گروہ کو اپنے ساتھ ملا لیتے تھے جو کرتا یہ تھا کہ دین کو مسخ کر کے اسے مذہب کی سطح پر لے آتا اور پھر یہ نیا مذہب نظام سرمایہ داری کا خوب حامی بن جاتا۔ یوں سادہ لوح عوام ان کے جال میں گرفتار ہو کر اسے ہی اصلی دین سمجھ بیٹھتے تھے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرمایہ داری نظام مذہب کی حمایت کے بغیر ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ محنت کش طبقہ کو چاہے کتنا ہی معذور و مجبور کیوں نہ کر دیا جائے، وہ کبھی بھی برضائے قلب اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی محنت کی کمائی دوسرے لوٹ کر لے جائیں۔ یہ ''فریضہ'' مذہبی پیشوائیت سرانجام دیتی ہے جو غریبوں کو یہ ''افیون'' پلا پلا کر بے سدھ کیے رکھتی ہے کہ:

''دیکھو۔ اللہ نے رزق اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے چھپر پھاڑ کر دے، اور جسے چاہے، فقیر و محتاج کر دے۔ انسان کو اللہ کی اس ''مرضی'' پر قطعاً احتجاج نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کفر ہے۔ امیروں کی دولت پر اعتراض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی تقسیم سے راضی نہیں۔ یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ انسان کو ہر حال میں اللہ سے راضی رہنا چاہیے۔ ان کو بھی دیکھو جن کے پاس یہ بھی نہیں جو تمہارے پاس ہے۔ ویسے بھی یہ روپیہ پیسہ صرف دنیاوی مال ہے جو فانی ہے۔ یہ دولت چند روزہ ہے۔ یہ سرمایہ، محلات، جائیدادیں، یہ سب یہیں رہ جانی ہیں۔ اصلی زندگی تو صرف آخرت کی زندگی ہے اور آخرت صرف غریبوں کے لیے ہے۔ تم سب اسی کی تیاری کرو۔ خود سرورِ کائنات محمد ﷺ نے اپنے لیے غریبی پسند کی تھی اور فرمایا تھا کہ یہ غریبی میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ آپ ہمیشہ دعا کرتے تھے کہ یا اللہ مجھے ہمیشہ غریبوں میں ہی رکھنا اور غریبوں

میں اٹھانا۔اسلام غریبوں میں پیدا ہوا تھا اور غریبوں میں ہی باقی رہے گا (اس قسم کی روایات کو یہ مذہبی طبقہ اپنے حقیقی مفہوم سے الگ کر کے اپنے مطلب کے حساب سے پیش کرتا ہے)۔

اس قسم کی ''مقدس'' باتیں یہ مذہبی طبقہ غریبوں اور محنت کشوں کے کان میں ڈالتا ہی رہتا ہے اور یوں انہیں یہ افیون پلا پلا کر اپنی حالت پر ''شاکر'' رہنے کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔اس طرح سرمایہ داریت کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں جس کا تمام تر کریڈٹ سرمایہ داروں کے ان ایجنٹوں مذہبی پیشوائیت کو جاتا ہے۔

اب دیکھیے کہ مذہب پرست طبقہ کو اپنی اس ''خدمت'' کے عوض کیا ملتا ہے؟ قابلِ غور نکتہ ہے قارئین۔توجہ دیجیے۔یہ طبقہ خود کوئی کمائی نہیں کرتا۔یہی وجہ ہے کہ عوام کو ''صبر و شکر'' کی اس افیون پلانے کی خدمت کے صلے میں سرمایہ دار طبقہ ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

پچھلے ادیان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا آیا اور پھر اسلام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔جو حشر ان انبیاء کے ادیان کا ہوا، وہی اسلام کا کیا گیا۔بلکہ اس سے بھی بدترین حشر۔سرمایہ دار طبقہ نے اس کی مخالفت کی لیکن پھر بھی یہ دین قائم ہو کر رہا۔نظامِ سرمایہ داریت کے حاملین شکست کھا کر کونوں کھدروں میں جا گھسے۔لیکن نبی کی وفات کے بعد انہوں نے پھر سر نکالا اور اپنی روایتی سازش شروع کر دی جو فاروق اعظمؓ جیسے عظیم دور اندیش خلیفہِ راشد کی شہادت کے بعد قوت پکڑ گئی۔خلافت کی جگہ ملوکیت آ گئی اور دین نے مذہب کی شکل اختیار کر لی۔اب بادشاہوں کے لیے مساجد کے منبروں سے ایدہ اللہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگی جانے لگیں اور سرمایہ دار طبقہ کو یہ کہہ کر بے لگام چھوڑ دیا گیا کہ اگر تم بادشاہ کو اس کا ٹیکس اور ہمیں (مذہبی پیشواؤں کو) ہمارا ٹیکس (زکوٰۃ) دیتے رہو تو پھر تمہیں اجازت ہے کہ تم دولت کے جتنے چاہے انبار لگاؤ، جتنی مرضی جائیدادیں کھڑی کرو۔

بس پھر کیا تھا۔۔۔اسی مذہب کی تائید میں روایات گھڑنا شروع کی گئیں۔تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔قرآن کے اپنی مرضی کے تراجم و تفاسیر کی گئیں اور خود صحابہ کرامؓ کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی شکل میں دکھایا گیا۔آج بھی ڈاکٹر اسرار احمد جیسے مذہبی پیشوا ''شوپیس'' ٹی وی چینل پر بیٹھے وعظ فرماتے نظر آئیں تو وہ حضرت عثمانؓ کے ذکر پر انکے نام کے ساتھ ''غنی'' کا لفظ لگانے سے کبھی نہیں چوکتے۔

کیا صحابہ کرامؓ کے پاس دولت کے انبار تھے؟

ہماری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑے بڑے صحابہ عظامؓ کے پاس دولت کے انبار ہوتے تھے۔لیکن اگر تاریخ کا یہ بیان درست ہے تو یہ اسی زمانہ کی بات ہوسکتی ہے جب اسلام اپنی حتمی شکل میں قائم نہیں ہو پایا تھا، ورنہ یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن تو ارتکازِ دولت اور روپیہ پیسہ کا ڈھیر لگانے سے سختی سے منع کرے، رسول اللہ ﷺ بھی اس پر تاحیات عمل پیرا رہیں اور کچھ بھی جمع نہ کریں، لیکن صحابہ کرامؓ اس حکم کے خلاف زندگی بسر کریں۔۔۔۔؟؟؟ قرآن نے تو صحابہ کرامؓ کی خصوصیت بتائی ہے کہ وہ

''سمعنا واطعنا''(سورہ البقرہ۔آیت 285)

ہم نے سن لیا۔اور ہم اطاعت کریں گے۔

ایسے نفوسِ مقدسہ سے قرآنی تعلیمات کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ جس امر کی شہادت قرآن دے دے، اس کے خلاف تاریخ کے چند تو کیا لاکھوں صفحات اور لاکھوں انسان بھی بیان دیں تو وہ پھر بھی قابلِ تسلیم نہیں ہوگا۔

بنیادی اصول یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے سچے پیروکار تھے اور رسول اللہ ﷺ کی اپنی زندگی قرآن کریم کے عین مطابق تھی، اسی لیے اگر ہمیں تاریخ میں رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ یا ازواجِ مطہرات کے خلاف کوئی ایسی بات نظر آئے جو قرآن کے بتائے ہوئے ان اصولوں کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تامل اس بات کو غلط کہہ کر رد کر دینا چاہیے۔کیونکہ قرآن تو خود نبی ﷺ اور انکے جانثار اور کامل الایمان ساتھیوں کی زندگیوں کے قرآن کے عین مطابق ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ایک طرف قرآن ہو اور دوسری طرف عام گناہگار انسانوں کی لکھی ہوئی تاریخ، تو ہمارے لیے قرآن کی بات ہی معتبر اور قابل تسلیم ہوگی۔کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے۔''ذلك الكتاب لاريب فيه''(سورہ البقرہ۔آیت 2)۔

اگر اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو رسول اللہ ﷺ، ازواجِ مطہراتؓ اور صحابہ کرامؓ کی حقیقی سیرتِ طیبہ ہمارے سامنے آسکتی ہے۔

بات ہو رہی تھی دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی، تو یہی مذہب ہے جو اس وقت سے لے کر آج تک ہمارے ہاں اسلام کے نام سے چلا آ رہا ہے جو دین کی شدید ترین ضد ہے۔سرمایہ داروں نے تو دین کی ہمیشہ مخالفت کی تھی، جیسا کہ پیچھے میں نے آپ کو انبیاء کی تاریخ کے حوالہ سے واضح کیا، لیکن ہم آج دیکھتے ہیں کہ ہمارے آج کے مروجہ مذہب اسلام کا سب سے بڑا حامی سرمایہ دار طبقہ ہی ہے۔کہیں یہ عظیم الشان مساجد تعمیر کروا رہے ہیں، کہیں ان مساجد کی تزئین و آرائش پر لاکھوں

کروڑوں خرچ کر رہے ہیں ۔کہیں مذہبی دارالعلوم اور مدارس کھولے اور انہی کے روپے سے چلائے جارہے ہیں۔ان مساجد میں آئمہ وعلماء حضرات کی روزی روٹی کے کفیل بھی یہی بڑے بڑے سرمایہ دار لوگ ہیں۔دنیا بھر میں مذہبی رہبانیت کا درس دینے والی جماعتیں (تبلیغی جماعت اور دعوتِ اسلامی اور دیگر مذہبی گروہ) بڑے بڑے یہودی سرمایہ داروں کے فنڈز اور سپورٹ سے چل رہی ہیں ۔انہیں کھلی آزادی ہے کہ سرمایہ داروں کے مغربی ممالک میں جہاں چاہیں پھریں اور ''تبلیغ'' کریں ،لوگوں کو دینِ اسلام کی بوتل میں مذہبی افیون ڈال کر پلاتے جائیں اور ان کو مدہوش کرتے جائیں ۔ان کو آخرت کی فکر پر لگائیں، دنیا سے دور کریں۔

یہ سرمایہ دار طبقہ (مقامی اور عالمی یہودی سرمایہ دار مترفین) مروجہ دینِ اسلام کی حمایت کیوں کرتا ہے؟ یہ اس بات کی محکم دلیل ہے کہ یہ اسلام وہ دین ہے ہی نہیں جو رب کی وساطت سے رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا۔اگر یہ تسلیم کریں کہ یہ وہی دین ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی یہ قرآنی شہادت معاذ اللہ جھوٹی ثابت ہوتی ہے کہ:

''دین جہاں بھی ہوگا سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا'' (سورہ سباء۔آیت 34)

جبکہ سرمایہ دار طبقہ تو ہمارے مروجہ اسلام کی اس قدر حمایت کرتا ہے اور ہمارے ہاں موجود مذہبی پیشوائیت اسلام کی علمبردار بن کر سرمایہ داروں کو خدمت کے عوض جنت کے لائسنس عطا کرتے جاتے ہیں ۔

چونکہ مروجہ اسلام کی رو سے جنت کن کاموں کے عوض ملتی ہے؟ مساجد تعمیر کرانا، ان کی تزئین وآرائش، اشاعتِ ''دین'' کے لیے مالی امداد، صدقات وخیرات، زکوٰۃ، حج، بڑے بڑے مدرسے بنوانا، نذر ونیاز ۔ظاہر ہے کہ یہ ''ثواب'' کے کام صرف دولتمند سرمایہ دار طبقہ ہی انجام دے سکتا ہے ۔غریب تو بیچارے اس قابل ہی نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے دنیا بھی سرمایہ داروں کی ہی ہوتی ہے اور آخرت بھی انہی سرمایہ داروں کی ۔یہی وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں سورہ کہف میں دو آدمیوں کا قصہ بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھایا ہے جہاں ایک سرمایہ دار کو اس کا دوست یہ سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ دنیاوی دولت کی فراوانی پر نازاں مت ہو، اس وقت تو تم خود کو محفوظ سمجھتے ہو، لیکن قیامت میں تمہارا کیا انجام ہوگا ؟ تو اس نے کہا:

''میرے بھائی، تمہاری یہ باتیں محض وہم ہیں ۔میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کی گھڑی جس سے تو مجھے ڈراتا ہے، کبھی آئے گی ۔اگر آ بھی گئی اور مجھے رب کے حضور جانا بھی پڑا تو مجھے وہاں بھی بہتر ٹھکانا ہی ملے گا'' (سورہ الکہف۔آیت 36)

''میں نے تو کئی مسجدیں بنوائی ہیں، مدرسے تعمیر کیے ہیں، مجھے ہر مسجد کے عوض جنت میں ایک محل اور وہ بھی یاقوت وزمرد کا بنا ہوا الاٹ ہوگا۔ جہاں بہتر حوریں میرے آگے پیچھے پھریں گی۔اس کے علاوہ میں صدقہ خیرات بھی کرتا ہوں۔میں نے کئی حج کیے ہیں۔تمہیں تو پتا ہی ہے کہ حج کرنے سے انسان ایسا معصوم ہو جاتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے نکلا ہو۔تمام سابقہ گناہ دھل جاتے ہیں۔

اور بھائی میں تو زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔جس سے میرا بقیہ مال پاکیزہ ہو جاتا ہے۔اس لیے قیامت میں جنت کے عیش میرے ہی حصہ میں آئیں گے۔بخشش اور نجات میرا مقدر ہے۔

یہ ہے وہ ''جنت'' کی ضمانت جو مذہبی پیشوائیت سرمایہ دار طبقہ کو دیتی رہتی ہے۔اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے من گھڑت روایات کا انبار لگا رکھا ہے۔

لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی کتاب ہمارے پاس اصلی شکل میں موجود ہے۔پس ان کا خود ساختہ مذہب اور اس کی تائید میں وضعی روایات وتفاسیر قرآن کی اس شہادت کو کبھی بھی نہیں چھپا سکتیں کہ:

''سرمایہ دار طبقہ جہاں بھی ہوگا، ہمیشہ دین کی مخالفت کرے گا''۔(سورہ سباء۔آیت 34)

یعنی دین اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی شدید ضد ہیں (یہ اصول اپنے ذہن میں نقش کر لیجیے)

جہاں دین قائم ہوگا، وہاں سرمایہ داریت نہیں ہوگی، اور جہاں سرمایہ داریت ہوگی، سمجھ لیجیے وہاں دین موجود نہیں۔جب یہ حقیقت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دار اللہ کی اس جنت کی شکل بھی دیکھ سکے جو حقیقی دین کا اتباع کرنے سے ملتی ہے۔''دینداری'' کے وہ کام جن کے عوض مذہبی پیشوائیت سرمایہ داروں کو جنت کے لائسنس الاٹ کرتی ہے، دین کے میزان میں ان کا وزن کیا ہوتا ہے؟ ذرا قرآن کی زبان سے اسے بھی سن لیں:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لاَ يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ وَاللَّهُ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ

(سورہ التوبہ۔آیت 19)

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کے ''ثواب'' کے کام۔۔۔مثلاً حجاج کے لیے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تزئین و آرائش کا سامان مہیا کرنا۔۔۔اس شخص کے اعمال کے برابر ہو جائیں گے جو اللہ کے دین کی بنیادی حقیقتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس نظام کے قیام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا ہے۔اگر تمہارا ایسا کوئی خیال

ہے تو کرتے رہو۔اللہ کے نزدیک تو یہ برابر ہو ہی نہیں سکتے۔

اس قسم کے ''عبادت گزاروں'' کے متعلق بھی حکم ہے کہ:

''ان دکھاوا کرنے والے نمازیوں کا انجام تباہی ہے جو اس طرح کی پرستش سے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور دین کی عملی تکذیب کرتے ہیں۔یعنی ایک طرف نمازیں پڑھ کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے مومن صورت اور پرہیز گار دین دار ہیں۔لیکن دوسری جانب ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اس رزق پر جسے پانی کی طرح ہر ایک کے لیے یکساں انداز میں بہتے رہنا چاہیے تھا،بند باندھ کر اسے اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔(سورہ الماعون۔آیات 7-1)

ان کا انجام کیا ہوگا؟ یہ بھی سن لیجیے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (سورہ التوبہ۔آیت 34)

''جو لوگ پیسہ جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کے اجتماعی مفاد (فی سبیل اللہ) کے لیے کھلا نہیں رکھتے۔،اے رسول تم ان کے لیے ایک المناک عذاب کا اعلان کر دو۔جب ان کی اس دولت کو جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس سے ان کی پیشانی،پہلو اور پشت کو داغا جائیگا اور کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ دولت جو تم اپنی ذات کیلیے سمیٹ کر بیٹھ گئے تھے،اب اپنے سرمایہ کا مزہ چکھو۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا بھر میں 2 بلین لوگ ایسے ہیں جنہیں بجلی کی سہولت میسر ہی نہیں۔

دنیا کے 80 ممالک ایسے ہیں جہاں فی کس آمدن بڑھنے کی بجائے گزشتہ عشرہ سے بھی کم ہوگئی ہے۔

دنیا بھر میں ہر چار میں سے تین لوگ ایسے ہیں جو اپنی پچاسویں سالگرہ نہیں دیکھ پاتے۔

www.theodora.com/maps

9 عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ میں ملکیتِ اراضی کا نظام

جیسا کہ مضمون ہٰذا کی ابتداء میں بتایا گیا کہ خالقِ کائنات نے جب انسان کو اس زمین پر پیدا کیا تو جن چیزوں پر اس کی زندگی اور پرورش کا دارومدار تھا، انہیں پہلے سے ہی مہیا کر دیا۔ انسانوں کے ساتھ نہیں بلکہ انسانوں کی پیدائش سے بھی لاکھوں سال پہلے۔ پانی، ہوا، روشنی، حرارت، سب انسان کی پیدائش سے بھی پہلے اس کرہ ارض پر بکھرے پڑے تھے۔ یعنی اللہ کی جانب سے بلا معاوضہ عطا کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو خوراک کی بھی ضرورت تھی، تو زمین کے اندر بھی خزانے مدفون تھے اور اوپر بھی۔ اس وقت دنیا میں انسانی آبادی بہت کم تھی، زمین کی پیداوار کی اس قدر کثرت تھی کہ کسی کے دل میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مجھے بھوک لگی تو میں کہاں سے کھاؤں گا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی اسی زندگی کو جنتِ ارضی کہہ کر پکارا ہے جہاں کیفیت یہ تھی کہو

وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا (سورہ البقرہ۔ آیت 35)

جہاں کسی کو بھوک لگے، پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا تھا۔

پھر انسانی زندگی اس سے ذرا آگے بڑھی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ زمین کھود کر بذریعہ کاشتکاری اس سے خوراک حاصل کی جائے۔ اس سے انسانی زرعی معیشت کا دور شروع ہوا۔ زمینیں کھلی پڑی تھیں۔ ہر شخص، خاندان یا قبیلہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اسے کاشت کر کے خوراک پیدا کرنے لگ گیا۔ پھر صنعت و حرفت کا دور آیا۔ اسی زمین کے سینے پر بڑے بڑے کارخانے، فیکٹریاں لگائی گئیں۔ لیکن ان میں اشیاءِ ضروریہ بنانے کے لیے جو خام مال استعمال ہوتا ہے، وہ بھی اسی زمین سے نکلتا ہے۔

سرمایہ داری نظام کا آغاز

انسانی تاریخ کا وہ بدترین دن تھا جب کسی غلام نے اپنے مالک کو اس قدر کما کر دے دیا جو ان اخراجات سے زائد تھا جو مالک غلام پر خرچ کرتا تھا۔ یوں ہوا یہ کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لیے آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ یہیں سے نظامِ سرمایہ داری

کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔اگر چہ وہ صنعتی دور نہیں تھا کہ مالک غلاموں سے کچھ اشیاء بنوا کر اپنے لیے آمدنی حاصل کرتے۔وہ زرعی معیشت کا دور تھا۔اس لیے اس دور میں غلاموں سے صرف زمین ہی کاشت کروائی جاسکتی تھی۔اس مقصد کے لیے صاحبِ اقتدار لوگوں نے زمین کی حد بندی کرنی شروع کر دی۔اسے انسانوں کی ملکیت بنانے لگ گئے۔قرآن نے اس انسانیت کش تصور کو سختی سے رد کیا اور زمین یعنی رزق کے سرچشمہ پر کسی کی ذاتی ملکیت کو انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا۔یہ مفصل وضاحت مضمون میں گزر چکی ہے۔

قرآن نے ایک اصول دیا کہ زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہوسکتی۔الارض للہ۔اسے مملکت کے اجتماعی نظام کی تحویل میں رہنا چاہیے اور وہی اس کا نظام کچھ اس طریقے سے کرے کہ اس سے تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ رزق یکساں طور پر ملتا چلا جائے۔

اب قرآنی ریاست جیسا کہ آپ کو گزشتہ باب میں بتایا گیا کہ ایک ہی دن میں وجود میں نہیں آجاتی۔انسانی معاشرہ میں ایسی تبدیلی عمل میں لانے میں مدتیں درکار ہوتی ہیں۔یعنی یہ ارتقائی عمل بتدریج چلتا رہتا ہے۔

بالکل اسی اصول کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اپنے انقلاب کا آغاز کیا تو مکہ چونکہ بنجر اور ویران علاقہ تھا،اس لیے وہاں زرعی اصلاحات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ویسے بھی اس وقت قرآنی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔البتہ مدینہ میں انصار کے پاس زرعی زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات تھے جن میں وہ کاشتکاری کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کی ابتداء وہیں سے کی گئی۔اس سلسلہ میں رسول اللہ نے ایک واضح اعلان فرمایا کہ:

”ان الارض ، ارض اللہ، والعباد عباد اللہ “(مسند ابی داؤد)

زمین بھی اللہ کی ہے اور انسان بھی اللہ کے بندے ہیں۔اس لیے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لیے رہنی چاہیے۔

جاگیردارانہ نظام اور زمینداری کی ممانعت

قرآن کریم پر غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام میں مروجہ زمینداری و جاگیرداری نظام کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔جب ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے تو پھر یہ مسئلہ بھی زیر بحث آئے گا کہ قرآن میں ملکیت کا حقیقی تصور ہے کیا۔انفرادی ملکیت کی کیا حیثیت ہے اور اگر قرآن انفرادی ملکیت کو جائز کہتا ہے تو اس ضمن میں کیا فرد واحد بلا تخصیص و تحدید مختلف اشیاء کا مالک ہوسکتا ہے یا پھر اللہ نے اس ضمن میں اس پر کچھ حدود وقیود اور شرائط بھی عائد کی ہیں۔

ملکیت کا قرآنی تصور

یہ بات درست ہے کہ قرآن نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے لیے کچھ حدود و قیود اور شرائط بھی عائد کی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسی اقسام کے اموال بھی ہیں جن کے لیے قرآن انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم تو کرتا ہے مگر اس حقِ ملکیت کی حیثیت بھی عینی (Ultimate) نہیں بلکہ وکالتی یا امانتی ہے۔ غور کیا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں معاشرہ کی طرف سے ایک وکیل کی سی ہے۔ ورنہ عام طور پر مال معاشرہ کی ہی ملکیت میں ہے۔ اور وہ معاشرہ بھی اس مال کی عینی مالک نہیں بلکہ وہ بھی اللہ کی جانب سے نیابتاً ہی اس میں حقِ تصرف رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ اصول تو بہر حال طے شدہ ہے کہ ہر چیز کا مالکِ حقیقی اللہ کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ انسان کو صرف اس مال پر وکالتی یا امانتی ملکیت حاصل ہے، عینی ملکیت نہیں۔

دیکھئے قرآن اس ضمن میں کیا کہتا ہے:

آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ

(سورہ الحدید۔ آیت 7)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ (امین) بنایا ہے، ان کو منفعت عامہ کے لیے وقف کر دو۔

اس آیت میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش موجود نہیں۔ یہ اس امر کے لیے نص صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو بھی مال و دولت ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا مال ہے۔ اور انسان اس مال میں محض وکیل ہے، اصیل نہیں۔

اسی طرح سورہ نور میں جہاں مکاتبین (وہ غلام جو مکاتبت کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیں) ان کی امداد اور اعانت کا حکم ہے۔

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ وَلَا تُكْرِهُوا (سورہ النور۔ آیت 33)

اور ان (مکاتبین) کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں (بطور امانت) دیا ہے۔

یہاں غور کیجیے کہ کیا اعلان کیا جا رہا ہے۔ کہ مالدار لوگ ان مکاتبین کو اپنا مال نہیں دیتے بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے تو محض درمیانی وسیلہ بنتے ہیں۔

تیسری آیت جو سورہ نمل کی ہے، اس سے بھی زیادہ واضح اور محکم ہے۔

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ

عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاء أَفَبِنِعْمَةِ اللّهِ يَجْحَدُونَ

(سورہ النحل۔آیت 71)

اللہ تعالیٰ نے حصول رزق میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔پس جو لوگ زیادہ مال کما سکتے ہیں،وہ زائد از ضرورت کو اپنے ماتحتوں کی جانب کیوں نہیں لوٹا دیتے؟ کیونکہ یہ مال انہی کا ہے۔یہ لوگ اس خیال سے ایسا نہیں کرتے کہ یوں تو وہ سب ان کے برابر آجائیں گے۔(گدھا گھوڑا ایک جیسے ہو جائیں گے)۔ایسا خیال کرنے میں وہ اللہ کی نعمتوں سے انکاری ہیں۔

یہاں قرآن نے یہ چیز ثابت کر دی ہے کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو دیتے ہیں،وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا حصہ نہیں ہوتا جسے وہ نکال کر بطور خیرات دے دیتے ہیں، بلکہ یہ دراصل ان ضرورتمندوں کا ہی اپنا حق ہوتا ہے جسے یہ مالدار لوگ خدا اور ان ضرورتمندوں کے درمیان وسیلہ بن کر پورا کرتے ہیں۔کیونکہ اس مال کے معاملہ میں یہ اور وہ ضرورتمند سب برابر ہیں۔اور ہر گروہ یکساں حقدار ہے۔کیونکہ سرچشمہِ رزق (زمین و وسائل پیداوار) تو ایک ہی ہے جس سے یہ دونوں رزق کماتے ہیں۔دونوں کا یکساں حق ہے۔کیا یہ لوگ اللہ کی اس نعمت کا انکار کرنا چاہتے ہیں؟ نعمت کا انکار ہوتا ہی تب ہے جب انسان یہ تصور ذہن میں بٹھا لے کہ جو مال اس کے قبضہ میں ہے،وہ اس کی اپنی عینی ملکیت ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ یہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت تو ہے ہی نہیں۔یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہے۔

مندرجہ بالا حکم سے بھی صریح حکم سورہ النساء میں موجود ہے جہاں اللہ فرماتا ہے کہ:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاء أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّهُ لَكُمْ قِيَاماً وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوفا(سورہ النساء۔آیت 5)

اور سفہاء لوگوں کو تم اپنے اموال مت دو جنہیں رب نے تمہارے لیے قیام کا باعث بنایا ہے(یعنی اس مال سے اقوام اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہیں،اس لیے اسے نا اہل اور جاہل لوگوں کی ملکیت میں نہ دو جو اس کے بہترین انتظام کی قابلیت ہی نہ رکھتے ہوں۔بلکہ اس میں انہیں بس کھانے پینے کی ضروریات کے مطابق ہی دو(کہ ان کی روٹی چلتی رہے)۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کو مال و زمین پر تصرف کا حق اسی صورت مل سکتا ہے جب وہ ہوش و حواس کے ساتھ اس فریضہ کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں تو اس کے حقوقِ ملکیت موقوف ہو جاتے

ہیں۔یعنی وہ مال جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا، وہ قرآنی معاشرہ کا اجتماعی مال تھا جو ریاست کی ملکیت تھا۔ جب اس شخص کی لاپرواہی یا نالائقی کی وجہ سے وہ سلسلہ ختم ہوا تو مال اپنے اصلی سرچشمہ (ریاست) کی جانب لوٹ جاتا ہے۔

اس آیت میں لفظ ''اموالکم'' دعوتِ فکر دے رہا ہے۔یعنی سفہاء کے اموال کو قرآن نے ان کے اموال قرار نہیں دیا، بلکہ لفظ ''اموالکم'' کے استعمال سے اسے معاشرہ یا ریاست کا مال قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ایک انسان کے اندر یہ شعور (کہ جو مال اس کے پاس ہے، وہ دراصل معاشرہ کی ملکیت ہے، اور وہ اس جماعت کی جانب سے اس مال پر محض وکیل، امین یا نائب ہے) ہی اس انسان کو کوان فرائضِ منصبی کو قبول کرنے اور انجام دینے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک ریاست اس فرد کے ذمہ عائد کرتی ہے اور جسے اس شخص کی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔یہی وہ حدود و قیود ہیں جن کی بدولت اللہ کا نظام اس شخص کو اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ریاست کی جانب سے تفویض کردہ فرائض منصبی کی انجام دہی پر مجبور کرتا ہے۔اور جن میں غفلت برتنے پر اس کے حقِ تصرف پر حد بندی بھی عائد کی جاسکتی ہے۔

فرض کیجیے کہ اگر ایک شخص کے ذہن میں یہ تصور بیٹھ جائے کہ یہ مال میری ذاتی ملکیت ہے۔اور مجھے تاحیات یہی کافی ہے۔ مجھے کسی ریاست یا معاشرہ کی ضرورت نہیں، نہ میں کوئی کام کروں گا۔ جو میرے پاس موجود ہے، وہ صرف میرا ہے۔تو اس تصور کے ساتھ وہ شخص اپنے فرائض منصبی کیوں ادا کرے گا؟ کیونکر محنت کرے گا؟ اور معاشرہ کا حصہ بھی خود کو کیسے سمجھے گا؟ ایسی سوچ معاشرہ میں بہت بڑا بگاڑ پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔اسی لیے قرآن نے کسی انسان کو مال کا عینی مالک قرار نہیں دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست یا معاشرہ میں بھی یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، اور اسی وجہ سے اسے فرائض کو عائد کرنا اور حدود قائم رکھنے کے لیے عملی اقدامات کرنا ہیں۔تاکہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو سکے۔

یہ بات ویسے بھی عقل تسلیم نہیں کرتی کہ ایک انسان زمین کا خود مالک ہوسکتا ہے، انسان صرف اس کی پیداوار اور غلہ کا مالک ہوتا ہے، نہ کہ خود زمین کا۔تو اس حساب سے انسانی اختیار صرف استفادہ کا ہے، نہ کہ عینی ملکیت کا۔قرآن کی رو سے عینی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمائیں۔قرآن مال سے استفادہ کے لیے بھی اس بات کا داعی نہیں کہ وہ لوگوں

کے ایک مخصوص طبقہ ہی میں قید ہوکر رہ جائے اورانہیں میں گردش کرتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو حاصل ہی نہ کر پائیں۔فرمایا کہ:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُم(سورہ الحشر۔آیت 7)

کہ مال تم میں صرف دولتمندوں کے ہی درمیان نہ گردش کرتا رہے۔

اس دلیل کے ساتھ ایک روایتی واقعہ بھی پیش خدمت ہے جس سے اس آیت کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ جب رسول اللہ نے مہاجرین کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی تو لوگ بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ کی جانب گئے۔تنگدستوں نے اپنے ساتھ کیا لانا تھا،جو مالدار تھے،وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لا سکے۔لہٰذا ان مالداروں کی حالت بھی وہاں پہنچ کر مخدوش ہوگئی۔انصار مدینہ نے انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی نفس میں پوشیدہ بخل کر کچل کر اپنے قلوب کو مہاجرین کے لیے کشادہ کردیا۔انہوں نے ان سے برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر چیز جو ان کی ملکیت میں تھی،میں ان مہاجرین بھائیوں کو شریک کیا۔حتیٰ کہ بعض مخصوص ترین اشیاء میں بھی۔یہ سب انہوں نے کسی مجبوری میں نہیں کیا بلکہ خوشدلی اور کشادہ دل وحوصلہ سے کیا۔

سورہ حشر میں ہے کہ:

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورہ الحشر۔آیت 9)

وہ لوگ جوان کی جانب ہجرت کر کے آئے ہیں،انصاران سے محبت کرتے ہیں اور جواموال ان کو دئے ہیں،ان کو مہاجرین کے حوالے کرنے میں سینوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے۔بلکہ اپنی ضروریات پر ان کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔اگرچہ وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں (یہی لوگ سچے مومنین ہوتے ہیں)۔

قارئین ملاحظہ فرمائیں۔عقیدہ صحیح ہوتو وہ انسان کو کیا سے کیا بنادیتا ہے۔انصارؓ نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

مگر مدینہ کے متمول افراد اور تنگدست مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک خلیج حائل تھی۔رسول اللہ نے انصار کی یہ سخاوت ملاحظہ کی تھی،اس لیے انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی کہ جو کچھ وہ مہاجرین کے لیے کررہے

ہیں،اس سے زائدان سے مطالبہ کریں۔

لیکن پھر بنونضیر کاواقعہ پیش آیا جس میں جنگ ہوئے بغیران کا مال فے ،اللہ ورسول (مرکزِ ملت) کی ملکیت قرار پایا۔چنانچہ مسلمانوں میں مہاجرین کے طبقہ کا معاشی توازن درست کرنے کے لیے رسول اللہ نے تمام مال فے مہاجرین کوخصوصیت سے عطا کیا۔انصار میں صرف دوآدمی ایسے تھے جنہیں اس میں بھی حصہ دیا گیا، کیونکہ وہ واقعی ضرورتمند تھے۔قرآن نے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے:

مَّا أَفَاء اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاء مِنكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ لِلْفُقَرَاء الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

(سورہ الحشر۔آیات 8-7)

مختلف آبادیوں کے جواموال فے حاصل ہوں،وہ صرف اللہ ورسول (مرکزِ ملت)اوررشتہ داروں،یتیموں ،مساکین اورمسافروں کے لیے ہیں۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ دولت تم مالداروں ہی میں گردش نہ کرتی رہے(بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے)۔لہٰذا رسول جوتمہیں دے دے،وہ لے لو، جونہ دے،اس سے باز رہو۔اورمتقی بنو۔یادرکھو،خدا کا عذاب (نافرمانوں کے لیی)بہت سخت ہے۔ یہ اموال فے صرف ان ضرورتمندوں مہاجرین کے لیے ہیں جن کواپنے شہراور مال ودولت سے محروم کرکے نکالا گیا۔وہ اللہ کے فضل ورضا کے طالب اوردین الٰہی اور رسول اللہ کے مددگار ہیں۔ یہی لوگ (اپنے دعویٰ ایمانی میں)سچے ہیں۔

رسول اللہ کی طرف سے قبیلہ بنی نضیر کے مال کوصرف مہاجرین میں ہی تقسیم کرنا ،اورپھر قرآن کی جانب سے اس کی تائیدو تصدیق اوربھرپورمجہ بیان کرنا کہ دولت صرف چند گھرانوں تک ہی سمٹ کرنہیں رہ جانی چاہیے، بلکہ اسے گردش میں رکھا جائے ،تمام انسانوں تک۔ یہ اس مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کردیتا ہے جس کے بعد مزید تصریحات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسلام تمام افرادِ ملت میں معاشی توازن قائم کرنا چاہتا ہے، یہ بنیادی طور پر اس بات کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے صرف چند ہاتھوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے۔ اس کے برعکس اس کی تعلیم یہ ہے کہ مختلف طبقات میں ایک اعتدال پیدا کر دیا جائے، کیونکہ ایک جانب مال و دولت کے انبار لگ جانا اور دوسری طرف فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جانا بہت بڑے اجتماعی فساد کا باعث ہوتا ہے۔ یہ باہمی نفرتوں کو بھڑکاتا ہے۔ مختلف طبقات میں حسد، کینہ اور بغض و عناد کے احساسات جنم لینے لگتے ہیں۔ یہی حکمت ہے اس حکم کی اور یہی وہ آیت ہے جو معاشرہ میں امیر و غریب کے تصور کو باطل قرار دے کر رد کرتی ہے۔

اس کے علاوہ اموال کی ایک اور قسم ایسی بھی ہے جس سے انسانوں کا مفادِ عامہ وابستہ ہوتا ہے، اور افراد کو کسی طرح بھی انہیں اپنے لیے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہوتا۔ مثلاً پانی، چارہ اور آگ وغیرہ۔

چونکہ قدیم خطہ عرب میں یہ تین اشیاء اجتماعی زندگی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھیں اس لیے ان تینوں اشیاء سے استفادہ حاصل کرنا پورے معاشرہ کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے اجتماعی زندگی کی ضروریات ہر زمانہ میں یکساں نہیں ہونگی، اس لیے اصولِ قیاس کے تحت مزید جو بھی اشیاء اس حکم کے زمرے میں آئیں، انہیں اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

المختصر، تمام قسم کا اموال فرد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ یہ معاشرہ، جماعت، ریاستی نظام کی ملکیت ہوتی ہے اور اس پر انفرادی قبضہ مالکانہ حیثیت سے نہیں بلکہ محض وکالتی یا امانتی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جس کے لیے بہت سی شرائط و ضوابط ہیں۔ نیز بعض اموال کا شمار اموالِ عامہ میں ہوتا ہے جس پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی برحق قرار نہیں دی جا سکتی۔ ان تمام انفرادی تحویلات کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو مکمل طور پر معاشرہ کا حق ہے اور ریاست اس حصہ کو ایسے لوگوں سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر سکتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہو، تاکہ وہ اپنی مالی حالت کو درست کر سکیں اور یوں ان کی بہتری سے معاشرہ کی اجتماعی بہتری عمل میں آ سکے۔

خلاصہ بحث

(1) قرآن مال و دولت اور اراضی پر انفرادی حقِ ملکیت کو عینی ملکیت (Ultimate Possession) کی حیثیت سے بالکل بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں آیاتِ قرآنی سے اس نظریہ کو ثابت کیا گیا۔

(2) جو مال و دولت اور اراضی انفرادی تحویل میں ہو، اس پر افراد کا امانتاً یا وکالتاً حقِ تصرف ہے (جس سے صرف انکی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اسراف کی اجازت نہیں)۔ عینی ملکیت صرف اور صرف قرآنی ریاست اور معاشرہ کی ہوتی ہے۔

(3) اموال کی بھی دو اقسام ہیں:

(i) جن پہ وکالتی یا نیابتی حق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

(ii) جن پہ یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(4) ایسے اموال یا وسائل پیداوار جن سے مفادِ عامہ وابستہ ہو، ان پر انفرادی تحویل کا سرے سے ہی کوئی حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے پانی، آگ، سبزہ وغیرہ۔

(5) اجتماعی زندگی کی ضروریات ہر دور اور زمانہ میں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ مندرجہ بالا تین اشیاء پر انفرادی ملکیت کا حق قطعی طور پر تسلیم نہ کرنے کی وجہ چونکہ ان کا مفادِ عامہ سے وابستہ ہونا ہے۔ لہٰذا اگر کسی دور میں کچھ مزید چیزیں بھی ایسی پیدا ہو جائیں جن سے افراد کا مفادِ عامہ وابستہ ہو تو ان اشیاء کو بھی بذریعہ قیاس اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے اور پھر ان پر بھی انفرادی حقِ ملکیت ختم ہو جائیگا۔

عہدِ رسالت اور خلفاء راشدین میں زمین کی حیثیت

جیسا کہ اس باب کے حصہ اول میں بتایا گیا کہ اسلامی نظامِ ریاست کی پہلی تجربہ گاہ مدینہ منورہ تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ خطہ عرب زیادہ تر سنگلاخ علاقوں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے جہاں پانی کی قلت پائی جاتی ہے۔ میلوں کے فاصلے طے کرنے پر بھی پانی نظر نہیں آتا۔ پورے عرب میں صرف طائف کا علاقہ وہ واحد خطہ ہے جو سرسبز ہے۔ مدینہ میں کھجوروں کے کچھ باغات اور کہیں کہیں جو کے کھیت نظر آتے تھے۔ لیکن وہ بھی بہت گھنے نہیں ہوتے تھے، یوں سمجھ لیں کہ جیسے چند درخت مختلف فاصلوں پر لگا دئے گئے ہوں، اور اسے ہی باغ کا نام دے دیا گیا ہو۔

مدینہ کی زرعی حیثیت ایسی تھی جس کا اندازہ آج بھی مدینہ کے دونوں اطراف سیاہ پتھروں پر مشتمل پتھریلا علاقہ دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جسے ''حرہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ بنجر ہونے کے باعث کاشتکاری کے قابل نہیں۔ اور جو باقی علاقہ ہے، وہ بھی ایسا ہے کہ اس میں درخت وغیرہ لگ سکتے ہیں، لیکن وہ بھی سارا ایسا نہیں ہے۔ کہیں کہیں وہ قطعات آجاتے ہیں جو قابل کاشت ہیں۔

بہرحال یہ وہ سرزمین تھی جسے دنیا کی پہلی قرآنی ریاست ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کا زمینی احوال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ جو علاقہ اس قدر کم زرخیز اور زیادہ تر غیر زرعی تھا، اس کے بارے میں کسی طرح

بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس علاقے کی قرونِ اولیٰ میں صورتحال کو بنیاد بنا کر زمینداری و جاگیرداری نظام کا جواز پیش کیا جا سکے۔ یہ زمینیں تو خود اتنی ایسی تھیں کہ اپنے مالکان کی ضروریات بھی بمشکل پوری کر پاتی تھیں۔ یہ لوگ خود ان میں کام کیا کرتے تھے۔ زمین کے مالک بن کر بغیر کام کئے اسے بٹائی پر دے کر استفادہ کرنے کا ان میں عموماً اتنا رواج نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ والوں کو کسان، کاشتکار وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ قریش مکہ جو خود کو ایک تاجر قوم سمجھتے تھے، مدینہ والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عموماً جنگ وغیرہ میں بھی قریش کے بہادر افراد نے مدینہ والوں سے لڑائی کرنا گوارہ نہیں کیا۔ اور یہی کہتے رہے کہ ہم ان کسانوں سے لڑنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ابو جہل کو بھی آخری وقت یہی افسوس رہا کہ وہ کسانوں کے دو بچوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے اس پیشہ کے متعلق صحاح ستہ میں ابو ہریرہؓ کا یہ قول موجود ہے۔

"کان یشغلھم عمل اراضیھم"

ہمارے انصاری برادران کو اپنی زمینوں پر کام کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔

مدینہ کے دو اہم قبائل اوس و خزرج میں اوس قبیلہ کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کا ایک قول ہے کہ:

"کھیتوں اور نخلستانوں میں کدال اور پھاوڑے سے کام کرنے کی وجہ سے میری ہتھیلیوں پر نشان پڑ گئے تھے" (کتاب الکسب۔ السرخسی۔ ضمیمہ مبسوط۔ جلد 3، صفحہ 245)

غور کیجیے۔ جس قوم کے سرداروں کا یہ حال تھا، ان کے عوام کیسے ہونگے؟ البتہ مدینہ منورہ میں ایک قبیلہ بنو حارث ایسا تھا جن کے پاس اپنی ضرورت سے زائد اراضی تھی۔ چنانچہ اسی قبیلہ کے ایک فرد حضرت رافع بن خدیجؓ کا یہ قول بخاری شریف میں ہے کہ:

"تمام انصار میں سب سے زیادہ زرعی زمینیں ہمارے پاس تھیں"۔

ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ اپنی زمینوں کو بٹائی (مزارعت) پر دینے کے بھی عادی تھے۔ بہر حال اگرچہ مختصر پیمانے پر ہی سہی، لیکن زمینداری نظام ان کے اندر موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ چیز معلوم ہوئی تو آپ نے اس قبیلہ کے سربراہان کو طلب فرمایا۔ چنانچہ بخاری میں رافع بن خدیجؓ کے چچا کا یہ قول موجود ہے کہ:

"رسول اللہ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟"

تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں جو حکم دیا، اور جو ان دونوں سربراہان نے واپس آ کر اپنے قبیلہ والوں کو بتایا، وہ صحاح ستہ میں ان

الفاظ میں موجود ہے۔

"رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جب وہ اپنے قبیلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کرکرایہ پر دینے کی رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمادی ہے۔(صحاح ستہ)

رافع بن خدیجؓ کی ایک اور روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ:

"رسول اللہ نے زرعی زمینوں کو کرایہ (بٹائی) پر دینے سے منع کردیا ہے۔"

کہیں ان الفاظ میں ہے کہ:

"رسول اللہ نے منع فرمایا ہے کہ زمین کو بندوبست کرکے زمین کے مقابلہ میں کوئی معاوضہ یا کسی قسم کا کوئی حصہ وغیرہ لیا جائے"۔(مسلم شریف)

"رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا تھوڑا بہت اناج بھی کاشتکار سے زمین کا مالک نہیں لے سکتا؟ فرمایا نہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ اچھا غلہ نہ سہی، بھوسہ وغیرہ تو لیا جاسکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں لیا جاسکتا۔(سنن نسائی)

کہیں مندرجہ ذیل تفصیلات ہیں:

"زمین کو چوتھائی، تہائی یا اناج کی مقررہ مقدار پر بھی دینا جائز نہیں۔"(مسند احمد۔ سنن ابی داؤد)

البتہ زمین کو نقد رقم کے عوض دیا جائے تو اس ضمن میں وہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ نقل نہیں کرتے۔ وہ محض اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور ان کی یہ رائے مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔

کبھی وہ فرماتے ہیں کہ:

"دینار اور درہم کی شکل میں زمین کو کرایہ پر لینے میں کوئی حرج نہیں"(بخاری شریف)

مگر ساتھ ہی ان کے پوتے عمران بن سہل ان سے کہتے ہیں کہ:

"دادا جان: میں نے دوسو درہم پر اپنی زمین دوسو درہم پر کرایہ پر دے دی ہے۔

تو رافعؓ ان الفاظ میں پوتے کو منع فرمادیتے ہیں کہ:

"اس طریقہ کو ترک کردو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے زمینوں کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔"

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ کے زمانہ میں نقد رقم کے عوض زمین بٹائی پر دینے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی خصوصی ممانعت مروی نہیں۔ اس لیے حضرت رافعؓ کی اپنی اس سلسلہ میں مختلف رائے سامنے آتی

ہے۔کبھی وہ یہ سوچتے کہ جس چیز (نقد رقم کے عوض زمین کرایہ پر دینا) کا رسول اللہ نے ذکر نہیں کیا،تو میں کیوں منع کروں،لیکن دوسری جانب کبھی وہ رسول اللہ کی اصولی ممانعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر کے منع فرما دیتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ بعض روایات میں رافعؓ نے زمین نقد کے عوض کرایہ پر دینے کی اجازت کو رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کیا ہے تو اس معاملہ میں حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے۔

> ”دراصل راوی کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ورنہ دراصل یہ سعید من المسیب کا قول ہے جسے راوی نے کچھ اس طرح غلط ملط کر دیا ہے کہ یہ براہ راست رسول اللہ ﷺ کا حکم معلوم ہوتا ہے“(شرح بخاری۔فتح الباری۔جلد 5،صفحہ 20)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ:

> ”کچھ صحابہؓ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں۔پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد زمین ہو،وہ اسے خود ہی کاشت کرے یا پھر اپنے کسی بھائی کو دے دے یا پانی زمین کو روکے رکھے۔“(بخاری،مسلم)

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں:

> ”جابرؓ سے روایت ہے کہ لوگ تہائی،چوتھائی اور نصف بٹائی پر زمینیں کاشتکاری کے لیے دیتے تھے۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس اراضی ہو،وہ خود کاشت کرے یا کسی اور کو بخش دے۔اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔“(بخاری و،مسلم)

یہاں تک آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زمین کی کیا صورتحال تھی۔زمین دراصل ہے ہی اسی لیے کہ انسان اس سے اپنی غذا پیدا کریں۔اور غذا پیدا کرنے کے لیے یہ ضرور کسی نہ کسی کی (اماناً) تحویل میں دی جائیں گی۔وہ خودکار طریقے سے تو غذا نہیں اگل سکتیں۔

چنانچہ مدینہ آمد پر جن لوگوں کے پاس اپنی زمینیں تھیں،جن سے ان کی گزراوقات ہوتی تھی،وہ انہی کی تحویل میں رہنے دی گئیں۔کیونکہ وہ اپنے ہاتھوں سے ان میں کاشتکاری کرتے اور اناج پیدا کرتے تھے۔لیکن بنو حارثہ جس کے پاس ضرورت سے زائد اراضی تھی،اور وہ اسے بٹائی پر دیتے تھے،اسے رسول اللہ ﷺ نے بند کروا دیا۔چونکہ نقد روپیہ پر بٹائی پر دینے کی روایات براہ راست رسول ﷺ سے مروی نہیں۔اس لیے نقد کے لیے بھی وہی حکم لاگو ہوگا جو غلہ کے عوض معاملہ کے لیے ہوتا

تھا۔رافع بن خدیجؓ خود ہی نقد بندوبست کے متعلق ممانعت فرما دیتے ہیں۔اور وجہ وہ خود بتا دیتے ہیں کہ اس دور میں نقد کا رواج نہیں تھا۔اور جب ان کا پوتا ایسا کرنا چاہتا ہے تو اسے منع کر دیتے ہیں اور دلیل کے طور پر رسول اللہ کا وہی غلہ کے عوض بٹائی کی ممانعت کا حکم پیش کرتے ہیں۔

یہ تھی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مدینہ میں اراضی کی ملکیت کی صورتحال۔

خیبر کی زمین کی ملکیت کا معاملہ اور مولانا مودودی کی غلط فہمی

واقعہ خیبر کا تذکرہ بھی یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بنا ہوا ہے۔چنانچہ اس ضمن میں مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''مسئلہِ ملکیتِ زمین'' میں درج ذیل واقعہ پیش کرتے ہیں۔

''ابن عمرؓ کی روایت ہے اور ابن عباسؓ و حضرت انسؓ کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا۔اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزور شمشیر مغلوب ہوا۔آنحضرت نے آدھے علاقہ کو حکومت کی ضروریات کے لیے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقہ کو 18 قطعات میں تقسیم کر کے ان مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوہ خیبر میں شریک تھے (یعنی بحساب 100 آدمی فی قطعہ) پھر آپ نے ارادہ فرمایا کہ معاہدہ کے مطابق یہودیوں کو وہاں سے نکال دیں۔مگر یہودیوں نے آ کر عرض کیا کہ آپ ہمیں رہنے دیں۔ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشتکاری کریں گے۔آدھی پیداوار آپ لے لیجیے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔آنحضرت نے یہ دیکھ کر کہ آپ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے،ان کی بات مان لی اور ان سے فرمایا کہ جب تم ہم چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے،تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔چنانچہ ان شرائط پر آپ نے ان سے معاہدہ طے کیا۔وہ کاشتکاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کیا کرتے تھے۔آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف ان کے مالک وہ۔1500 حصہ دار تھے جن پر قطعات تقسیم کیے گئے تھے۔بٹائی کے معاہدہ کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی،اس کو حکومت اور حصہ والوں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔نبی صلعم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔چنانچہ آپ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر دیا کرتے تھے۔یہ بندوبست حضور کے آخر حیات تک جاری رہا۔اسی پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں عمل کیا۔اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانہ میں کاربند رہے۔پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابقان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے۔وہ جا کر اپنی اپنی زمین سنبھال لے۔ازواج مطہرات کے

سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں، وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلعم کے زمانہ سے ملتا آرہا ہے۔ اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواج مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیما اور اریجا میں بسا دیا۔ (بخاری ،مسلم، ترمذی، احمد، ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت و خلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ نبی صلعم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دی ہے۔ اپنی طرف سے بھی اور حکومت کی طرف سے بھی۔ اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اس طریقہ پر آپ اپنے آخری لمحہ حیات تک عامل رہے اور آپ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اسکے بعد بھی کسی کو گمان ہو سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینا ممنوع تھا؟

(مسئلہ ملکیتِ زمین از مودودی)

کتنی بڑی جسارت مولانا مودودی کی جانب سے کی گئی ہے، انہیں شائد معلوم نہیں کہ یہ وہی واقعہ خیبر ہے جس سے لفظ ''مخابرہ'' بنایا گیا ہے۔ مخابرہ کے معنی ہیں خیبر جیسا معاملہ کرنا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے پہلے خود مودودی صاحب صحاح ستہ کے حوالہ جات کے ذریعہ زید بن ثابتؓ، جابر ابن عبد اللہ، رافع بن خدیجؓ کی روایات سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نقل کر چکے ہیں کہ:

''نهى رسول الله صلعم عن المخابره''

یعنی رسول اللہ نے خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

یہ روایت متعدد صحیح اسناد کے ساتھ صحابہؓ سے مروی اور صحیحین میں موجود ہے۔ ان روایات میں مخابرہ کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ خیبر کا یہ واقعہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ کے ہی پیش نظر عربی زبان میں اسی واقعہ سے متعلق ایک لفظ (مخابرہ) بھی وضع کیا جا چکا تھا جو عام استعمال میں بھی تھا۔ یہ لفظ خود بھی بتا رہا ہے کہ خیبر کے معاملہ کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ بٹائی پر بندوبست کرنا نہیں تھا ورنہ مخابرہ کے اس نئے لفظ کو استعمال کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی جبکہ عربی زبان میں محاقلہ، مزارعہ وغیرہ جیسے دوسرے بہت سے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔

وہ بٹائی نہیں تھی بلکہ جزیہ تھا۔

شرح بخاری میں مذکور ہے کہ:

آنحضرت صلعم نے کھجوروں اور زمین کی پیداوار کے نصف کی جو شرط عائد کی تھی وہ جزیہ کے طور پر تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں کہیں یہ موجود نہیں کہ آنحضرت صلعم نے یہود سے اس کے علاوہ کوئی جزیہ لیا ہو۔ یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ابوبکر و عمرؓ نے بھی اس کے علاوہ کوئی جزیہ نہیں لیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان سے جزیہ ضرور لیا جاتا۔" (بحوالہ عینی۔ شرح بخاری۔ صفحہ نمبر 724)

قارئین غور فرمائیں۔ نصف پیداوار دینے کی شرط کے ساتھ جو زمین یہودیوں کو کاشتکاری کے لیے دی گئی تھی، اور جسے مودودی صاحب بٹائی پر دی گئی زمین سمجھ رہے ہیں، وہ دراصل یہودیوں سے لیا جانیوالا جزیہ تھا۔ نہ کہ بٹائی۔

مزید اس نکتہ کو بھی سمجھ لیجیے کہ مودودی صاحب نے یہ جو دعویٰ کیا ہے کہ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین مسلمانوں کی ملکیت میں آ گئی اور مسلمانوں نے اسے یہودی کاشتکاروں کو بٹائی پر دیدیا تھا۔ اور اسی سے مودودی صاحب زمین بٹائی پر دینے کی سند بھی لاتے ہیں، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ وہ زمین مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں ہرگز نہیں لی تھی، وہ یہودیوں کی ہی ملکیت میں رہی۔ البتہ اسلامی حکومت نے ان سے ذمی ٹیکس (جزیہ) نقد کی بجائے پیداوار کی شکل میں وصول کیا تھا۔

یہ بات کہ زمین یہودیوں کی ہی ملکیت میں رہی تھی، خود مودودی صاحب کو بھی تسلیم تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں کچھ یوں لکھا ہے:

"یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا۔ لیکن ان مجرموں کو اس طرح جلاوطن نہ کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انہیں بیک بینی و دو گوش نکال دیا گیا ہو۔ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ بیت المال سے دیا گیا۔ (الجہاد فی الاسلام۔ طبع دوم۔ صفحہ 263)

اس سے واضح ہو گیا کہ واقعہ خیبر کے بعد یہودیوں کی زمین انہی کی ملکیت میں رہی تھی۔ اس لیے جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انہیں خیبر سے جلاوطن کرنا پڑا تو انہیں زمین کی قیمت ادا کی گئی۔ اگر مسلمانوں کی ملکیت ہوتی تو زمین کی قیمت انہیں ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشہور مصری مصنف محمد حسین ہیکل اپنی ایک کتاب "عمر فاروقؓ" میں لکھتے ہیں کہ:

"یہی کچھ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا جو خیبر اور فدک میں باقی رہ گئے تھے۔ انہیں وہاں سے جلاوطن کر کے شام بھیج دیا گیا۔ ان کی زمینوں کی قیمت انہیں دے دی گئی اور ان میں کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی

گئی‘‘(عمر فاروق از محمد حسین ہیکل۔صفحہ 578)

یہ وہ حقائق ہیں جن کی بناء پر ثابت ہوتا ہے کہ یہودی اپنی زمینوں کے بدستور مالک رہنے دئے گئے تھے اور جب کوئی اپنی زمین کا مالک ہو تو اس سے تو بٹائی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔بٹائی کا معاملہ زمین کے مالک اور مزارعہ کے درمیان ہوتا ہے۔

خلاصہِ بحث

مندرجہ بالا تصریحات سے درج ذیل حقائق کھل کر سامنے آ گئے:

(1) عہد رسالت ﷺ میں لوگوں کے پاس دو قسم کی زمینیں تھیں۔وہ زمینیں جو اسلام لانے سے پہلے لوگوں کے قبضہ میں چلی آ رہی تھیں۔

(2) جو بعد میں ضرورت کے لحاظ سے مرکزِ ملت کی جانب سے ضرورتمند مسلمانوں کو دی گئیں۔

(3) قسمِ اول کی زمینیں زیادہ تر ایسی ہی تھیں جو بمشکل اپنے مالکان کی ہی معاشی ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔

(4) صرف قبیلہ بنی حارث کے پاس زائد از ضرورت اراضی موجود تھی اور وہ اپنی زمینیں آگے بٹائی پر دینے کے بھی عادی تھے۔

(5) رسول اللہ ﷺ نے پھر بٹائی سسٹم کو قطعاً بند کروا دیا اور حکم دیا کہ جس کے پاس فاضلہ اراضی ہو،وہ اپنے دوسرے ضرورتمند بھائیوں کو دے دے۔

(6) صحابہ کرامؓ کی اطاعت وفرمانبرداری (سمعنا واطعنا) کو دیکھتے ہوئے یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہؓ نے اس پر عمل نہیں کیا ہوگا۔اس لیے یہ بات قطعی ہے کہ ضرورت سے زائد اراضی اسی وقت ضرورتمندوں کو دے دی گئی تھی۔

(7) جن لوگوں کے پاس زمینیں تھیں،وہ خود ہی ان میں کاشتکاری کرتے تھے۔

(8) اسلامی حکومت نے بھی جن لوگوں کو زمینیں عطا کیں،وہ بھی ان میں خود ہی کاشتکاری کرتے تھے،آگے بٹائی پر نہیں دے سکتے تھے۔

(9) خیبر کی زمینیں وہاں کے یہودی باشندوں کو مرکز ملت کی جانب سے بٹائی (شیئر نگ) پر دی گئیں لیکن یہ معاملہ بٹائی کا نہیں تھا، بلکہ یہ ان سے وصول کیا جانیوالا جزیہ تھا۔

(10) پھر خیبر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں تھیں اور وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے ضرورت سے زائد نہیں تھیں۔

(11) چونکہ خیبر کے معاملہ سے مسلمانوں کو غلط فہمی لاحق ہو سکتی تھی، اور بعد میں آنے والے اسے غلطی سے بٹائی یا مزارعت سمجھ سکتے تھے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تاکید کے ساتھ خیبر جیسا معاملہ کرنے سے منع فرما دیا۔

عہد رسالت ﷺ میں زمینوں کے مالکان خود حقیقی مالک تھے یا وہ مرکزِ ملت کی ملکیت تھیں؟

اب آگے بڑھتے ہوئے اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں جن لوگوں کے پاس یہ اراضی تھی، ان کی حیثیت کیا تھی؟ کیا وہ بحیثیت کاشتکار قابض تھے یا بحیثیت مالک؟ بالفاظ دیگر وہ زمینیں افراد کی ملکیت تصور کی جاتی تھیں یا مرکزِ ملت کی؟

گزشتہ صفحات میں یہ بنیادی اصول بیان کیا جا چکا ہے کہ زمین تو دور کی بات، قرآن کی رو سے کسی بھی چیز پر کسی فرد کی ملکیت کو عینی ملکیت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام صرف اس بات کا قائل ہے کہ صرف استفادہ اور انتفاع کے لیے زمینیں اور مال افراد کی تحویل میں وکالتی حیثیت سے ہی دی جا سکتی ہیں، مگر ان پر بھی حتمی ملکیت ریاست کی ہی رہتی ہے۔ زمین بھی اصولی طور پر اس حکم میں شامل ہے اور زمین کے متعلق ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے اس تصور کی تائید ہوتی ہے کہ جو زمینیں افراد کی تحویل میں تھیں، وہ دراصل مرکزِ ملت کی ہی ملکیت تصور ہوتی تھیں۔ نہ کہ افراد کی انفرادی۔

(1) عہد رسالت میں قابل کاشت اراضی کی خرید و فروخت کی کوئی مثال دستیاب نہیں۔

(2) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ زمینیں تھیں، ان کو رسول اللہ ﷺ نے تین باتوں کا اختیار دیا تھا۔ رافع بن خدیجؓ کی یہ روایت پیچھے درج کی جا چکی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے کہ ''جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد زمین ہو، وہ اسے خود ہی کاشت کرے، یا اپنے بھائی کو بخش دے۔ یا پھر اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔ تیسرا اختیار تو محض تہدیدی نوعیت کا ہے، دراصل اول الذکر دو اختیارات ہی بنیادی نوعیت کے تھے۔ یا وہ خود کاشتکاری کریں، یا پھر کسی بھائی کو بخش دیں۔ اگر زمینوں کی تجارت بھی مشروع ہوتی تو تیسرا تہدیدی پہلو بتانے کی بجائے سیدھی بات یوں کہہ دی جاتی کہ وہ کسی دوسرے بھائی کو کسی نقد قیمت کے عوض فروخت کر دے۔ یہ صورتحال زیادہ آسان تھی۔ مگر اس کی فروخت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(3) رسول اللہ ﷺ کے دور میں یہ ریاستی قانون بھی تھا کہ جو شخص زیادہ سے زیادہ تین سال تک زمین کو بیکار پڑا رہنے دے

گا، حکومت اس بات کی مجاز ہوگی کہ اس سے زمین واپس لے لے اور کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کر دے جو اس میں کاشتکاری کا خواہاں ہو۔ اس حوالہ سے ایک واقعہ بھی پیش خدمت ہے:

''ایک صحابیؓ کو آنحضرت ﷺ نے زمین عطا کی تھی، مگر وہ اسے آباد نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں ان سے یہ زمین واپس لے لی اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دی'' (کتاب الاموال از علامہ ابن عبید۔ صفحہ 290)

اولین مرکزِ ملت اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی اپنی معاشی زندگی

گزشتہ ابواب میں پیش کردہ دلائل سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے اسلامی ریاست کی اسلامی حکومت اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ضابطہ حیات اور قوانین کو نافذ کرنے کا ایک ادارہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی حکومت (اگر قرآنی نہج پر قائم ہو) اس کرہ ارض میں موجود انسانی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کرتی ہے۔ یعنی اللہ نے انسانوں سے متعلق جو ذمہ داریاں اپنے سر لی ہیں، انہیں یہ حکومت پورا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بے مثال کلام پاک کی ابتدائی آیت میں ہی جس عظیم الشان ذمہ داری کا اعلان کیا ہے، وہ ہے ''رب العالمین''۔ یعنی تمام جہانوں کا پالنے والا۔ انسانی دنیا میں رہتے ہوئے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمام نوع انسانی کو وہ سامانِ نشوونما اس انداز سے بہم پہنچاتے جانا جس سے ان کی پرورش اس انداز سے ہوتی جائے کہ ان میں جو کچھ بھی بننے کی صلاحیت موجود ہے، وہ بن جائیں۔ دین اسلام کے اس عظیم الشان فریضہ کو ''ربوبیت'' کہا جاتا ہے۔ اور وہ نظام جس کے تحت یہ فریضہ انجام دیا جاتا ہے، وہ ''نظام ربوبیت'' کہلاتا ہے۔ قرآن کا معاشی نظام تو محض اس کا ایک جزو ہے۔ اصل منزل تو بہت دور ہے جس تک پہنچنے کے لیے انسان کو معاشی فکر سے آزاد کیا جاتا ہے۔ اس بات کا تصور چنداں مشکل نہیں کہ ایک انسان اگر معاشی فکر سے آزاد ہو جائے تو وہ پرسکون ہو کر اس دنیا کے حسن و رعنائیوں میں اضافہ کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے کس قدر محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتا ہے؟

اس نظامِ ربوبیت میں دو طرح کے فرائض شامل ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں انسانی ذات کے تصور پر کچھ گفتگو پیش کی گئی اور بتایا گیا کہ انسان کے پیش نظر انسانی جسم اور ذات دونوں کی پرورش ہے۔ اس لیے فریضہِ ربوبیت میں تمام انسانوں کی جسمانی نشوونما بھی شامل ہے اور انسانی ذات (صلاحیتوں) کی نشوونما بھی۔ اور اسلامی حکومت اسی فریضہ سے عہدہ برآ

ہونے کے لیے قائم کی جاتی ہے۔طبعی یا جسمانی نشوونما کے لیے جو نظام دنیا میں قائم کیا جاتا ہے،اسے معاشی نظام کہتے ہیں،قرآن نے جو معاشی نظام پیش کیا ہے،اس پر گزشتہ ابواب میں سیر حاصل گفتگو کی جا چکی ہے۔اس حصہ میں اس بات کا جائزہ لیا جائیگا کہ انسانیت کے مصلح اعظم اور اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے بطور اولین مرکزِ ملت اور اس عظیم ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے کس قسم کی معاشی زندگی گزاری؟ جو ہمارے لیے مشعلِ راہ اور اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی

یہ کس قدر عظیم ذمہ داری ہے جسے قرآنی ریاست اپنے سر لیتی ہے۔دیکھئے اس ملکت کا اولین سربراہ اس بارِگراں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کس قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔حضرت محمد ﷺ اولین قرآنی ریاست کے پہلے سربراہ تھے۔آپ کی حیاتِ طیبہ دو ادوار پر مشتمل ہے۔مکی زندگی اور مدنی زندگی۔

مکی زندگی کے دوران یہ مملکت تا حال قائم نہیں ہو پائی تھی لیکن رسول اللہ ﷺ ایسی جماعت کی تشکیل و تربیت میں مصروف تھے جن کے ذریعہ یہ عظیم مملکت قائم ہونی تھی۔عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی معاشی طور پر بہت تنگدستی میں گزری۔درحقیقت ایسا نہیں ہے۔قرآن میں اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى (سورہ الضحیٰ۔آیت 8)

جب ہم نے تجھے تنگدست پایا تو تمہیں غنی (بے نیاز) کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ زندگی تنگی کی نہیں، بلکہ خوشحالی کی زندگی تھی۔یعنی ایسی زندگی جس میں آپ کو اپنی ضروریات کے لیے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑتا تھا۔لیکن وہاں کی جماعت کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے کیا انداز اختیار کیا تھا اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے:

''ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا کم رہ جاتا ،اور ان کے بال بچوں پر فاقہ کشی کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ اپنی اپنی اشیائے خوردونوش کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے کر کے انہیں تقسیم کر لیتے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں''۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں رسول اور صحابہ کرامؓ کی زندگی ایسی تھی کہ محتاجوں اور ضرورتمندوں کا خیال کرتے ہوئے آپس میں کھانا تقسیم کر لیتے تھے،اور ظاہر ہے جو کچھ دوسروں کے حصے آتا تھا،وہی رسول اللہ ﷺ کو ملتا ہوگا، بلکہ اس سے بھی

کم۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان کی یہ خصوصیت بیان کی ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(سورہ الحشر۔آیت 9)

وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے انہیں خود تنگی میں ہی گزارہ کرنا پڑے۔

رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی

ہجرتِ مدینہ کے نتیجہ میں پہلی 10 لاکھ مربع میل پر محیط ایک وسیع قرآنی ریاست وجود میں آ چکی تھی جس کے سربراہ رسول اللہ ﷺ تھے۔اس کے باوجود سربراہ مملکت کی حیات طیبہ سادگی کا ایک شاندار نمونہ تھی، جیسا کہ اس روایت سے بھی ظاہر ہے ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔صرف ایک جوڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا جو طے کر کے رکھا جاتا۔جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی، ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوتے تھے۔گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو اکثر آپ ﷺ اور سارا گھر بھوکا رہتا۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

مدینہ میں قیام سے وفات تک آپ نے کبھی بھی دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی تھی۔(بخاری و مسلم)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ تھے، مدینہ میں مال و دولت کی ریل پیل تھی، تو پھر بھی آپ ﷺ تنگی کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے؟ ہمارا مذہبی طبقہ اس کا جواب یوں دیتا ہے کہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے دنیا و آخرت کو پیش کیا تھا، اور آپ نے آخرت کو ترجیح دی (معراج والی روایت)۔اور یہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود بھی تنگدستی اور سادگی سے گزارا کیا۔لیکن یہ توجیہہ درست نہیں کیونکہ یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے ہی خلاف ہے کہ دنیاوی آسائش اور لذتوں کو قابل نفرت سمجھ کر ترک کر دیا جائے۔یہ تعلیم رہبانیت کی ہے جسے عیسائی راہبوں، بدھوں اور ہندو سادھوؤں کے ہاں دیکھا جاتا ہے۔قرآن اس تصورِ حیات کی نفی کرتا ہے اور اسے ان لوگوں کا خود ساختہ مسلک قرار دیتا ہے۔فرمان الٰہی ہے کہ:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ (سورہ الحدید۔آیت 27)

اس نظریہ (رہبانیت) کو انہوں نے خود ہی گھڑ لیا ہے۔اسے ہم نے ان پر واجب نہیں ٹھہرایا تھا۔

اس کے برعکس قرآن تو دنیاوی آسائشیں اور خوشگواریاں فراہم کرنے والی اشیاء کو وجہ جاذبیت قرار دیتا ہے اور ببانگ دہل کہتا ہے کہ:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (سورہ الاعراف۔آیت 32)

کہہ دو کہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان اشیاء کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور خوشگوار رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟

اور رسول اللہ ﷺ کو تو خاص ہدایت دی گئی تھی کہ:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ

(سورہ تحریم۔آیت 1)

اے نبی، جس چیز کو اللہ نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے، تو اسے حرام کیوں کرتا ہے؟

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف دنیا کی ''نفرت'' کے جذبہ سے تنگدستی کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کی حقیقی وجہ کچھ اور تھی۔

قرآنی ریاست کے قیام کے وقت اکثریت مفلس اور غریب لوگوں کی تھی۔

قرآنی ریاست کے وجود میں آنے پر رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ ریاست میں خوشحال لوگوں کی تعداد کم تھی، باقی سب مفلوک الحال، ضرورتمند، نادار محتاج لوگ تھے جن کی کفالت ریاست کے ذمہ تھی۔ اکثر مفلسی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لوگوں کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لیے سواری تک نہ ہوتی تھی۔ سورہ توبہ میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے:

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ (سورہ التوبہ۔آیت 92)

ان لوگوں پر جہاد میں عدم شرکت کی وجہ سے کوئی الزام نہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کے پاس سواریاں نہیں، تم سواری کا کچھ انتظام کر دو۔ تو تم نے کہا کہ سواری کا تو میرے پاس بھی کوئی انتظام نہیں۔ چنانچہ وہ حسرت اور مایوسی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور دل اس غم میں ڈوبا جا رہا تھا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں جس سے ہم سواری کا انتظام کر کے جہاد میں شریک ہو سکتے۔

قارئین اندازہ کیجیے یہ تھی اس وقت عام لوگوں کی حالتِ زار۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ ایسی ریاست کا سربراہ جسے اپنی ذمہ داریوں کا بخوبی اندازہ ہو، کس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گا؟

دنیا کی دیگر ریاستوں پر نظر ڈالیں تو اربابِ اقتدار اور حکمرانوں کے اخراجات کے لیے پہلے سے ہی روپیہ الگ کرلیا جاتا ہے، اور جو باقی بچتا ہے، وہی عوام پر صرف کیا جاتا ہے، لیکن قرآنی ریاست میں صورتحال اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں سربراہ مملکت اپنی ضروریات کو سب سے موخر رکھتا ہے اور وہ اس وقت ہی کھاتا ہے جب سب کھا چکیں۔ وہ اس وقت پہنتا ہے جب سب پہن لیں۔ سنن ابی داؤد کی ایک روایت ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے، اور وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ اس کی ضروریات اور حاجات سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابی داؤد۔ کتاب الخراج)

جامع ترمذی میں بھی ایسی ایک روایت موجود ہے:

"رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو امام یا سربراہ ضرورتمندوں محتاجوں، مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ اس کی ضروریات اور حاجات کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے" (ترمذی۔ کتاب الاحکام)

اور یہی بات رسول اللہ ﷺ کے ایک اور فرمان سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ:

"جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی حفاظت اور نگرانی کا ذمہ اٹھ گیا" (مسند احمد)

قرآنی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی شخص کو تنہائی یا لاوارث رہ جانے کا احساس نہ ہونے دے۔

قرآنی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی فرد کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے، اس کا باپ فوت ہو گیا ہے تو اسے کوئی پوچھنے والا نہیں رہا، یا خاندان کے ایک کماؤ فرد کی ناگہانی موت پر اس کے گھر والوں کا معاشی پہیہ چلنے سے نہ رک جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ﷺ (قرآنی ریاست) ہے۔ (جامع ترمذی۔ باب الفرائض)

حتیٰ کہ کوئی شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس پر کسی کا قرض واجب الادا ہو تو اس قرض کی ادائیگی بھی ریاست کے ذمہ ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ:

"میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض وفات

پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے" (ابوعبید۔کتاب الاموال)

مقروض کا قرض بھی ریاست ادا کرے گی اور اگر وہ اپنے اہل وعیال کو بے سہارا چھوڑ جائے گا تو ان کی ذمہ داری بھی ریاست کے سر ہے۔

"ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے، لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ کر مر جائے، اس کی ذمہ داری میرے (مرکزِ ملت) سر ہوگی" (جامع ترمذی۔باب الفرائض)

ہماری تاریخ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذریعہ معاش نبوت سے قبل مکہ میں بکریاں چرانا تھا۔آپ نے تجارت بھی کی۔لیکن نبوت کے دعویٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا ذریعہ معاش کیا تھا، یہ نہ قرآن کریم نے بتایا ہے، نہ ہی تاریخ میں اس امر سے متعلق کوئی اشارہ موجود ہے۔مکی زندگی میں چونکہ ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔اس لیے مسلمانوں کی ابتدائی زندگی جماعت کی زندگی تھی۔لیکن اس زندگی میں بھی ایک عظیم اور عالمگیر انقلاب کی تیاری میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کی تعلیم وتربیت میں جس قدر مصروف تھے، اس بات کا اندازہ قرآن کی اس آیت سے لگایا جا سکتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کو خود یہ تنبیہہ کرنا پڑی کہ

"تم جو رات بھر اس نظام کی تشکیل کے لیے کوشاں رہتے ہو، ان اوقات کار میں کچھ کمی کر لو (اپنی صحت کا بھی خیال رکھو)"۔(سورہ المزمل۔آیات 7-1)

اس سے ہم یہ اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کس قدر مصروف کار رہتے تھے کہ انہیں حصولِ معاش کے لیے وقت ہی نہیں مل پاتا تھا۔اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اس وقت نظامِ معیشت اجتماعی ہی تھا۔اہل جماعت ایک دوسرے کی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔اس موقف کی شہادت ایک روایت سے بھی ملتی ہے:

"حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ جماعت کے ساتھی کھجوروں کے کچھ درخت رسول اللہ ﷺ کے لیے مختص کر دیا کرتے تھے۔" (بخاری شریف)

پھر فتوحات کے بعد باغ فدک کا ایک مختصر سا قطعہ آپ کی معاشی ضروریات کی کفالت کرتا تھا، لیکن اس میں بھی صورت یہ تھی کہ جن حاجت مندوں کی ضروریات اور کہیں سے پوری نہ ہو پاتی تھیں، انہیں بھی اس عظیم الشان ہستی کی جانب سے سہارا ملتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات ایسی نوبت بھی آ جاتی کہ رسول اللہ ﷺ کو بمعہ اہل خانہ فاقے کرنا پڑتے تھے۔اور یہی اللہ

تعالیٰ کی بیان کردہ جماعتِ مومنین کی وہ خصوصیت تھی:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(سورہ الحشر۔آیت 9)

وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں ہی کیوں نہ گزارا کرنا پڑے۔

جب جماعتِ مومنین کی یہ خصوصیت ہے تو اس جماعت کا سربراہ اس کا کیسا شاندار نمونہ ہوگا؟ خود ہی اندازہ لگا لیجیے۔

اس کتاب میں اب تک میں معاشی نظام سے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔قرآن کے بہت سے اصول بیان کیے ہیں۔جن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ:

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (سورہ البقرہ۔آیت 219)

اے نبی وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لیے اسلامی نظام کو دیں؟ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے،سب کا سب۔

اسی فرمانِ خداوندی کی تفسیر میں ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ:

”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو،وہ اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو،اور جس کے پاس زادِراہ زیادہ ہو،وہ اسے دیدے جس کے پاس زادِراہ نہ ہو،اس طرح آپ نے بہت سی اشیاء کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔(مسلم شریف)

مسلم شریف میں ہی ایک اور روایت ہے کہ:

”حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال میرا مال کہتا رہتا ہے،حالانکہ اس کے مال میں اس کا حصہ صرف تین اشیاء ہیں۔اول،جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے،دوئم،جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے۔سوئم،جو کچھ وہ دوسروں کی پرورش کے لیے دے کر اپنے لیے ذخیرہ آخرت (ذات کی نشوونما) کر لیتا ہے۔ان تینوں اشیاء کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے،وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لیے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔“

طبرانی میں حضرت بلالؓ سے ایک روایت ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو رزق تجھے ملا ہے، اسے چھپا کر نہ رکھ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے، اس میں بخل نہ کر۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یا تو یہ روش اختیار کرنا ہوگی یا پھر جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

ایسے حالات میں بطور سربراہ مملکت رسول اللہ ﷺ کے اپنے گھر کا جو معاشی نقشہ ہو سکتا ہے، واضح ہے۔ اور جس شخص کی زندگی میں ہی اس کی مالی حالت ایسی ہوگی، اس کی وفات کے بعد اس کے گھر سے جو کچھ برآمد ہوگا، اس کی تشریح کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں بھی کئی روایات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثلاً:

"میرے ورثاء میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے گا، وہ صدقہ ہوگا۔" (بخاری شریف)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات کے وقت اپنے پاس موجود کچھ دینار صدقہ کر دئے:

"رسول ﷺ کی بیماری کے ایام میں ان کے پاس سات دینار تھے اور حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ انہیں صدقہ کر دو۔ اتنے میں آپ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے (صدقہ کرنے کا خیال نہ آیا)۔ جب آپ کو ہوش آیا تو فرمایا کہ وہ دینار لے کر آؤ۔ پھر رسول ﷺ نے انہیں اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمد کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے انہیں خود صدقہ کر دیا" (بخاری شریف)

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیچھے نہ کوئی درہم چھوڑا نہ دینار، نہ بکری نہ اونٹ، اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاری شریف میں لکھا ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درھم، نہ غلام نہ لونڈی، نہ کوئی اور چیز۔ سوائے اپنے ایک خچر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپ ﷺ نے صدقہ کر دیا تھا"

صدقہ کا مفہوم

صدقہ کا لفظ ہمارے ہاں تو چند ٹکوں کی خیرات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب دین اجتماعی نظام حیات کی بجائے انفرادی رہ جائے، جسے مذہب کہتے ہیں تو اس میں صدقہ کا مفہوم "خیرات" سے بلند کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن دین قرآنی میں اس اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہ رہے۔ بلکہ ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کا

ذریعہ بن جائے۔جیسا کہ اوپر بخاری کی ایک روایت میں ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بوقت وفات کچھ زمین بھی تھی جسے آپ نے صدقہ کر دینے کا حکم دیا۔قرآن کا یہی دین ہے۔اور زمین کی یہی پوزیشن ہے کہ جن چیزوں پر کل نوعِ انسانی کی زندگی کا دارومدار ہے،وہ اللہ کی جانب سے مفت میں عطا ہوئی ہیں،مثلاً ہوا،پانی،روشنی،زمین وغیرہ،ان پہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔یہ نظام کی ہی تحویل میں رہتی ہیں۔

اللہ نے فرمایا ہے کہ

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (سورہ الرحمٰن۔آیت 10)

ہم نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے۔اسی لیے:

سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (سورہ حٰم السجدہ۔آیت 10)

اسے ضرورتمندوں کی حاجت پوری کرنے کے لیے یکساں طور پر دستیاب رکھا جائے۔

اسی بات کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں کی تھی کہ:

”زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔اس لیے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لیے دینی چاہیے“ (سنن ابی داؤد)

یہی وجہ ہے کہ بوقت وفات آنحضرت ﷺ نے جو قطعہ زمین آپ کے ذاتی اخراجات پورے کرنے کے لیے آپ کی تحویل میں تھا،کو صدقہ کر دینے کا حکم دیا۔اس لیے کہ رسول سب سے پہلے خود احکام خداوندی پر عمل کرتا ہے،اور پھر اس کا یہ عمل دوسروں کے لیے نمونہ بنتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ میں یہ دونوں حیثیتیں یکجا ہوگئی تھیں۔اور انہوں نے دنیا کو دکھا دیا کہ دیکھو قرآن کا پیش کردہ نظام کیسے قابل عمل ہے۔اور قرآنی ریاست کے سربراہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیے۔الصلوٰۃ والسلام التحیت۔

زمانہ رسالت میں صنعتیں اور کارخانے نہیں ہوتے تھے،معیشت صرف زراعت اور تجارت پر مبنی تھی۔جہاں تک زراعت کا تعلق ہے،ذریعہ پیداوار کسی فرد کی عینی طور پر ذاتی ملکیت ہو ہی نہیں سکتا۔یہ انسانوں کے لیے سامانِ رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔زمین پر انفرادی عینی ملکیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص بے حد قطعہ اراضی پر قابض ہو جاتا ہے،اور دوسرے لوگ (مزارعے) اسے کاشت کرتے ہیں اور زمین کا ”مالک“ نصف پیداوار یا ٹھیکہ کے روپے مفت میں اینٹھ لیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے زمین کو ٹھیکہ یا مزارعت پر دینے کو ممنوع قرار دے کر پیداوار کا مالک کاشتکار کو بنا دیا۔اور اس طرح یہ عظیم

معاشی اصول اپنے عمل سے ثابت کر دیا جس کا تذکرہ میں پیچھے بار ہا کر چکا ہوں کہ:

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (سورہ النجم۔آیت 39)

انسان صرف اسی کا حقدار ہے جس کے لیے اس نے محنت کی۔(معاوضہ صرف محنت کا ہے،سرمایہ کا نہیں)

ابی داؤد میں حضرت رافعؓ بن خدیج کی یہ روایت موجود ہے کہ:

"وہ کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا۔آپ نے دریافت فرمایا کہ زمین کس کی ہے؟ اور اس پر کاشت کون کرتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں اس پر کاشت کرتا ہوں، بیج بھی ڈالتا ہوں، محنت بھی کرتا ہوں۔پھر پیداوار کا ایک حصہ میرا ہوتا ہے جبکہ دوسرا حصہ مالک لے جاتا ہے۔آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کرتے ہو۔زمین کو اس کے مالک کی طرف لوٹا دو۔اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے، اس سے لے لو۔

حضرت جابر بن عبداللہ ﷺ کی ایک روایت کے مطابق اس قسم کی مزارعت کو حضور ﷺ نے اسی طرح "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر فرمایا۔جس طرح قران میں رباء کو اعلان جنگ کہا گیا ہے۔" (سنن ابی داؤد)

رباء کہتے ہی سرمایہ پر اضافہ کو ہیں، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔یہی وجہ ہے کہ اس اصول کی بناء پر جو حکم مزارعت یا بٹائی پر لاگو ہوتا ہے، وہی تجارت میں مضاربت (Modarabah) یعنی محض روپیہ لگا کر منافع میں شریک ہونے سے متعلق ہوگا۔یہ بھی ممنوع قرار پاتا ہے۔

قریش حضور ﷺ کی دعوت کے اس قدر مخالف کیوں تھے؟ اسی لیے کہ ان کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار اسی قسم کی تجارت پر تھا اور جس نظام کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیتے تھے، اس میں روٹی خود محنت کر کے کمانا پڑتی تھی۔یہی حالت مدینہ کے یہودیوں کی تھی جو سرمایہ کے زور پر دوسروں کی کمائی اپنی جیبوں میں انڈیلتے چلے جا رہے تھے۔مدینہ میں بھی رسول اللہ ﷺ کی انہوں نے شدید مخالفت کی مگر آپ ﷺ نے زندگی بھر کے جہد مسلسل سے اس غلط اور انسانیت کش نظام سرمایہ داری کو مٹا کر اس کی جگہ قرآن کا عظیم الشان نظامِ ربوبیت قائم کر کے دکھایا۔جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا تھا، نہ ہی کوئی کسی دوسرے کی محنت پر عیش کرتا تھا۔اس نظام کی سب سے بڑی مثال خود سرکارِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ تھی کہ اتنے وسیع و عریض وسائل اور ریاست کی موجودگی میں بھی آپ ﷺ نے ایک محنت کش کی سی زندگی بسر فرمائی۔پھر آپ کے قابلِ فخر جانشینوں کی زندگیاں بھی بالکل اپنے پیش رو جیسی گزریں۔خصوصاً امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی حیاتِ

طیبہ بھی سادگی کا ایک شاندار نمونہ تھی ۔حالانکہ ان کے دور میں قرآن کا یہ نظام اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا اور بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی سلطنت کے سربراہ اور ایران وروم کی فتح کے بعد وہاں کے خزانوں کے مالک بن جانے کے بعد بھی فاروق اعظمؓ نے جس طرح سادگی کی زندگی گزاری ۔وہ تمام انسانوں کے لیے تا قیامت مشعل راہ ہے ۔صحیح نظام اسی طرح قائم ہوا کرتے ہیں۔

خلافتِ راشدہ میں اراضی کا نظام

خلافتِ راشدہ میں بھی لوگوں کو زرعی زمینیں دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور انسانیت کا اجتماعی مفاد ہوتا تھا۔جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا، مرکزِ ملت کو دخل اندازی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ۔لیکن اگر اس فریضہ میں کوتاہی برتی جارہی ہوتی اور کوئی یہ بہتر معلوم ہوتا کہ اس زمین کو اس شخص سے لے کر کسی ایسے شخص کے حوالہ کر دیا جائے جو اس کا انتظام بہتر طریقہ سے کر سکے ،تو خلافت اس زمین کو اول الذکر سے واپس لینے کا پورا اختیار رکھتی تھی ۔

چنانچہ تاریخ میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں اسی نظریہ کے تحت لوگوں سے اراضی واپس لی گئی ۔چند واقعات یہ ہیں :

رسول اللہ ﷺ نے بلال بن حارث کو پوری وادی عمیق کا نظام سونپ دیا تھا،لیکن وہ اس کا ایک کثیر حصہ آباد نہ کر پائے ۔پس خلیفہ دوم حضرت فاروق اعظمؓ نے ان سے فرمایا کہ رسول اللہ نے آپ کو یہ زمین اس لیے نہیں دی تھی کہ آپ نہ خود آباد کریں ،نہ کسی کو کرنے دیں ۔پس آپ جتنی زمین پر کاشتکاری کر سکتے ہیں ،کریں ،اور باقی خلافت کے حوالہ کر دیجیے ۔

یہ سن کر حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں تو رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی زمین واپس نہیں کروں گا ،چاہے میں اسے آباد کروں یا نہ کروں ۔حضرت عمرؓ نے واپسی پر اصرار کیا اور بالآخر انہیں اپنا آباد شدہ حصہ چھوڑ کر بقیہ زمین واپس کرنا پڑی ۔

غور فرمائیں ۔بلالؓ بن حارث ایک جلیل القدر صحابی تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے زمین عطیہ کی تھی ۔اور اس زمین سے لگاؤ ہونا ایک فطری بات تھی ۔مگر حضرت عمرؓ نے مفاد عامہ کے لیے بلالؓ کے مقام کا خیال نہیں کیا اور نہ ہی اس جذبہ کا کہ رسول کی دی ہوئی زمین میں کیسے واپس لے سکتا ہوں ؟

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی حکومت میں خلیفہ یعنی مرکزِ ملت کے پیش نظر صرف انسانیت کا اجتماعی مفاد ہوتا ہے ۔وہ کسی سے امتیازی سلوک نہیں کرتا اور نہ جذبات سے مغلوب ہو کر مفادِ عامہ کو نظر انداز کر دیتا ہے ۔جب ان سے زمین واپس لے لی گئی تو دیگر صحابہؓ سے بیکار پڑی زمین واپس نہ لینے کا تو کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا ۔

اسی طرح دیگر کئی افراد کے ساتھ بھی کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی جانب سے مسلمانوں کو زمین کی جائیداد سے بیدخل کر کے ان کا وظیفہ مقرر کر دینا اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ حکومتِ الٰہی کی جانب سے لوگوں کو زمین دینے کا سلسلہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ہوتا تھا اور جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا، زمین ان کے پاس رہنے دی جاتی۔ بصورت دیگر واپس لے کر کسی اور کو دے دی جاتی۔

(طوالت کے خدشہ کی بناء پر خلافتِ راشدہ میں ملکیتِ زمین کا احوال اس کتاب کے حصہ دوم میں پیش کیا جائیگا)۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا بھر میں خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے انسانوں میں 60 فیصد تعداد عورتوں کی ہے۔

ہر پانچ سیکنڈ بعد ایک بچہ ایک ایسے مرض سے ہلاک ہو جاتا ہے جو فاقہ کشی کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔

MDG REPORT GOAL 4,2010

10 ملکیتِ زمین کا تصور اور ہمارے علماء کرام کے اعتراضات

دین جہاں بھی ہوگا، مفت خورے (مترفین، سرمایہ دار طبقہ) اس کی مخالفت کریں گے۔ (سورہ سباء۔ آیت 34)

مولانا عبدالرحمٰن کیانی کے اعتراضات: اراضی فدک کا مسئلہ

خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ﴾ (الأنفال/٤١) اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے ہے۔"

(۲) جس حدیث کو آپ نے قرآن کے مطابق سمجھ کر قابل قبول فرمایا ہے وہ پوری حدیث باختلاف الفاظ اس طرح ہے۔

«نَحْنُ مَعْشَرُ الأَنْبِيَاءِ لاَ نَرِثُ وَلاَ نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ» "ہم انبیاء کا گروہ نہ خود وارث ہوتے ہیں' نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے۔ ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے"

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق صرف انبیاء سے ہے عوام سے نہیں دوسری یہ کہ اگر رسول ﷺ کی ذاتی ملکیت کچھ نہیں ہوتی تو صدقہ کس چیز کا؟

۳۔ اگر قرآن میں رسول ﷺ کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں تو یہ باغِ فدک کدھر سے آگیا؟ کیا رسول اللہ کا عمل خدانخواستہ قرآن کے خلاف تھا؟

۴۔ باغ فدک روزمرہ کی مستعملہ اشیاء سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ آپ ﷺ کی ضروریات زندگی کا ایک مستقل ذریعہ تھا اور یہ باغ فدک صرف حق ملکیت نہیں بلکہ حق ملکیت زمین بھی ثابت کر رہا ہے۔

۵۔ اس باغ کا قصہ آپ نے شروع تو کر لیا مگر پورا ذکر نہیں فرمایا۔ آگے یہ قصہ یوں چلتا ہے کہ اس باغ کو بطور ورثہ حاصل کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وکیل بن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ:

(ا) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں انفرادی ملکیت حتیٰ کہ زمین کے حق ملکیت کو درست سمجھتے تھے۔

(ب) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا مذکورہ بالا قول پیش کر کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پیش کردہ دعویٰ خارج کر دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے لئے حضور ﷺ کا یہ قول حجت اور اسلامی قانون کا ماخذ تھا۔

(ج) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ یہ مقدمہ پیش کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ باغ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر واپس کر دیا کہ وہ اسے صرف اپنے ذاتی مصرف میں نہ لائیں گے بلکہ اس میں سے خدا کے حکم کے مطابق یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کا حصہ بھی نکالا کریں گے۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ کیا کرتے تھے گویا یہ باغ امت کی مشترکہ تحویل سے نکل کر پھر سے انفرادی ملکیت میں آگیا۔

(د) حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی انفرادی ملکیت کے قائل تھے۔

(ہ) اس باغِ فدک پر حضور اکرم ﷺ کی اپنی گزران بھی تھی اور اسی کی پیداوار سے آپ ﷺ یتیموں' مسکینوں وغیرہ کو بھی اس قدر دیا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاس فاضل دولت نہیں رہتی تھی۔ اس طرح کا جود و سخا بھی آپ ﷺ کی انفرادی ملکیت کی واضح دلیل ہے۔ (آئینہ پرویزیت۔ از مولانا عبدالرحمٰن کیانی)

اس سے قبل کہ مولانا عبدالرحمٰن کیانی صاحب کے مسئلہ فدک پر اعتراضات کا مدلل جواب دیا جائے ،ضروری معلوم ہوتا ہے کہ باغِ فدک کا کچھ پس منظر بیان کردوں کہ یہ کیسے مسلمانوں کی تحویل میں آیا اور یہ باغ رسول اللہ ﷺ کے پاس عینی ملکیت کے طور پر تھا یا بطور امانت (تصرف برائے ضروریات)۔

فدک کی زرعی اراضی واقعہ ہجرت کے ساتویں سال خیبر کے یہود سے صلح کے ذریعہ بطور مال فے جماعت المومنین کی تحویل میں آیا تھا۔ یہ دراصل مدینہ سے کچھ دور خیبر میں ہی ایک گاؤں تھا جہاں کی آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی۔

جب خیبر فتح ہوا تھا تو ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کی تھی کہ انہیں مکمل امان دے دی جائے تو وہ علاقہ چھوڑ دینے پر تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ درخواست منظور فرمالی تھی اور یوں یہودی بغیر لڑائی وہاں کا نصف علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب جہاد کے بغیر کفار کا یہ علاقہ بمعہ اموال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تھا۔ پھر جب اس کی تقسیم کا معاملہ درپیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں حکم دیا کہ اس معاملہ میں اللہ و رسول کی اطاعت کرو۔ وہ جیسے کہیں، انکی بات مان لو۔ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا (سورہ الحشر۔ آیت 7) (یہ آیت اس محسوس مال کی تقسیم کے متعلق نازل ہوئی تھی جسے ہمارے ہاں اہل حدیث حضرات اسکے سیاق وسباق سے ہٹا کر حجیتِ حدیث کے جواز میں غلط طور پر پیش کرتے نظر آتے ہیں)۔

اس مال کو اللہ نے ''انفال'' کہا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وہ اللہ و رسول (ریاست کی تحویل میں) کا ہے۔ یعنی مقصد یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ یہ تمہاری کمائی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا تم پر فضل و انعام ہے۔ اس آیت کا جو یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اس سے مراد نصف حصہ اللہ کا اور نصف رسول ﷺ کا ہے، درست نہیں۔ درست مطلب یہی ہے کہ وہ مال اللہ و رسول یعنی اسلامی ریاست یعنی معاشرہ کی اجتماعی ملکیت ہے اور رسول اللہ ﷺ صرف اس کے امین ہیں۔ یہ مال اللہ کا ہے، اور اللہ کا مال انسانوں کے لیے یکساں طور پر کھلا ہوتا ہے۔

پچھلے ابواب میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ مرکزِ ملت کی کفالت معاشرہ کے سپرد ہوتی ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اس کی امانتی ملکیت دے دی گئی، حقِ تصرف مل گیا، لیکن فدک کی عینی ملکیت مرکز ہی کی رہی جس پر بعد کے واقعات گواہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فدک کی پیداوار سے صرف بحیثیت سربراہ اپنا معمولی خرچ نکالتے تھے اور باقی سب ہتھیاروں اور مسلمانوں کی دوسری اجتماعی ضروریات پر پورا کرتے تھے۔ یوں فدک مسلمانوں کی سرکاری ملکیت تھی جسے مسلمانوں میں

انفرادی طور پر تقسیم کرنے کی بجائے مرکزِ ملت کی امانتی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

کیا مالِ فے میراث یا ملکیت بھی بن سکتی ہے؟

مالِ فے اس غنیمت اور خراج کو کہا جاتا ہے جو مسلمانوں کو کفار سے لڑائی کیے بغیر مل جائے۔ فے کا مطلب ہے رجوع یا واپسی۔ پس مراد یہ ہوئی کہ مال اصل میں مسلمانوں کا ہی تھا، اور انہی کی جانب لوٹ کر آیا۔ پس فدک کی اراضی رسول اللہ ﷺ کی ایسی عینی ملکیت نہ تھی جیسا ہمارے ہاں تصور پایا جاتا ہے۔ بلکہ وہ صرف اس پر بقدر ضرورت حصہ اخذ کرنے کے لیے بطور امین مقرر ہوئے تھے۔ فدک کسی بھی طرح رسول اللہ ﷺ کی ذاتی ملکیت یا ترکہ نہ تھا۔ اگر اسے ترکہ تصور کر لیا جائے تو پھر یہ روایت پیش کرنے کا کیا مقصد ہے کہ ''ہم انبیاء کی کوئی میراث نہیں ہوتی''۔؟؟؟

اگر عبدالرحمٰن کیانی صاحب اسے رسول اللہ ﷺ کی عینی ملکیت یا میراث تصور کرتے ہیں تو پھر بصورت دیگر وہ اس فرمانِ رسول ﷺ کا انکار کر رہے ہیں کہ ہم انبیاء کا کوئی ترکہ نہیں ہوتا۔ اور بخاری ہی کی دوسری حدیث کا بھی انہی کی زبانی انکار بھی ہو جاتا ہے جہاں ابنِ عباسؓ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ہے کہ ''ماترک الا مابین الدفتین'': یعنی رسول اللہ ﷺ نے دو دفینوں والی کتاب (قرآن) کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اگر بقول کیانی صاحب یہ فدک رسول اللہ ﷺ کی عینی ملکیت تھی تو قرآن کے احکاماتِ وراثت کے تحت اسے اپنی اولاد میں تقسیم کیوں نہ فرمایا؟ اب ان روایات کے اس انکار پر کیانی صاحب تو خود ہی ''منکرِ حدیث'' ثابت ہو رہے ہیں۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

یہ بات رسول اللہ ﷺ کی شان ہی کے خلاف ہے کہ انکی کوئی ملکیت یا جائیداد تھی۔ ایسے اعتراضات کا اٹھایا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارا ملا شیعیت کا پروردہ اور فضلہ خور ہے۔

یہاں کچھ شیعت زدہ ملا یہ دلیل بھی لاتے ہیں کہ فدک رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ کو ہبہ کیا تھا۔ یعنی تحفہ دیا تھا۔ لیکن یہ دلیل بھی نہایت غلط اور غیر منطقی ہے۔ فدک پر رسول اللہ ﷺ کا قبضہ امانتی تھا، مالکانہ نہیں۔ اور مالکانہ قبضہ کے بغیر کوئی چیز ہبہ کرنا قانوناً ممکن ہی نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی چیز میرے پاس امانت ہے اور میں اسے اٹھا کر اپنے بھائی کو دے دوں کہ لے جاؤ اور عیش کرو۔؟؟؟؟؟ پس یہ دلیل بھی غلط ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیانی کے اعتراضات

اعتراض نمبر 3: اگر قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں تو باغِ فدک کدھر سے آ گیا؟

جواب: فدک پر رسول اللہ ﷺ کی ملکیت مالکانہ کی بجائے امانتی ہونے پر اوپر تفصیلی وضاحت پیش کر دی گئی ہے۔ یہ اراضی ریاست کی اجتماعی تحویل میں تھی۔

اعتراض نمبر 4: مولانا نے خود ہی اپنے اعتراض کا جواب پیش کر دیا کہ "یہ باغ رسول اللہ ﷺ کی ضروریات پوری کرنے کا ایک مستقل ذریعہ تھا۔ یہی موقف میں قرآن سے ثابت کر رہا ہوں کہ عینی ملکیت صرف پورے معاشرے یا ریاست کی اجتماعی طور پر ہوتی ہے، کسی فرد کی عینی ملکیت نہیں بلکہ امانتی ملکیت ہوتی ہے۔ اسے صرف بقدر ضرورت حق تصرف دیا جاتا ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ یہی معاملہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، وہ مرکزِ ملت تھے جسکی کفالت کی ذمہ داری معاشرہ پر تھی، پس انہیں اس اراضی پر امانتی حق تصرف دیا گیا کہ انکی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

اعتراض نمبر 5: کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فاطمہؓ کی جانب سے وکیل بن کر ابوبکرؓ کے پاس دعویٰ دائر کیا کہ ملکیتِ فدک انہیں دی جائے۔

مولانا صاحب یہ جو بھی روایات اس دعویٰ سے متعلق ہمیں ملتی ہیں، یہ ساری کی ساری تھرڈ کلاس شیعی کتب کی روایات ہیں جو حد درجہ مہمل اور بے سروپا ہیں۔ اس معاملہ پر صرف ایک بڑی روایت بخاری شریف میں ملتی ہے جس کا اولین راوی ابن شہاب زہری نامی تقیہ باز رافضی تھا جس کے کذب اور واقعات کو مصالحہ لگا کر پیش کرنے کی ذہنیت کو علامہ تمنا عمادیؒ جیسے قابل قدر اور لائق محققین خوب بے نقاب کر چکے ہیں۔ اسلیے اسکی یہ روایت بھی حقائق اور قرآنی احکامات سے کوسوں دور ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو خلیفہِ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بحیثیت مرکزِ ملت واضح طور پر بتا دیا تھا کہ آپ ﷺ کی کوئی میراث نہیں، انہوں نے خود ہی یہ فرما دیا تھا کہ "ماترکنا صدقہ"۔ پس بحیثیت مرکزِ ملت رسول ﷺ جو کچھ بھی لیتے تھے، ریاست کے اجتماعی ذرائع ہی سے لیتے تھے۔

صدیق اکبرؓ کے اس بیان کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے اور یہ معاملہ اسی وقت طے ہو گیا تھا۔ میراث کے حوالے سے تین فریق سامنے تھے، ازواجِ مطہرات، رسول اللہ ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ، اور حضرت عباسؓ بطور چچا۔ تینوں ہی حضرت ابوبکرؓ کے جواب سے مطمئن ہو گئے تھے۔ لیکن زہری نے روایت بیان کرتے وقت اس معاملہ کو بے جا ہوا دی۔ حالانکہ قرآن کی رو سے اس جھوٹی روایت کی پوزیشن صاف واضح ہے کہ:

(i) حکمِ رسول اور مرکزِ ملت کا فیصلہ سن کر فاطمہؓ کا غضبناک ہو جانا نہ صرف عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے، بلکہ بنتِ رسول ﷺ کی توہین کے مترادف ہے۔قرآن میں فرمانِ الٰہی ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالاً مُّبِيناً (سورہ احزاب۔آیت 36)

یعنی اللہ و رسول جس بات کا فیصلہ فرما دیں، تو مومن مرد و عورت کے لیے اپنا اختیار باقی نہیں رہتا۔جس نے اللہ و رسول کی نافرمانی کی، وہ گمراہ ہو گیا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُواْ فِيَ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيما (سورہ النساء۔آیت 65)

رب کی قسم ہے کہ وہ مومن نہ ہونگے جب تک اپنے درمیان ہر جھگڑے میں تجھ کر منصف نہ مانیں۔

(iii) پھر یہ بات قابلِ تسلیم بھی نہیں کہ جو فیصلہ رسول اللہ ﷺ فرما دیں، انکی اولاد اسے سن کر تسلیم نہ کرے، یا غضبناک ہو جائے۔جب صدیق اکبرؓ نے دعویٰ پر فرمانِ رسول ﷺ سنا دیا تو فاطمہؓ کے پاس دو راستے تھے، یا تو وہ اسکے فرمانِ رسول ﷺ ہونے سے ہی انکار کر دیتیں، یا پھر اسے فرمانِ رسول ﷺ مان کر اپنی ملکیت سے دستبردار ہو جاتیں۔اب زہری کی اس روایت کو دیکھیں تو فاطمہؓ کی جانب سے اس کے فرمانِ رسول ﷺ ہونے کے متعلق کسی قسم کا اعتراض سامنے نہیں آتا۔اسکا صاف مطلب یہ ہوا کہ انہیں اس بات کے فرمانِ رسول ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، تو پھر جب اعتراض نہیں تھا تو فاطمہؓ کے غضبناک ہونے کا کیا جواز باقی رہا؟ کیا رافضی زہری کی اس روایت میں اس نے در پردہ فاطمہؓ پر بھی تبرہ تو نہیں کیا۔۔۔؟؟؟

اس روایت کے علاوہ جتنی بھی روایات شیعہ بیان کرتے ہیں، وہ سب کی سب انتہائی ادنیٰ درجے کی اور من گھڑت و بے سر و پا کہانیاں ہیں۔لے دے کر یہ ایک روایت بچی تھی جسے بخاری میں ہونے کی وجہ سے ہمارا شیعیت زدہ ملا ملکیتِ رسول ﷺ کی تائید میں پیش کرتا نظر آتا ہے، سو اس کے بھی باطل ہونے کے ثبوت یہاں میں نے پیش کر دئے ہیں۔

(iv) آگے مولانا کیانی صاحب اپنے اعتراض کی شق ب اور ج میں دو متضاد تصورات پیش کرتے ہوئے خود ہی بوکھلاہٹ کا شکار نظر آ رہے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

شق (ب) میں کہا کہ صدیق اکبرؓ نے رسول کا قول پیش کر کے فاطمہؓ کا دعویٰ خارج کیا۔پس ثابت ہوا کہ رسول کا یہ قول

ابو بکر اور علی دونوں کے لیے حجت اور اسلامی قانون کا ماخذ تھا۔

لیکن اگلی ہی شق (ج) میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں دوبارہ یہ دعویٰ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے یہ باغ حضرت علیؓ کو واپس کر دیا اور کہا کہ جیسے رسول ﷺ اس میں صدقات اور مساکین کا حصہ نکالتے تھے، آپ بھی نکالا کرنا۔ پس یہ باغ اجتماعی سے انفرادی ملکیت میں آ گیا۔

مولانا کیانی صاحب ۔۔۔۔۔ یہ کیا؟؟؟ پہلے اگر صدیق اکبرؓ اور علیؓ کے لیے آپ نے فرمایا کہ انہوں نے قول رسول کو حجت اور اسلامی قانون کا ماخذ سمجھتے ہوئے تسلیم کیا۔ مگر اگلی شق میں آپ اسی قول رسول ﷺ کو حضرت عمرؓ کے ہاتھوں فسخ کروا رہے ہیں۔ کہ باغ علیؓ کو واپس دے دیا گیا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا قول ابو بکرؓ نے حجت سمجھ کر نافذ کیا تھا تو پھر اگلے دور میں فاروق اعظمؓ کو اس میں ترمیم کا اختیار کس نے دیا؟؟؟ کیا جواب ہے کیانی صاحب کے پاس اس بات کا؟

کیانی صاحب کے اسی ایک نکتہ سے اطاعتِ رسول ﷺ کے مفہوم سے متعلق کیانی صاحب اور دیگر اہل حدیث حضرات کے تصورات کی نفی اور ہمارے تصورات کی تائید ہوتی ہے کہ اطاعتِ رسول ﷺ سے مراد غیر متبدل فرامین رسول جو کہ ایرانیوں نے لکھ کر دے دیے تھے، ہرگز نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال انکے اپنے دور کے لیے مخصوص تھے جس میں ترمیم کا اختیار بعد کی قرآنی ریاستوں کو حسبِ ضرورت اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ خود یہ بات تسلیم کر رہے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کو منسوخ کرتے ہوئے باغِ فدک علیؓ کو واپس کر دیا۔ اگر قولِ رسول ہمیشہ کے لیے حجت ہوتا ہے تو پھر فاروق اعظمؓ کی جانب سے اس میں ترمیم بلکہ تنسیخ کس قانون کی بنیاد پر کی گئی ۔۔۔۔۔؟؟؟؟؟؟

(۷) شق ہ میں کیانی صاحب خود ہی تسلیم فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فاضل دولت نہیں رہتی تھی۔ اب اگر انہیں یہ بھی تسلیم ہے تو پھر دشواری نہ جانے کس بات میں ہے۔ رسول ﷺ کا اسوہ حسنہ یہی ہے کہ آپ نے کبھی اپنے پاس دولت جمع نہیں کی، عینی ملکیت نہیں رکھی تو پھر آپ اس اسوہ حسنہ پر عمل درآمد کیوں نہیں کرتے؟ بلکہ الٹا آپ تو اسے جھٹلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تصور کے رد میں کتابوں پر کتابیں لکھتے رہتے ہیں لیکن حق بات پھر بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے کہ ''آپ ﷺ کے پاس کوئی فاضل دولت نہیں رہتی تھی''۔

کیانی صاحب سے گزارش ہے کہ اسے آپ رسول اللہ ﷺ کا صرف ''جود وسخا'' قرار نہ دیں، جذباتی ہمدردی پر محمول نہ

کریں۔ یہ ایک بنیادی قرآنی اصول تھا جس پر ہمارا نبی ﷺ عمل پیرا تھا۔ جسے آپ لوگ سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

ایک اور معترض مولانا مودودی کی ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' کا ایک تنقیدی جائزہ

مولانا مودودی اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں اپنے تصوراتِ معیشت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطہ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصولوں پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجاویز کو پہلے قدم پر ہی لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ، اصول یا نصب العین کی حیثیت موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھیننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت ن ہیں دیتا جن کے ذریعہ کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔ اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو جن ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں۔ انہیں ہاتھوں میں اگر سوداگری، کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمین پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو۔ مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے، نہ کہ اسلامی۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے، نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لیے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔'' (مسئلہ ملکیتِ زمین از مولانا مودودی۔ صفحہ 71)

تبصرہ:

مولانا کی اس تحریر کا لب لباب یہ ہے کہ ملکیتِ زمین کو مرکزی تحویل میں لینے سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان بھی ایجاد نہیں کر پایا۔ یعنی خود مولانا کو بھی ایک طرح سے اعتراف ہے کہ اس

سے پہلے نظام ہائے معیشت شیطان ایجاد کیا کرتا تھا اور جس نظام کی مخالفت میں مولانا نے یہ کتاب لکھی ہے، اس سے بدتر نظام تو شیطان سے بھی ایجاد نہ ہوسکا۔ بہر حال، مولانا کی اس تحریر پر کچھ تبصرہ پیش خدمت ہے:

قارئین درج بالا اقتباس سے ایک بات تو آپ نے نوٹ کر ہی لی ہوگی کہ مولانا مودودی نے اپنے اس ''فتویٰ'' میں کسی قرآنی دلیل کی ضرورت نہیں سمجھی اور بغیر قرآنی دلائل کے یہ سارا نوٹ محض ایک ادیبانہ تحریر اور لفاظی و چرب زبانی کا شاہکار ہے۔ حالانکہ ہم جب بھی قرآن کے معاشی نظام کی بات کرتے ہیں تو اپنے نظریات وتصورات کے ثبوت میں بے شمار اور نا قابل تردید قرآنی دلائل پیش کرتے ہیں۔

اب دیکھئے۔ مولانا مودودی اور ان کی جماعتِ اسلامی کے بارے میں آپ اتنا تو جانتے ہی ہونگے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسی بات کے داعی رہے ہیں کہ اسلامی حکومت کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا جو نہایت متقی، پرہیز گار، نیک اور خدا ترس لوگ ہونگے۔ وہ ہستیاں جو خدا اور رسول کے رنگ میں رنگی ہونگی۔ حکومت کو ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' پر قائم کریں گے۔

لیکن وہی مودودی صاحب اس کتاب میں فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظامِ حکومت میں ذرائع پیداوار کو قرآنی نظام ریاست کی تحویل میں دے دیا جائے تو اس سے پورا معاشرہ اس مختصر سے حکمران گروہ کا غلام بن کر رہ جائیگا جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدلیہ اور قانون کی قوتیں ہونگی اور انہی ہاتھوں میں پھر تجارت، فیکٹریاں زمینداری وغیرہ کا نظم ونسق بھی دے دیا جائے تو اس سے ایسا انسانیت کش نظام قائم ہوگا جو آج تک شیطان بھی ایجاد نہ کر پایا۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی حکومت میں:

(1) اقتدار مرتکز ہوکر ایک چھوٹے سے حکمران طبقہ کے ہاتھ میں آجائیگا۔

(2) پورا معاشرہ اسی حکمران جماعت کا غلام بن جائیگا۔

(3) اس حکمران جماعت کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدلیہ اور قانون سازی کی قوتیں ہونگی جو وہ دوسروں کو غلام بنانے کے لیے استعمال کریں گے۔

پس۔۔۔

(4) اس کے بعد اگر تجارت، سرمایہ داری، صنعت وحرفت اور زمینداری بھی سمٹ کر انہی کے ہاتھ میں آگئی تو اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت بری طرح ذبح ہوجائیگی۔

یہ ہے مودودی صاحب کی دلیل جس کی بناء پر انہوں نے قومی ملکیت کے نظام کو شیطانی نظام قرار دیا ہے۔یعنی بات ہو رہی ہے اسلامی نظام کی، اسلام کے معاشی نظام کی، لیکن خرابیاں اور برائیاں وہ گنوا رہے ہیں جابرانہ فرعونی یا نمرودی دور حکومت اور ملوکیت کی، جو ان کے خیال سے اس نظامِ خلافت میں پیدا ہو جائیں گی۔

آپ نے پیچھے حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں عراق، شام، مصر اور دیگر مفتوحہ ممالک کی اراضی کے متعلق انتظام فرمایا تھا کہ انہیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے مسلمانوں کی اجتماعی قومی ملکیت قرار دیا جائے اور اس کا انتظام اسلامی ریاست کا مرکزِ ملت یعنی خلیفہ وقت کرے۔تو کیا حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فیصلہ شیطان کی ایجاد تھا؟ یہ تو ڈائریکٹ حضرت عمرؓ جیسے عظیم ریفارمر پر مودودی صاحب کی جانب سے تبرا کا تیر ہے۔کیا حضرت عمر فاروقؓ کے اس فیصلہ سے وہ خرابیاں پیدا ہوئی تھیں جو مودودی صاحب نے اپنی اس کتاب میں گنوا ڈالی ہیں؟

کیا قرآنی ریاست کی حکومت اور دیگر ریاستوں کی ملوکیت یا مروجہ ''جمہوریت'' کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں؟

اگر بقول مودودی صاحب قرآنی نظامِ خلافت قائم ہو جانے کے بعد بھی حکمرانوں کی یہی حالت ہو گی کہ اگر ان کے ہاتھوں میں رزق کے سرچشمے دے دئے جائیں تو وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے تو پھر بتائیں کہ ایک فرعونی یا نمرودی نظام اور ایک اسلامی نظام میں کیا فرق باقی رہ گیا؟

پھر ہمارے اس قرآنی نظامِ خلافت میں آخر کیا خوبیاں ہیں کہ اللہ موجودہ تمام نظاموں کا تختہ الٹ کر قرآنی نظام قائم کرنے کے لیے ہر کوشش کا نام جہاد رکھتا ہے؟ اگر اسلامی نظام میں بھی انسانوں کو ایک مخصوص مفاد پرست طبقہ کا محکوم رہنا ہے، اس میں بھی ذرائع پیداوار پر سانپ بن کر بیٹھ جانا اربابِ اقتدار کا طرزِ عمل ہے، اس میں بھی اگر پولیس، فوج، عدلیہ اور قانون ساز اداروں نے صرف حکمرانوں کے ہی مفادات کا تحفظ کرنا ہے تو پھر آخر موجودہ نظام ہائے معیشت (سرمایہ داریت اور کمیونزم) میں کونسی خرابی ہے جو اس اسلامی نظام میں نہیں ہو گی؟ آپ اپنے اسلامی نظام کو دنیا میں رائج دوسرے نظاموں سے آخر کیسے ممیّز کر سکتے ہیں؟؟؟ اس بات کے جواب سے مودودی صاحب کی پوری کتاب خاموش ہے۔

قرآن کے معاشی نظام پر مودودی صاحب کی ایک عجیب وغریب طنز

اپنی اسی کتاب (مسئلہ ملکیتِ زمین) میں قرآن کے اس تصورِ معیشت کہ زمین افراد کی عینی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا ریاست کی تحویل میں ہونی چاہیے، مودودی صاحب نے طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"آجکل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک فقرہ یوں نکالا ہے "الارض للہ"۔اوراس پر انہوں نے قیاسات کا ایک پورا کریملن تعمیر کرڈالا ہے" (مسئلہ ملکیتِ زمین ازمولانا مودودی)

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیے کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ "للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض "(آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے،وہ اللہ کا ہے)۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین۔ازمولانا مودودی)

ایک بار پھر دلائل کی بجائے افسانوی لفاظی اورلن ترانیوں سے کام لیتے ہوئے مودودی صاحب لائن سے ہٹتے ہوئے جذباتی طنز پر اتر آئے ہیں۔انکی جانب سے قرآن میں موجود "الارض للہ" کے عظیم الشان اعلان پر تنقید کی گئی ہے کہ بقول انکے اس لفظ کا غلط مفہوم لیتے ہوئے اس پر قیاسات کا ایک پورا کریملن تعمیر کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر انکی کتاب کو غور سے پڑھیں تو آپ پر یہ انکشاف ہوگا کہ مودودی صاحب ایک ہی قسم کی آیات سے ایک مفہوم اپنے مطلب کے مطابق لیتے ہیں اوراسی قسم کی دوسری آیات کا مفہوم جب ان کی مرضی کے خلاف جاتا ہے تو اسے غلط قرار دے دیتے ہیں۔

اہل علم جانتے ہیں کہ مودودی صاحب اورانکی جماعتِ اسلامی کا شروع دن سے یہی موقف رہا ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کے لیے ہے۔کسی فرد کو حقِ حکومت حاصل نہیں اورخدا کی حکومت سے انکی مراد یہ ہے کہ حکومت کا نظم ونسق ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جواللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق حکومت چلائیں۔

اس دعویٰ کی بنیاد "ان الحکم الا اللہ" یعنی حکومت صرف خدا کی" ہے۔

اب ذرا غور کریں کہ مودودی صاحب نے کیا قیاسات کا یہ "کریملن" سارے کا سارا اپنے حق میں تعمیر نہیں کرلیا؟

کہ حکومت کا حق افراد کو نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر ملت کو ہے جو احکاماتِ خداوندی کے مطابق حکومت کا نظم ونسق چلائیں۔۔۔۔؟؟؟

اب اگر کوئی شخص "الارض للہ" سے بھی یہی مفہوم مراد لے کہ زمین پر ملکیت کا حق افراد کو نہیں، بلکہ یہ نظام کی اجتماعی تحویل میں رہنی چاہیے اور نظام کو ہی اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق زمین کا انتظام کرے،تو یہی بات پھر مودودی

صاحب (اور انکے پیروکاروں) کے نزدیک ''الارض للہ'' کی من مانی تاویل بن جاتی ہے، اور اسکے مدعی کو سوشلسٹ، کمیونسٹ، دہریہ اور نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے۔

آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب نے ''الارض للہ'' کے مدمقابل ایک دلیل یہ پیش کی ہے کہ قرآن میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''للہ ما فی السمٰوت و ما فی الارض''۔ تو یوں سارا کچھ تو پھر اللہ کی ملکیت ہی ہے۔ یعنی ان کے بقول یہ ساری کائنات اللہ کی ملکیت ہے اس لیے اللہ کسی بھی وقت کل عالم انسانیت کو ''بلیک میل'' کر سکتا ہے۔ یا پھر اللہ میاں نے یونہی بیٹھے بیٹھے ترنگ میں آ کر شاعری فرما دی ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے، سب اس کا ہے۔ اس لیے اس بات کو مودودی صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق ''Serious'' نہیں لینا چاہیے۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآنی نہج پر قائم اللہ تعالیٰ کی حکومت کے تحت افراد کی انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ افراد کے ذمہ تو انسانیت کی نشو ونما ہوتا ہے۔ چونکہ نوعِ انسانی میں وہ خود بھی شامل ہوتے ہیں، اس لیے اس میں خود انکی اپنی پرورش بھی شامل ہوتی ہے۔ انکی پرورش کے لیے کچھ اشیاء ان کے تصرف میں بھی دے دی جاتی ہیں اور ایسی ملکیت عینی نہیں بلکہ امانتی یا وکالتی ملکیت ہوتی ہے۔ جب تک اسکا درست استعمال ہوتا رہے گا، اس فرد کا حق ملکیت برقرار رہے گا، لیکن جونہی اس شخص نے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیجا اسراف یا بخل سے کام لیا اور اس ملکیت کا غلط استعمال کیا تو ریاست حق رکھتی ہے کہ اسے واپس اپنی تحویل میں لے کر اس کا خود انتظام کرے یا پھر کسی اور بہتر منتظم کے تصرف میں دے دے۔ یہ سب کچھ اصول وضوابط کے تحت ہوتا ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور ربوبیتِ عامہ کے لیے قرآنی ریاست مدون کرتی ہے۔

ویسے بھی جب اللہ نے مومنین سے ان کی جان و مال بعوض جنت خرید لیا ہے، اور یہ معاہدہ تصوراتی نہیں، بلکہ عملی طور پر واقع ہوتا ہے۔ مومنین اپنی جان و مال اس قرآنی نظام کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں جو دنیا میں حکومتِ خداوندی قائم کر کے انہیں اس دنیا میں خوشحال جنتی زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔ (سورہ التوبہ۔آیت 111) تو پھر جماعتِ مومنین کے افراد کی اپنی ذاتی ملکیت میں تو کوئی چیز رہ ہی نہیں سکتی۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

تقریباً ایک بلین لوگ اکیسویں صدی میں یوں داخل ہوئے کہ وہ نہ کچھ پڑھنے کے قابل تھے، نہ ہی دستخط کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

2000ء کے اختتام تک دنیا بھر میں اسلحہ کی مد میں خرچ کی جانیوالی رقم کا صرف ایک فیصد حصہ دنیا کے ہر بچے کو بنیادی تعلیم دلانے کے لیے کافی تھا۔

State of the World, Issue 287 - Feb 2007, New Internationalist.

11 قرآن کے معاشی نظام کے شواہد خارجی کائنات سے: شہد کی مکھی کی زندگی

معزز قارئین، قرآنی آیات کی کوئی بھی شخص من مانی تشریح کرسکتا ہے، کوئی بھی مفاد پرست قرآن کو اپنی مرضی کا پہنا وا پہنا سکتا ہے۔ کسی کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا، لیکن اس قدرتی نظام کا کیا کریں جو خارجی کائنات میں از خود جاری و ساری ہے؟ ممکن ہے میری جانب سے اتنی مفصل ترین گفتگو کے بعد بھی کسی محترم قاری کے دل میں قرآن کے معاشی نظام کے متعلق میرے پیش کردہ حقائق پر تحفظات ہوں۔ دل میں کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہو، کسی آیت کے مفہوم پر کوئی اعتراض ہو، پورے مضمون کو پڑھ لینے کے بعد بھی دل مطمئن نہ ہو رہا ہو تو آئیں آپ کو قرآن کے اس معاشی نظام کے شواہد خارجی کائنات سے فراہم کروں جہاں انسانی دنیا کے برعکس اللہ تعالیٰ کا قانون از خود جاری و ساری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (سورہ صٓ۔ آیت 27)

کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ ہم نے باطل (بلاوجہ) پیدا نہیں کیا، یہ محض ان لوگوں کا وہم اور قیاس ہے جو حقیقت سے انکاری ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (سورہ الدخان۔ آیت 38)

کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ یونہی کھیل تماشے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔

خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ

(سورہ عنکبوت۔ آیت 44)

ارض و سماء کو برحق (ہر چیز انسان کے فائدہ کے لیے) پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (سورہ الزخرف۔ آیت 84)

کائنات کی بلندیوں میں بھی اللہ کا قانون نافذ ہے اور اس زمین پر بھی اللہ ہی کا قانون نافذ ہوگا۔

اشیائے کائنات میں وحی (فرائض منصبی کی ہدایات) جبلی (Instinct) طور پر رکھ دی گئی ہے۔

قارئین انسان با اختیار پیدا کیا گیا ہے، لیکن دیگر اشیائے کائنات کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا، بلکہ ان میں جبلی طور پر رہنمائی رکھ دی گئی ہے اور انہیں انکے فرائض منصبی بتا دیے گئے ہیں جن پر وہ بلا تعطل اور بلا اختیار ہمیشہ سے عمل پیرا ہیں۔ کائنات کی ہر چیز اور ہر مخلوق کو بذریعہ وحی رہنمائی دے دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر شہد کی مکھی کو لے لیجیے جس کا ذکر قرآن میں پوری ایک سورۃ (النحل) میں آیا ہے۔ وہاں بھی بتایا گیا ہے کہ شہد کی مکھی کو بذریعہ وحی اس کے فرائض منصبی کی جانب رہنمائی دے دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں وحی کا لفظ صرف شہد کی مکھی کے لیے ہی نہیں آیا۔ قرآن میں

وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا (سورہ حٰم السجدہ۔ آیت 12)

بھی آیا ہے۔ وحی کا یہ لفظ ارض کے لیے بھی آیا ہے۔

بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا (سورہ الزلزال۔ آیت 5)

اشیائے کائنات کے اندر جو وحی جبلی طور پر رکھ دی گئی ہے، اس میں ان کے اپنے ذاتی کسب و ہنر اور علم کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کے اندر فطری طور پر رکھ دی ہیں یعنی انہیں از خود Programme کر دیا ہے۔ مخلوق کے فرائض منصبی کی جانب اسی رہنمائی کو ہی وحی کہتے ہیں۔

آپ کائنات کا مشاہدہ کریں، اس کائنات کے مختلف اجزاء جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ان کی وحی ہے، ان کی فطرت ہے۔ پانی کی یہ فطرت ہے کہ اگر اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ آئے تو وہ نشیب کی جانب بہتا ہے۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ پانی نشیب کی بجائے فراز (بلندی) کی جانب بہنے لگ جائے۔ پانی 100 ڈگری سینٹی گریڈ پر ابلنے لگتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ اس درجہ حرارت سے پہلے ہی ابلنے لگ جائے، یا اسے ابلنے کے لیے زیادہ درجہ حرارت کی ضرورت پڑ جائے، بیج کی یہ فطرت ہے کہ اسے اگر مٹی میں بو دیا جائے تو پانی دیا جائے تو اس میں سے پودا نکلنے لگتا ہے۔ گائے بکری کی یہ فطرت ہے کہ وہ سبز چارہ کھاتے ہیں، یہ ان کی فطرت ہے۔ ان کو کبھی کسی نے گوشت کھاتے نہیں دیکھا۔ اسی طرح شیر، چیتے اور تیندوے کی فطرت گوشت خوری ہے۔ یہ چاہے بھوک سے مر رہے ہوں، لیکن ان کے آگے اگر سبز چارہ یا کوئی پھلدار درخت بھی پھلوں

سے لدا ہوا موجود ہو تو اس کی جانب دیکھیں گے بھی نہیں۔اور شکار کی تلاش کریں گے۔یہ ان کی فطرت ہے۔

ایک مرغی کے نیچے کچھ انڈے رکھے جاتے ہیں،ان میں سے کچھ مرغی کے اپنے انڈے ہیں اور کچھ بطخ کے۔اب ان میں سے جب بچے نکلتے ہیں تو مرغی کے انڈے خشکی کی جانب چلتے ہیں اور دانہ دنکا کھانے لگتے ہیں،لیکن جو بطخ کے بچے ہیں وہ پیدائش کے فوراً بعد پانی کی جانب لپکتے ہیں۔یہ ان کی فطرت ہے۔آگ کی فطرت جلانا ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ آگ برف جمانے کا کام دے سکے۔اسی طرح پانی کی فطرت آگ بجھانا ہے۔پانی کبھی آگ بھڑکانے کا کام نہیں دے سکتا۔

یہ سب فطرت ہے۔یہ تمام ہدایات (Direction) انہیں خدا کی جانب سے ملی ہیں اور ان کا کام وحی خداوندی کے ملنے کے بعد از خود ان امور اور فرائض منصبی کی انجام دہی ہے جن سے روگردانی کا اختیار انہیں نہیں دیا گیا۔قرآن نے ان ہدایات کو بھی وحی قرار دیا ہے۔زندگی گزارنے کی وہ ہدایات جو اشیاء کو رب کائنات کی جانب سے دی جاتی ہیں،کہ انہوں نے کس مقررہ طریقہ پر چلنا ہے،کیا کرنا ہے،کیسے کرنا ہے،یہ سب وحی کہلاتا ہے۔

البتہ انسانوں کی دنیا میں آ کر ذرا فرق پڑ جاتا ہے۔انسان کو بھی ہدایات ملتی ہیں،لیکن وہ ان پر عمل کرنے پر مجبور نہیں،اسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ ہدایات تمہارے سامنے ہیں۔اب ان پر عمل کرو گے تو تمہارا ہی فائدہ ہے،نہ کرو گے تو نقصان بھی تمہارا۔

قرآن کے معاشی نظام کے شواہد: شہد کی مکھی پر تحقیق

اللہ نے فرمایا کہ

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاء لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (سورہ النحل۔آیات 68-69)

شہد کی مکھی کی جانب بھی ہم نے وحی کی (یعنی ہدایاتِ زندگی دیں)۔ان کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اور ان غور و فکر کرنے والے اہل مغرب نے تو شہد کی مکھی کی زندگی پر بہت تحقیقی کتب لکھ ڈالیں۔ہم لوگ تو صرف اتنا ہی

جانتے ہیں کہ جب یہ مکھی لڑتی ہے تو جان نکال دیتی ہے اور جسم سوج جاتا ہے۔لیکن اہل تحقیق نے برسہا برس اس مکھی کی زندگی پر تحقیقات کیں اور اس کے اندازِ زندگی کا مشاہدہ کیا۔اس مکھی کے نظامِ زندگی پر ایک دلچسپ جائزہ پیش خدمت ہے۔

شہد کی مکھی کا چھتا

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ:

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ (سورہ النحل۔آیت 68)

ہم نے وحی کی اس (مکھی) کی طرف کہ پہاڑوں، درختوں میں جا کر گھر بناؤ۔

شہد کی مکھی کے چھتے پر غور وفکر کیجیے۔کیسے ہشت پہلو خانے نہایت عمدگی اور نفاست کے ساتھ بالکل ایک جیسے بنے ہوتے ہیں۔اس چھتے کو بننے کے لیے ایک انسان کو نہ جانے کیا کیا جیومیٹریکل آلات استعمال کرنا پڑیں، پھر بھی اس انسان کے کیے ہوئے اس کام میں کہیں نہ کہیں اونچ نیچ ہو جائے۔کوئی خانہ زیادہ چھوٹا بن جائے تو کوئی زیادہ بڑا۔اس چھتے میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے خانے ہوتے ہیں۔آپ ذرا ان گھروں کی یکسانیت ملاحظہ فرمائیں۔اس میں بڑے بڑے بنگلوں، محلات اور کوٹھیوں والوں اور جھونپڑیوں اور بوسیدہ کچے مکانات کے مالک انسانوں کے لیے نشانیاں ہیں۔اگر وہ غور وفکر کرنا چاہیں۔

شہد کی تیاری کی غرض سے رس حاصل کرنے کے لیے ہدایات

اللہ تعالیٰ نے پھر مکھی کی جانب یہ وحی کی کہ:

ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً (سورہ النحل۔آیت 69)

جاؤ اور ایک ایک پھول سے رس چوس لو۔

اندازہ کیجیے کہ کیا کام ذمہ لگایا ہے۔اگلے الفاظ ہیں ''فاسلکی سبل ربك ذللاً .

لفظ ''سبل'' سبیل کی جمع ہے جس کا مطلب ہے راستے۔یعنی یہ جو راستے تمہیں بتائے گئے ہیں، ہمارے قانون کی اطاعت کرتے ہوئے ان پر چلو۔راستوں پر سفر کی حالت میں کسی خاص مقصد کے تحت ہی چلا جاتا ہے۔یعنی ایک خاص قانون کے تحت ایک مقصد لے کر گھر سے نکلنا، اور سیدھا وہاں جانا تاکہ مقصد حاصل ہو، اور پھر واپس آنا ہی سفر کہلاتا ہے۔یہی اس

آیت کا درست مفہوم ہے۔

غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔ یہاں سفر کی بات ہو رہی ہے، آوارگی اور سفر دو مختلف امور ہیں۔اس میں آوارگی کا کوئی ذکر نہیں۔اگر ذلّلاً نہ ہو، تاکہ قوانین کی اطاعت نہ ہو، اور اس حالت میں یہ سفر ہو تو یہ آوارگی کہلاتی ہے۔ اور اگر ان چیزوں کو سامنے رکھ کر سفر کیا جائے تو وہ بامقصد سفر یعنی اطاعت کہلاتا ہے۔اس میں اس انسان کے لیے بڑی رہنمائی ہے جو راہ سے بھٹکے ہوا وحی کے خلاف زندگی بسر کر رہا ہو۔اب یہ جو قرآن نے لفظ ''سبل'' استعمال کیا ہے، یعنی راستے، بڑا غور طلب لفظ ہے۔ یہ کیا راستے ہیں جو شہد کی مکھی طے کرتی ہے؟ بہت قابلِ غور نکتہ ہے۔

ایک مکھی اپنے وزن سے پانچ سو گنا زیادہ وزنی شہد اکٹھا کرتی ہے۔(کماؤ پوری صلاحیت سے)

شہد کی مکھیوں پر جو تحقیق ہوئی ہے، اس کے مطابق ایک مکھی صبح سے شام تک اپنے جسم کے مجموعی وزن سے پانچ سو گنا زیادہ وزنی شہد کا مادہ چوس کے لاتی ہے۔اسے شہد کا ایک چمچ بنانے کے لیے قریب دو ہزار پھولوں سے رس چوسنا پڑتا ہے۔جبکہ ایک پونڈ وزنی شہد بنانے کے لیے اپنے چھتے سے پھولوں تک جانے کیلئے 37000 بار ان راستوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔اللہ اکبر۔

پچاس پچاس ہزار میل کا سفر

اور ان مکھیوں کا اوسط فاصلہ جو ان محققین نے اس کے متعلق بتایا ہے، وہ پچاس ہزار میل کا ہوتا ہے۔یہ ایسا ہی ہے کہ اگر کرہ ارض کے گرد کوئی دو دفعہ چکر لگائے تب اتنا فاصلہ بنتا ہے۔'سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا' ، میں وہ سبل کیا ہے؟ یہی ہے۔ان سے پوچھو جنہوں نے ان راہوں پر چل کر دیکھا ہے کہ یہ سبل کیا ہے، ایک پھول یہاں ہے تو دوسرا نہ جانے کہاں ہے۔یہ ہیں سبل جن پہ یہ مکھیاں پچاس پچاس ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔

پھر یہ فاصلہ بھلا کیسے طے ہوتا ہے؟ مکھیاں اپنے چھتے سے جاتی ہیں، پھر واپس آتی ہیں، پھر جاتی ہیں، ایک دفعہ جانے میں سینکڑوں میل کا فاصلہ بنتا ہے۔اور سفر اس ہوا میں کیا جاتا ہے جہاں کوئی نشانِ راہ نہیں، کہیں راستے کی ہدایات کے لیے نشانات نہیں۔مکھی سینکڑوں میل طے کر کے اس پھول کی جانب جاتی ہے۔وہاں سے ایک قطرہ یا قطرے کا ایک جزو لے لیتی ہے تو فوراً واپس آتی ہے۔وہ اپنے اسی چھتے کو نہیں بھولتی۔کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک مکھی اپنا چھتا ہی بھول گئی ہو اور غلطی

سے دوسرے چھتے پر جا پہنچی ہو۔نظریں اس کی وہیں ہوتی ہیں اپنے آشیانے کی جانب۔کتنا بامقصد سفر ہے۔وہی سفر جسے قرآن کریم نے ''ذللاً'' کہہ کر پکارا ہے۔ہمارے قانون کی اطاعت کرتی چلی جارہی ہے۔سینکروں میل تک جارہی ہے۔جوں ہی وہ چیز اسے ملتی ہے،جس کی تلاش میں وہ نکلی ہو،تو

پھر وہی سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے واپس چھتے میں آجاتی ہے۔آگے بڑھیئے۔

ہزاروں مکھیوں میں سے ایک بھی امانت میں خیانت نہیں کرتی۔

چھتے کے اندر ہزاروں کی تعداد میں مکھیاں ہوتی ہیں۔وہ باہر جاتی ہیں،پھولوں سے رس لے کر واپس آتی ہیں۔آج تک کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ مکھی نے راستے میں خود اس رس میں سے تھوڑا سا پی لیا ہو۔وہ بھوکی مر جائے گی،لیکن ایسا کبھی نہیں کرتی کہ امانت میں خیانت کرے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اپنی امانت اس خارجی کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں رکھ دی۔کسی نے اس میں خیانت نہیں کی۔لیکن:

وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ (سورہ احزاب۔آیت 72)

یہ انسان ہی کمبخت ہے جو اس میں خیانت کرتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً (سورہ احزاب۔آیت 72)

یہ ظالم بھی ہے،جاہل بھی۔

کسی مکھی نے کبھی اپنی اس امانت میں خیانت نہیں کی۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے تھوڑا یا سارا رس بھوک لگنے کی وجہ سے پی لیا ہو۔وہ ایسا کبھی نہیں کرتی چاہے کتنی ہی بھوکی کیوں نہ ہو۔اس مضمون کے ابتدائی حصہ جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر نعمت اللہ کی جانب سے ہے،کو ذہن میں لایئے اور سوچیئے اس مکھی کا طرز عمل کیا ہے۔یعنی ہر نعمت اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہے۔ہر فرد اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق پوری محنت کرے،کوشش کرے اور اپنی محنت کے حاصل کو لا کر اس مرکز (چھتہ) میں بغیر خیانت کیے مرکزِ ملت کے پاس جمع کرادے۔

آگے آپ جانتے ہیں کہ ان مکھیوں کا یہ کیسا نظام ہے؟ جو وہ لاتی ہیں وہ لانے کے بعد وہاں جا کر رکھ دیتی ہیں۔یعنی چھتے میں Deposit کرادیتی ہیں۔اور پھر خود خاموشی سے باہر آکر بیٹھ جاتی ہیں۔اندر ان سب کا ایک سربراہ (مرکزِ ملت) ہوتا ہے جسے ملکہ مکھی کہا جاتا ہے۔چھتے کے اندر ان کا نظام یہ ہوتا ہے کہ انڈے دینے والی مکھیاں سب سے اندرونی حصہ میں حفاظت

سے رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ان کے باہران کے حفاظتی گارڈ ہوتے ہیں۔ان کا کام باہر کے خطرات سے ان کی مدافعت کرنا ہوتا ہے۔ یہ ڈنک مارنے والی مکھیاں ہوتی ہیں،انڈے

دینے والی مکھیاں اندر ہوتی ہیں۔جبکہ یہ مکھیاں ان کے باہر کھڑی رہتی ہیں۔اور جورس لانے والی مکھیاں ہوتی ہیں،انہوں نے سامانِ نشوونما اپنے ذمہ لیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں میل کا سفر طے کرتی ہیں اور جو کچھ ملتا ہے،اسے لاکر سربراہ کو پیش کر دیتی ہیں۔یعنی جمع کرا دیتی ہیں۔اس جمع کردہ ڈیپازٹ مقدار میں جونشوونما کے لیے بہترین حصہ ہوتا ہے،وہ سارے کا سارا ان نوزائیدہ بچوں کے حصہ میں چلا جاتا ہے۔پھر کچھ ملا جلا اور کچھ موم ان سیکیورٹی گارڈ مکھیوں کو دے دیا جاتا ہے۔اور پھر اس میں سے جو موم بچتی ہے،وہ ان کارکن مکھیوں کو دی جاتی ہے جو باہر بیٹھی ہوتی ہیں۔ یہ وہی کارکن مکھیاں ہیں جو پھولوں کا رس نچوڑ کر لاتی ہیں۔ان کے حصہ میں موم آتی ہے۔

چھتے میں ہر ایک کو ضرورت کے مطابق ملتا ہے۔(لو ضرورت کے مطابق)

اس چھتے میں ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق اس سامانِ نشوونما سے ملتا چلا جاتا ہے۔کوئی مکھی یہ نہیں کہتی کہ بھئی میں نے جان مار کر اتنی محنت سے اتنا عمدہ،شیریں اور لطیف رس نکالا تھا،تو آپ یہ اسے کیوں دے رہے ہیں جو کچھ بھی نہیں کرتی۔اور یہ ہمیں موم کیوں دی جا رہی ہے؟ کوئی مکھی یہ شکایت زبان پر نہیں لاتی،احتجاج نہیں کرتی۔ان مکھیوں کے اندر کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ یہ کارکن (Labour) مکھیوں کی اپنی استطاعت ہوتی ہے۔جبکہ سپاہی مکھیاں اپنی استعداد رکھتی ہیں اور پیدا کرنے والی مکھیاں اپنی الگ استطاعت لیے ہوتی ہیں۔

اس چھتے کی ہر مکھی اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق جمع کرتی ہے۔(کماؤ صلاحیت کے مطابق)

ہمیں سب مکھیاں بظاہر ایک جیسی ہی نظر آتی ہیں۔لیکن قرآن نے کہا ہے کہ:

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (سورہ زخرف۔آیت 32)

یہ جوان کے اندر مختلف الانواع صلاحیتیں،استعداد وغیرہ دیکھنے میں آتی ہیں،یہ اس لیے ہیں کہ چھتے میں مختلف کام ہو رہے ہوتے ہیں،جو مختلف مکھیوں نے سرانجام دینے ہوتے ہیں۔اس لیے یہ اختلافی مدارج ہوتے ہیں۔ایسا نہیں ہوتا کہ جو مکھی رس چوس کر لائے،وہی سارا رس پی جائے کہ یہ تو میرا حصہ ہے۔میں نے اپنی محنت سے کمایا ہے،میری ملکیت ہے۔میری

پراپرٹی ہے۔ نہ وہ مکھی کسی ساتھی مکھی کو یہ کہتی ہے کہ ''تم لوگ مامے لگتے ہو جو مجھ سے میری محنت طلب کر رہے ہو؟ سارا دن جان مار کر کام میں کرتی ہوں، ہزاروں میل کھجل خوار ہوتی ہوں، اور یہ جناب مزے سے اندر بیٹھی رہتی ہیں۔ ایسا مکھیاں کبھی نہیں کہتیں۔

قرآن نے کہا ہے کہ مدارج کا یہ اختلاف صرف اور صرف تقسیم کار (Division of Labour) کے لیے ہے۔ معاشی تقسیم کے لیے نہیں۔

چھتے کی ساری پراپرٹی پر مرکزِ ملت کا کنٹرول ہوتا ہے۔

کوئی مکھی یہ نہیں کہتی کہ بھئی جو کچھ میں لائی ہوں، وہ میری ملکیت ہے۔ اس میں سے دوسروں کو میں نہیں دے سکتی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب جو بھی اثاثہ ہے، مرکزِ ملت کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ

(سورہ البقرہ۔ آیت 143)

تمہیں ہم نے ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تا کہ تم بنی نوع انسان کے اعمال کی نگرانی کرو''

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (سورہ البقرہ۔ آیت 143)

اور تمہارے اوپر ایک مرکز جو تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔

شہد کے چھتے کے اندر ایک ملکہ مکھی (Queen) ہوتی ہے۔ یہ مکھی سارے نظم و نسق کی مالک ہوتی ہے۔ وہ بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ چھتے کے خانوں سے لے کر حصولِ رزق کے لیے اتنی جدوجہد تک۔ اور چھتے کے اندر جا کر اس سامانِ رزق میں سے الگ الگ کرنے والی چیزیں، کہ یہ شہد فلاں کا ہے، یہ اس کا ہے، اور یہ موم کا حصہ۔ پھر اس رزق کی تقسیم کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے۔ یہ سارا انتظام ملکہ مکھی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ سارا نظام کیسے چل رہا ہے؟ اسی لیے کہ ''ہم نے شہد کی مکھی کی جانب وحی کی تھی'' (سورہ النحل۔ آیت 68)۔ اور اب یہی وہ وحی ہے جو قرآن کے اندر ہم نے تمہارے لیے بھی کی ہوئی ہے۔ ثم تتفکرو۔

انسانی زندگی کی جانب رہنمائی

قرآن کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت باہم مربوط ہے۔ اس لیے بھی ہے کہ بات آگے چلتی رہے۔ ہمارے مروجہ تراجم میں یہ خصوصیت موجود نہیں۔ وہ کسی کو بھی قرآن کی تعلیم نہیں سمجھا سکتے۔ اب دیکھیے۔ کہ بارش برسانے سے بات شروع ہوئی

(دیکھئے مضمون کا حصہ اول) زمین پر فصلیں اگانا، دودھ ملنا، شہد کے چھتے کا پورا نظام بالترتیب سامنے لایا جارہا ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اب اپنی انسانی زندگی کی جانب واپس لوٹ آؤ:

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ وَمِنکُم مَّن یُرَدُّ إِلَی أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئاً إِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْر (سورہ النحل۔آیت 70)

تمہارے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں، نشوونما پاتے ہیں۔ پھر بھرپور نشوونما پانے کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ (یتوفٰکم کے معنی وفات پا جانا ہی نہیں، اس کے معنی پورا ہونا بھی ہیں۔ یعنی بھرپور جوانی کی عمر تک پہنچنا۔ پھر اس کے بعد انسان پر بڑھاپے کی عمر آجاتی ہے۔ بڑھاپے میں پھر سے انسان کی قوتیں جواب دینے لگتی ہیں۔ دماغی صلاحیتیں کم ہوجاتی ہیں۔ نسیان کا غلبہ ہوتا ہے۔ بصارت کمزور ہوجاتی ہے۔ ایسی منزل آجاتی ہے کہ جن اشیاء کا علم حاصل کیا تھا، وہ بھی بھولنے لگتی ہیں۔

اگر ہم عمر کے لحاظ سے ایک ایک فرد پر غور کریں تو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اکتسابِ رزق میں واضح فرق محسوس ہوگا۔ ان مدارج کی بناء پر بچہ کچھ بھی پیدا نہیں کرسکتا۔ جبکہ پیداوار میں بیشتر حصہ جوان طبقہ کا ہی ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں پھر وہ صلاحیتیں کمزور ہوجاتی ہیں بلکہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

بتایئے کہ یہ جو اکتسابِ رزق کا ان کے اندر اختلاف پیدا ہورہا ہے، اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے؟ اگر رزق کی تقسیم اس بنیاد پر ہو کہ جو کماتا ہے، سب اسی کا ہو تو یوں تو پھر سارے گھرانے کا بیڑہ ہی غرق ہوجائے۔ بلکہ پوری بنی نوع انسان کا۔ ایسی صورتحال میں شام کو بیوی اپنے خاوند سے یہ مطالبہ نہ کرے کہ لاؤ دو چھوٹے بچے کے دودھ کے پیسے۔ ایسے حالات میں تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ آپ ایک نوجوان بیروزگار بچے کو پوچھیں کہ بھئی تم کمائی کیوں نہیں کرتے؟ پھر عمر ڈھلتی ہے۔ باپ بوڑھا ہوجاتا ہے۔ پھر کیا ان کے ہاں یہ تعلق نہیں رہتا جو ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہیے؟ کیا آپ کا تعلق باپ کے ساتھ صرف ایک بینک مینیجر کا تھا کہ ''لاؤ پیسے دو''۔ بس۔ اسی سے اندازہ کرلیجیے کہ صرف ایک ہی فرد کے اندر بچپن سے بڑھاپے تک اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں کس قدر فرق آجاتا ہے۔ صرف ایک ہی فرد میں۔

اب ذرا واپس چھتے کی جانب چلئے۔ کیا خیال ہے؟ اگر یہ شہد کے چھتے والا معاشی نظام نہ ہوتا تو کوئی بچہ زندہ رہتا؟ اگر ذاتی جائیداد کی بات کرتے ہیں تو پھر تو یہ ساری جوانوں ہی کی ہوئی۔ یہی بات قرآن میں رب تعالیٰ سمجھانا چاہ رہا ہے کہ دیکھو اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں اختلاف ہوتا ہے اور یہ منجانب اللہ ہے۔ اور خود ایک فرد میں ہی عمر کے ساتھ ساتھ کیسے

اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں فرق آتا چلا جاتا ہے؟صرف یہ ذہن میں رکھو کہ ہرنعمت اللہ کی جانب سے ہے اوراس کی تقسیم بھی اسی کے نظام کے تحت ہوگی۔

شہد کی مکھی کا معاشی نظام

یہ ہے قارئین وہ نظام جوشہد کی مکھی چھتے کے اندر (وحی کی ہدایات کے تحت) قائم کرتی ہے۔اگر باہر جانیوالی مکھیاں بھی انڈے دینے والی مکھیوں کی طرح پسر کر بیٹھ جائیں توچھتہ ہی ختم ہوجائے۔اب آگےاس نظام کی بات آتی ہے:

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاء

(سورہ النحل۔آیت 71)

قرآن کہتا ہے کہ پھراس کے بعد،تمہارے اپنے نظام کے تحت،ہوتا یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ لوٹ کھسوٹ کر کمالے،کسی طرح اکٹھا کرلے،وہ اسے اپنی ذاتی جائیداد سمجھ کر بیٹھ جاتا ہے۔اوروہ اتنے سارے لوگ جو اس کے ساتھ،اس کے ماتحت،اس کی زیرنگرانی یا اس کے تعاون سے کام کررہے تھے،یہ ایسا کبھی نہیں سوچتا کہ ان لوگوں کوبھی ان کی ضرورتوں کے مطابق دے دے۔وہ کمانے والا الٹا یہ کہتا ہے کہ اگر میں ان کوان کی ضرورتوں کے مطابق دے دوں تو یوں تو پھر یہ میرے برابر آجائیں گے۔گدھا گھوڑا ایک ہوجائینگے۔

''فھم فیہ سواء ''۔تو کیاان کو یکساں دے دیا جائے ؟اللہ کہتا ہے کہ وہ جوتمہارے پاس زیادہ ہے،اس کا ذرا تجزیہ کرو۔ یہ تنہا تمہارا نہیں ہے۔اس کی پیداوار میں تم سے زیادہ حصہ تو میرا تھا۔تم کارخانے ،فیکٹری سے الگ ہوکر کہیں جنگل وغیرہ میں بیٹھ جاؤ۔پھراس کے بعد بتاؤ کہ کیا تمہاری جمع پونجی اور بینک بیلنس اتنا ہی رہتا ہے جتنا اب ہے؟یہ جوسب تمہارے ساتھ تعاون کررہے تھے،تمہارا مال ان سب کی اورتمہاری اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔تم نے تنہا ہی زمین سے نوٹ نہیں نکال لئے۔

شہد کی مکھی مجبوراًایسا کرتی ہے۔انسان کواختیاراً کرنا ہوگا۔

ایک بنیادی فرق دونوں جگہ ہے۔کہ شہد کی مکھی مجبوراًیا جبلی طور پرایسا کرتی ہے،جبکہ انسان مجبوراً نہیں کرتا،اسے صحیح اورغلط کو منتخب کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔اگر یہ اپنے ارادے سے یہ نظام قائم کرے گا تو یہی قابلِ تحسین کام ہوگا۔یہ نظام اس ایمان کی بنیاد پہ چل سکتا ہے کہ:

سِرّاً وَجَهۡراً هَلۡ يَسۡتَوُۥنَ (سورہ النحل۔آیت 75)

جس میں وہ اپنے اختیار وارادے سے ظاہر اور پوشیدہ سب انسانی پرورش عامہ کے لیے وقف کر دے۔ کیا خیال ہے؟ یہ دونوں برابر ہو جائیں گے؟ ایک جبری طور پر محنت کرنے والا۔ اور ایک قرآن کے نظام کے تابع سرِ تسلیم خم کیے ہوئے محنت کرنے والا؟

گھر کا سربراہ جو محنت کرتا ہے، گھر واپس آتا ہے تو سب سے پہلے بچوں کی، بیمار یا بوڑھے والدین کی ضرورت پوری کرتا ہے، پھر اگر کچھ بچتا ہے تو آخر میں لیتا ہے۔ اور اس کے لیے کتنا خوش ہوتا ہے کہ میں نے ان کو کما کر کھلایا۔ وہ دوسرے دن مزید محنت کرتا ہے کہ میں اور زیادہ کماؤں، اپنے بچوں کی ذمہ داریوں سے مجھے ہی عہدہ برآ ہونا ہے۔ پھر وہ مزید جان مار کر محنت کرتا ہے۔ اوور ٹائم لگاتا ہے۔ صرف اپنے کنبہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے۔

بنی نوع انسان کے مسائل کا حل بھی اسی نظامِ حیات میں ہے۔

قارئین آپ نے دیکھا شہد کی مکھی کا یہ معاشی نظام کیسے چلتا ہے؟ اور کیسے مکھی کا یہ عمل قرآن کے پیش کردہ نظامِ معیشت کی تائید کرتا نظر آتا ہے؟ اس میں نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لیے۔

دوسری بات۔ قرآن نے خود اس نظام کو بنی نوع انسان کے لیے ''شفاء'' کہہ کر پکارا ہے۔ یہ نظام جو چھتے کے اندر نظر آتا ہے، اس میں انسانوں کے لیے شفا ہے۔ ان کے مسائل کا حل موجود ہے۔ سورہ النحل کو قرآن کے معاشی نظام کی وضاحت کے لیے ایک بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

وَشِفَاء لِّمَا فِي الصُّدُور (سورہ یونس۔آیت 57)

فِيهِ شِفَاء لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُون (سورہ النحل۔آیت 69)

اس میں انسانیت کے لیے شفا ہے۔ رہنمائی ہے۔

ہم نے تو سمجھ لیا کہ بس شہد کی بات ہو رہی ہے، شہد میں بیماریوں کا علاج ہے۔ نہیں۔ یہ جو پہلے ''فِيهِ شِفَاء لِلنَّاس'' اور پھر ''لآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُون'' کا ذکر کیا گیا ہے، یہ اسی حقیقت کا اعلان کرتا نظر آتا ہے کہ اس سورہ کے اندر پیش کردہ چھتے کے معاشی نظام میں نوع انسانی کی ہر بیماری کی شفا موجود ہے۔

دیگر حیوانات کا معاشی طرزِ عمل

صرف شہد کی مکھی پر ہی کیا محیط ،اس زمین کی ہر مخلوق قرآن کے معاشی نظام کو اپنائے ہوئے ہے۔ یہ ان سب کو فطری طور پر عطا کر دیا گیا ہے۔ چارہ کھاتی گائے بھینس اور بھیڑ بکری کو دیکھئے۔ وہ اطمینان سے چرتی جاتی ہے۔ پھر جب پیٹ بھر جاتا ہے تو سکون سے ایک جانب بیٹھ جاتی ہے۔ باقی بچا ہوا چارہ اگلے وقت کے لیے سمیٹنے کی کوشش نہیں کرتی۔ نہ ہی اپنی ضرورت پوری ہو جانے کے بعد (پیٹ بھر جانے پر) دوسری ساتھی کو چارہ کھانے سے روکتی ہے۔ خود ایک طرف ہو جاتی ہے۔ ہر جانور صرف اپنی بقدر ضرورت ہی لیتا ہے اور باقی دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی خوراک کو مرتکز نہیں کرتا۔ (کچھ چیونٹیاں وغیرہ البتہ خوراک ذخیرہ کرتی ہیں، مگر سائنسدانوں کی تحقیقات ومشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایسا محض عادتاً یا جبلی طور پر کرتی ہیں، نہ کہ کسی لالچ یا حرص کے تحت)۔

پرندے اپنی ضرورت کا دانہ دنکا چگ کر گھونسلے میں لے آتے ہیں۔ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی چڑیا نے اپنے گھونسلے میں دانوں کا ڈھیر لگا لیا ہو یا کسی شیر چیتے وغیرہ نے ایک ساتھ دو تین ہرن شکار کر ڈالے ہوں کہ چلو اگلا ایک مہینہ تو نکل جائے۔ تمام چرند پرند اپنی پوری صلاحیت سے محنت کرتے ہیں اور صرف بقدر ضرورت لے کر آتے ہیں۔ باقی کا وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ شکاری جانور صرف ایک شکار کرتے ہیں اور اتنا ہی کھاتے ہیں جس سے پیٹ بھر جائے۔ شیر کا پیٹ بھر جائے تو وہ اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ پاس سے گزرنے والے ہرنوں کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ شکار کے لیے صرف اسی وقت نکلتا ہے جب وہ بھوکا ہو۔

یہ ہے وہ کائنات جو خدا کی طرف سے ہدایت کردہ راستہ پر چلنے پر مجبور کر دی گئی ہے۔ انسان کے سوا تمام مخلوقات اپنے اپنے فرائض منصبی (وحی کے ذریعہ تفویض کردہ راستہ) پر کمال تندہی سے عمل کرتی جا رہی ہیں۔ اور یہی معاشی نظام انسان کی جانب بھی وحی کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو اختیار وارادہ حاصل ہے، اس لیے اس کی دنیا میں اس نظام پر عمل دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ اس سے سرکشی برتتا ہے۔ اور اسی لیے بھوک وافلاس کے عذاب میں مبتلا ہے۔ لیکن اللہ اس مقام پر ایک اور اعلان بھی کرتا ہے کہ:

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِی الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْعَلِیْمُ (سورہ الزخرف۔ آیت 84)

جیسے خارجی کائنات میں اللہ کا قانون نافذ العمل ہے، اسی طرح اس ارض پر بھی اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ العمل ہو کر رہے گا۔ یہ نظام بالآخر قائم ہو کر رہے گا۔ انسانیت مجبور ہو کر اسی جانب لوٹے گی۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

دنیا کی چالیس فیصد غریب آبادی دنیا کی صرف 5 فیصد پیداواری آمدن کی مالک ہے، اسکے برعکس 20 فیصد امیر ترین آبادی اس کرہ ارض کی تین چوتھائی پیداواری آمدن کی مالک ہے۔

2007 Human Development Report (HDR), United Nations Development Program,)
(November 27, 2007, p.25

Sources: The Hive and the Honey Bee by Roy A.Grout
www.beeman.ca
From Society to Genes with Honey bees (www.americanscientist.org)

Mohammad Hanif

اس ایک آیت مبارکہ کے من مانے ترجمہ کی بنیاد پر ، یہ غلط عقیدہ وضع کیا گیا کہ جناب قرآن لوگوں کو حکم دیتا ھے کہ کماؤ صلاحیت کے مطابق ــ اور خرچ کرو ضرورت کے مطابق ــــــــــــــــــ

مجھے پورے قرآن میں ایسی کوئی تعلیم نہیں ملتی ــــــــ

یہ تو ھیگل اور مارکس کا دیا ھوا نعرہ تھا ــــــــ

بد قسمتی سے اس دور کے ھمارے قابل قدر اکابرین ، اس نعرے سے اتنے زیادہ متاثر ھوئے کہ قرآن کریم سے اس نعرے کو ثابت کرنے کی دانستہ یا غیر دانستہ غلطی کے مرتکب ھوئے ــــــــ

میں اپنے سابقین کے حوالے سے حسن ظن کا قائل ھوں ــــ میں سمجھتا ھوں کہ ان سے اس ضمن میں سہو ھوا ھے ــــــــــ

Mohammad Hanif

نہ جانے ھمارے دوستو نے کس کا نام اسلام رکھ لیا ھے ــــ جو روزانہ ان کے کان میں آ کر ، کچھ بتا جاتا ھے ــ اور یہ دوست کہنے لگتے ھیں ـ اسلام یہ کہتا ھے ــ اسلام وہ کہتا ھے ــــــ

ورنہ اگر دین اسلام کے ساتھ یہ بات لگائی گئی ھے کہ " ھر شخص کمائے اپنی صلاحیت کے مطابق ، اور اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر ، باقی سب ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے "
تو میں ان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے اس دعوے کے حق میں کوئی آیت قرآنی پیش کریں ــــــــ

یہ تو ھیگل اور مارکس کا نعرہ تھا ــــــ کہ کماؤ صلاحیت کے مطابق ، خرچ کرو ضرورت کے مطابق ــــــــ سوشلزم کا نعرہ ــــ جسے غیر دانستہ طور پر ھمارے کچھ محترم سابقین نے قرآنی رنگ دینے کی کوشش کی ـ

12 قرآن کا معاشی نظام بالآخر قائم ہو کر رہے گا۔

قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اب تک کی تمام گفتگو، دلائل و براہین، شواہد، آثار اور اسکے عین مخالف ڈگر پر چلنے والے انسانی رویوں کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ایسا نظام کبھی قائم ہو بھی سکتا ہے؟ کیا انسان اتنے نیک دل بھی بن سکتے ہیں؟ اب تک کے تجربات تو بتاتے ہیں کہ شروع دن سے انبیاء کرام ایسا نظام لے کر آتے رہے، لیکن انسان اسے مسخ کر دیتا رہا۔ دین کو مذہب میں تبدیل کر کے اپنی من مانیوں کا سلسلہ جاری رکھتا رہا ہے۔ تو مستقبل میں پھر ایسا کیسے ممکن ہے کہ قرآن کا یہ معاشی نظام کبھی قائم ہو پائے۔ انسان اس قدر نیک سیرت بن جائیں۔ بظاہر ایسا ناممکن لگتا ہے اور کتابِ ہذا کے بھی بہت سے قارئین کے دل میں مایوسی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اس معاملہ پر بھی ہمیں قرآن ہی سے رہنمائی ملتی ہے۔ وہی بتاتا ہے کہ انسانیت کا مستقبل کیا ہوگا اور دین کا یہ عظیم نظام قائم ہو پائے گا یا انسانیت روز بروز ارتقاء کی بجائے تنزلی اور بدتری کی جانب بڑھتی جائیگی؟ خوش قسمتی سے قرآن ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ قرآن کا یہ معاشی نظام بالآخر ایک روز اس کرہ ارض پر پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہوگا۔ قرآن کو محفوظ بھی اسی لیے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اگر دین قائم نہیں ہو سکتا تو اس کی حفاظت کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

قرآن کا معاشی نظام: محض ایک حسین خواب یا زندہ اور قابلِ عمل حقیقت؟

یہ پوری کتاب قرآنی دلائل و براہین سے بھری پڑی ہے۔ کوئی شق ایسی نہیں جس کے اثبات کے لیے قرآن سے تسلی بخش دلائل پیش نہ کیے گئے ہوں۔ بہت سے لوگ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد بہت خوش ہونگے۔ انکے دلوں میں خدا، انبیاء کرامؑ اور آسمانی صحائف کا ایک نیا اور خوبصورت تصور جنم لے گا جو انکے دلوں میں قرآن کے لیے محبت میں بے پناہ اضافہ بھی کر دیگا۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ کیسے اللہ تعالیٰ واقعی رب العالمین ہے اور اللہ کی جانب سے تمام انسانوں کو رزق دیے جانے کا وعدہ کیسے پورا ہو سکتا ہے اور یہ کن کی ذمہ داری ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ یہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ ''نتیجہ'' اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ سب ایک حسین خواب (Utopia) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ ایسا معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا جس میں انسان اپنی

بجائے دوسروں کی فکر کرے۔ یہ کتاب لکھنے والا شیخ چلی بن کر ہوائی قلعے تعمیر کر رہا ہے، خیالی پلاؤ پکا رہا ہے۔ اسے زمینی حقائق سے کوئی شناسائی نہیں۔ ایک لاکھ چالیس ہزار انبیاء کرام اس زمین پر مصلحین بن کر آ چکے، ہزاروں لاکھوں جنگیں دین کے نام پر ہو چکیں، لیکن اس سب کے باوجود دین قائم نہ ہو سکا۔ اگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی خلافت کے دوران یہ دین قائم ہوا بھی تھا تو باقی نہ رہ پایا اور تیس چالیس سال بعد ہی اس کا دھڑن تختہ ہو گیا۔ تو اب تک کی انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس نے کبھی بھی وحی کی رہنمائی قبول نہیں کی اور سرکشی اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی من مانی روش پر ہی بضد رہا۔ اسی لیے جو نظام آج تک قائم نہ ہو پایا، وہ مستقبل میں بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ انسان اتنا نیک کبھی نہیں بن سکتا، اسکے اندر حرص و ہوس اور شح النفس ہمیشہ برقرار رہیں گے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان کی غلط فہمی ہے۔ انسان فطری طور پر برا اور بدکردار نہیں۔ دراصل اس کی تو کوئی فطرت ہی نہیں ہے۔ فطرت تو نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے جسے تبدیل کرنے پر انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ آم کا درخت ہمیشہ آم ہی اگائے گا اور سیب کا درخت صرف سیب پیدا کرے گا۔ شیر روزِ ازل سے گوشت ہی کھاتا آیا ہے اور ہمیشہ گوشت ہی کھائے گا، وہ کبھی بھی سبزی خور نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ہرن اور گائے بھینس کی خوراک بھی ہمیشہ چارہ اور بھوسہ ہی رہے گی۔ وہ کبھی گوشت نہیں کھا سکتیں۔ کوئل ایک ایسا پرندہ ہے جو اپنا گھونسلہ نہیں بناتا، بلکہ کوے کے گھونسلے میں انڈے دیتا ہے اور وہیں کوے کے بچوں کے ساتھ اس کے بچے پیدا ہو کر پرورش پاتے ہیں۔ چنانچہ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئل بھی اپنا گھونسلہ تعمیر کرے یا زہریلے حشرات الارض (سانپ، بچھو وغیرہ) ڈنگ مارنا چھوڑ دیں۔ یا شہد کی مکھیاں شہد بنانا چھوڑ دیں۔

ان سب کو بے اختیار پیدا کیا گیا ہے اور جس روشِ زندگی کی انہیں ہدایات (وحی) دی گئی ہیں، وہ اسی پر چلتے رہنے پر مجبور ہیں۔

اس کے برعکس انسان کو اول تو فطرت کے بغیر پیدا کیا گیا ہے یعنی اس کی پیدائش کے وقت اس کی ذات خام (Raw) حالت میں اسے عطا کی جاتی ہے جسے اس نے نشوونما دینا ہوتی ہے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کی درست تربیت کی جائے تو انسان ایک اچھا انسان بلکہ بہت اچھا انسان بن سکتا ہے۔ لیکن اگر ان صلاحیتوں کی غلط تعلیم و تربیت کی جائے تو وہ برا اور بدکردار انسان بن جاتا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ جہاں سارا ماحول ہی خراب ہوتا ہے۔ معاشی ناہمواریاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں جو ایک طبقہ کو امیر سے امیر تر اور

غریب کوغریب سے غریب تر کرتی جاتی ہیں ۔ایسی صورتحال میں خود سے بہتر لوگوں کی معاشی حالت دیکھ کر دل میں حرص و ہوس پیدا ہوتی ہے،راتوں رات امیر بننے کا شوق دل میں جگا کر انسان لا قانونیت اور جرائم کا ارتکاب کرنے کی جانب مائل ہوتا ہے۔اگر جرائم کی جانب نہ بھی آئے تو انفرادی مفاد پرستی ،سفاکیت، بے حسی اور اخلاقی برائیاں اس کی ذات میں ضرور سرائیت کر جاتی ہیں۔

ایسے ہی معاشرہ میں پیدا ہونے والے بچے بھی ماحول کا اثر لیتے ہیں اور انکی تربیت بھی انکے والدین (جو کہ خود ایسے معاشرہ کا ہی حصہ ہوتے ہیں)غلط خطوط پر کرتے ہیں۔اگر والدین اولاد کو اچھی تربیت بھی دیں تو بھی زمانہ ہر گزرتے پل کے ساتھ ساتھ ان پہ ضرور اپنے اثرات مرتب کرتا رہتا ہے۔اس قسم کے معاشرہ پر جب دو چار صدیاں گزر جاتی ہیں تو ظاہر ہے وراثت اور ماحول کے غلط اثرات کی وجہ سے اسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ہم اس قسم کے خودغرض اور بد ذہن انسان پیدا تو خود کرتے ہیں،لیکن خود بری الذمہ ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ بھئی چھوڑو۔انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔اگر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصوراتِ زندگی کے مطابق کریں،انہیں سکھائیں کہ انسان کی دنیاوی و اخروی کامیابی کا راز سب کچھ صرف اپنے لیے سمیٹتے جانے میں نہیں، بلکہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں ہے جہاں سب لوگ ایک دوسرے کے کام آرہے ہوتے ہیں۔دوسروں کو دینا ہی اصل زندگی ہے،اپنے بچوں کو دین کے روشن اور منطقی طور پر قابلِ تسلیم اور خوشگوار نتائج کے حامل نظام سے آگاہ کریں ،دو چار نسلوں تک ،دو چار صدیوں تک ایسی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں بھی اچھے اور نیک صفت انسان پیدا ہونے لگ جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قرآنی نظام کے قیام کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت کو انتہائی ضروری قرار دیا ہے۔جن افراد کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوتا ہے،انہیں اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے لیے تمام معاشرہ کی ذہنی فضا کو سازگار بناتے جانے کا حکم ہے۔اجتماعاتِ صلوٰۃ بھی اسی مقصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھے۔جوں جوں آنے والی نسلوں کا دل و دماغ قرآنی قالب میں ڈھلتا چلا جائیگا،اس نظام کو بتدریج آگے بڑھاتے جانا اور اپنی حتمی منزل پر پہنچا دینا بھی آسان ہوتا جائیگا۔

زمانہ قدیم کی نسبت زمانہ جدید قرآن کے معاشی نظام کے قیام کے لیے زیادہ سازگار ہے۔اور مستقبل میں مزید سازگار ہوتا چلا جائیگا۔

قرآنی نظامِ معیشت کے قیام کے سلسلہ میں آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور کی سب سے بڑی خوبی (Edge) یہ ہے کہ زمانہ قدیم کی نسبت آج کے دور میں ذرائع مواصلات(Telecommunication Technologies)،سماجی روابط کے ذرائع (Social Media:Facebook,Twitter etc) میں جدت کے ذریعہ پوری دنیا ایک گھرانہ (Global Village)بن چکی ہے جہاں دنیا بھر میں موجودلوگ،گروپ،جماعتیں،نظریاتی تنظیمیں وغیرہ سب ہمہ وقت باہمی رابطہ میں ہیں۔ایک خطہ میں سر اٹھانے والا ایشو لمحہ بھر میں دنیا کے کسی بھی خطہ میں پہنچ جاتا ہے۔ساری دنیا ایک دوسرے کے قریب آچکی ہے۔اور مستقبل میں جوں جوں سائنس اورانفارمیشن ٹیکنالوجی میں ترقی اور (Sophistication) میں اضافہ ہوتا جائیگا،توں توں دنیا مزید سمٹتی چلی جائیگی۔دنیا کے کسی بھی خطہ میں بیٹھ کر پوری دنیا کی یکساں تعلیم وتربیت اور ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنا آسان سے آسان تر ہوتا جائیگا۔

یہ سب سہولیات زمانہ قدیم میں میسر نہیں تھیں۔بین الاقوامی حالات سے ہر جگہ باخبری کا تصور بھی محال تھا۔حتیٰ کہ دوسرے شہر کوئی پیغام رسانی مقصود ہوتی تو قاصد کئی دنوں تک گھوڑوں اور خچروں پر سفر کر کے وہاں پہنچتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی کی وجہ سے حالات کو کنٹرول کرنا اور بین الاقوامی ہم آہنگی اور تعلیم وتربیت محض ایک خواب اور ناممکن امر تھا۔

اب آپ خود تصور کیجیے کہ کہ اگر ذرائع مواصلات ترقی یافتہ ہوتے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی آج جیسی ترقی یافتہ ہوتی تو کیا شہیدِ معصوم خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ اسلامی ریاست کے مختلف علاقوں میں عبد اللہ بن سبا یہودی کی جانب سے رچائے جانے والے ڈرامے (خلیفہ وقت کی کارکردگی کے متعلق افواہیں پھیلا کر لوگوں کو آمادہِ بغاوت کرنا) سے بے خبر ہی رہتے؟ کیا اس کا بروقت سدِ باب نہ ہوتا؟ اور دوسرے خطوں میں موجود لوگ مرکزِ ملت سے ہمہ وقت رابطہ کی بدولت حقائق سے باخبر رہتے اور ابن سبا کی سازش کو ناکام نہ بنا پاتے؟ کیوں سازشوں کا یہ لاوا پکتا رہتا اور مصر اور عراق سے باغیوں کے لشکر روانہ ہونے پر بھی مرکز میں خبر نہ ہو پاتی۔۔۔۔؟؟؟وجہ وہی تھی۔تیز تر ذرائع مواصلات اور تمام ریاستی اکائیوں سے Inter communication کی عدم موجودگی۔

پتا تب چلا جب باغیوں کو اکٹھا کرنے کے بعد بلوائیوں کا جتھہ سر پہ پہنچ گیا اور خلیفہِ معصوم کو شہید کر کے دم لیا۔اگر وہ دور بھی آج جیسا ترقی یافتہ ہوتا تو کبھی ایسا سانحہ پیش نہ آتا۔

اسی طرح اہل علم جانتے ہیں کہ عہدِ فاروقیؓ وعثمانیؓ میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو اسلامی ریاست کے زیر نگیں آنے والے دیگر ممالک تک قرآنی تعلیم وتربیت کی بروقت فراہمی اور لوگوں کو قرآنی دین سے آگاہ کرنے اور اس نظام کو ان ممالک تک پھیلانے کا سلسلہ انتہائی سست رفتار تھا۔ ہندو پاک سمیت بہت سے ممالک عرب افواج نے فتح تو کر لیے لیکن فتح کے کافی عرصہ بعد تک ان مفتوحہ علاقوں میں دین قرآنی کی اپنی حقیقی شکل میں اشاعت نہ کی جاسکی۔ اسلامی ریاست کی بڑھتی ہوئی وسعت لیکن ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی کی وجہ سے دین کی اشاعت بروقت ممکن نہ ہوسکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیشتر عجمی ممالک مثلاً ایران، مصر، عراق، بلوچستان، ہندوستان اور کئی افریقی ممالک میں نومسلموں کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر نہ لائی جاسکی اور انکی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہ ہو پایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں موجود مذہبی مفاد پرست عناصر نے اس چیز کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قدیم مذاہب کی ہی باطل تعلیمات کو کمال ہوشیاری سے داخلِ اسلام کر دیا اور اسی کو اسلام کا نام دے کر عوام الناس میں مروج کر دیا گیا۔ اور لوگ بھی نئے دین سے لاعلمی اور پرانے مذاہب اور رسوم ورواج سے فطری انسیت کی بناء پر گمراہ کن مذہبی پیشوائیت کا شکار ہوگئے اور نہ صرف خود گمراہ رہ گئے بلکہ انکی آنیوالی نسلیں بھی قرآن کے حقیقی دین سے برگشتہ ہی رہیں اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ مصر، عراق، ایران، ہندوستان، پاکستان اور افریقی مسلم ممالک میں آج اسلام کی جو تصویر ہمیں نظر آتی ہے، اسکا چودہ سو سال قبل رسول اللہ ﷺ پہ نازل ہونے والے دین سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ صرف ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی اور دورِ حاضر جیسی انفارمیشن ٹیکنالوجی ترقی کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اگر مرکزِ اسلامیہ مدینہ میں رہ کر دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اپنی وسیع سلطنت سے مسلسل رابطہ میں رہتا اور تیز تر ٹرانسپورٹیشن سسٹم کی بدولت ہر خطہ، ہر شہر اور دیہات تک میں دین کی اشاعت اور لوگوں کی قرآنی خطوط پر تعلیم وتربیت اور فکری ہم آہنگی اور اسکے استحکام کا انتظام کیا جاتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ آج تمام دنیا میں نہ صرف اسلام ایک ہی رنگ میں موجود ہوتا بلکہ فرقہ واریت کا قلع قمع بھی بہت حد تک آسان ہو جاتا۔ اگر آج کے دور میں سائنس وانفارمیشن ٹیکنالوجی میں ترقی کے باوجود لوگوں کی اکثریت دینِ قرآنی سے لاعلم ہے تو اس میں ہماری اپنی بدنیتی اور کمزوریاں ہیں۔ اور اسکی بڑی وجہ خود ہمارا اپنا ہی قرآن سے برگشتہ ہونا ہے۔ لیکن تصور کیجیے کہ قرونِ اولیٰ کی مقدس ہستیاں جو کامل الایمان اور دینِ اسلام سے حد درجہ مخلص تھیں، وہ صحابہ کرامؓ اور تابعین جو ایمان کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز تھے، انہیں یہ سب سہولیات میسر ہوتیں تو وہ ان کا کس قدر

بھرپور استعمال کرتے ہوئے تمام دنیا کو قرآنی رنگ میں رنگ دیتے۔

اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک بار حضرت عباسؓ سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ جیسے مدینہ میں لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے اور رزق کی تقسیم کی ذمہ داری میں پوری کر رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ دوسرے مفتوحہ ممالک میں بھی یہ سلسلہِ ربوبیت جلد شروع کروں۔ اگر میں زندہ رہا تو (مدینہ تو ایک طرف) عراق و مصر تک کی بیوہ اور بے سہارا عورتوں کو ایسا بنا دوں گا کہ وہ میرے بعد کسی کی محتاج نہ رہیں گی۔

کفالت کے سلسلہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ:

"قلمرو خلافت میں بلا تخصیص مذہب و ملت، ہر تنگ دست کی امداد کی جائے۔ ہر مقروض کا قرض ادا کیا جائے۔ ہر کمزور، ضعیف اور مظلوم کی اعانت کی جائے۔ ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔ ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے"۔ یعنی کوئی ضرورتمند ایسا نہ رہ جائے جس کی ضرورت حکومت کی جانب سے پوری نہ کی جائے۔

اب عہدِ فاروقیؓ ہر محتاج اور نادار شخص کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنی محتاجی اور کسمپرسی کی اطلاع خود خلیفہ تک پہنچائیں۔ بلکہ خلیفہ وقت کا فرض تھا کہ وہ خود رعایا کے ہر فرد کی ضروریات سے باخبر رہے اور انہیں از خود پورا کرے۔ اس سلسلہ میں آپؓ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جو محتاج آپ تک پہنچ جاتا، اس کی ضروریات کو پورا کرنا آپ کسی اور پر نہ چھوڑتے۔ اس سلسلہ میں بے شمار واقعات ہمیں تاریخ میں نظر آتے ہیں جن سے اس دور کی قرآنی حکومت کا ایک ماں کا کردار نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

قارئین اب آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ ایک وہ دور تھا جب ذرائع مواصلات پسماندہ تھے اور لوگ خلیفہ وقت تک بروقت اپنی فریاد نہ پہنچا پاتے تھے، لیکن اس دور میں بھی معاشی صورتحال بہت بہتر تھی اور ریاست میں کوئی بھوکا نہیں مرتا تھا۔ اور ایک آج کا دور ہے کہ سائنس و انفارمیشن ٹیکنالوجی انتہائی ترقی یافتہ ہے۔ ہر روز میڈیا پر لوگ بھوک سے مرتے، خودکشیاں کرتے دکھائے جاتے ہیں، حکمران یہ سب کچھ دیکھتے ہیں، لیکن کسی کے سر پہ جوں تک نہیں رینگتی۔ اسلامی حکومت کی طرف سے لوگوں کو رزق کی فراہمی جیسے عظیم فریضہ کو تو یہ کیا سمجھیں گے، یہاں تو انسانی ہمدردی کے عام جذبات بھی ان بے حسوں میں پیدا نہیں ہو پاتے۔

اسی طرح جب ہم انبیاء کرام کی آمد اور انکی وفات کے بعد دین کو مذہب میں بدل دینے جیسی سازشوں کا تواتر سے وقوع پذیر ہونا دیکھتے ہیں تو تب بھی ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی (Communication Gap) ہی اسکا بنیادی سبب نظر آتی ہے۔ اگر اس دور میں ایسے تیز تر کمونیکیشن ذرائع اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا وجود ہوتا اور قرآنی تعلیمات اور نظامِ دین کو اسکی حقیقی شکل میں اسلامی ریاست کے چپے چپے تک پہنچا دیا جاتا، لوگوں کو جدید ترین ذرائع مواصلات سے تعلیم و تربیت دی جاتی تو میں نہیں سمجھتا کہ دینِ قرآنی کو مسخ کرنے کی کوئی بھی ایرانی یا یہودی کوشش کبھی کامیاب ہو پاتی۔ سازشیں اور فتنے ہمیشہ وہیں سر اٹھاتے ہیں جہاں لوگوں کے درمیان (Inter-communication) موجود نہیں ہوتا۔ لوگوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی۔ لوگوں تک دین کو حقیقی شکل میں پہنچایا نہیں جاتا اور وہ پھر سازشوں اور مفاد پرستوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

ایک حقیقی مثال سے اپنے اس موقف کو تقویت دینا چاہوں گا۔ یہ جو عہدِ عثمانی میں یمن کا عبداللہ بن سبا یہودی جو مصر اور عراق میں جگہ جگہ پھر کر مجالس برپا کرتا اور لوگوں کو خلیفہ وقت کے متعلق جھوٹ بول بول کر گمراہ کرتا رہتا تھا، اور ساتھ حضرت علیؓ کی شان میں بھی کفریہ انداز میں مبالغہ آرائی میں مصروف عمل تھا۔ اگر وہاں کے لوگ قرآن کے حقیقی دین سے بروقت روشناس کرادئے گئے ہوتے، انکی تعلیم و تربیت بھی ایسی کر دی جاتی جیسی صحابہ کرامؓ کی رسول اللہ ﷺ نے کی تھی تو کیا وہ لوگ اتنی آسانی سے ابنِ سبا کی سازشوں کا شکار ہو کر خلیفہ کے خلاف بغاوت پر اتر آتے؟ ایسا کیوں ہوا؟ وجہ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے Communication Gap۔ ان لوگوں تک قرآنی فلسفہ حیات بروقت پہنچایا ہی نہیں جا سکا۔ ان لوگوں تک پہنچا تو اسلام کا صرف نام۔ قرآن کے صرف اوراق۔ اور اللہ کا تصور محض ایک مطلق العنان اور مستبد حاکم کے طور پر۔ جو انکے قدیم مذاہب میں پہلے ہی موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں موجود مذہبی پیشوائیت اور مفاد پرست عناصر کے گٹھ جوڑ نے قرآن کا زندہ دین لوگوں تک پہنچنے سے روکنے کے لیے اپنے قدیم باطل عقائد کو ہی اسلام کا لیبل لگا کر لوگوں کو پیش کرنا شروع کر دیا اور اکثریت اسی کو اسلام سمجھ کر اس پہ عمل پیرا ہو گئی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں تو جدید ٹیکنالوجیز، کمیونیکیشن ذرائع، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انفارمیشن سپر ہائی وے (انٹرنیٹ) موجود ہے اور ہر تیسرے چوتھے شخص کی پہنچ میں ہے۔ تو آج پھر کیوں ایسا نظام قائم نہیں ہو پا رہا؟

وجہ اسکی پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی اب یہ سب سہولتیں تو میسر ہیں، لیکن لوگ خود اس کے لیے تیار نہیں۔ قرونِ اولیٰ

میں یہ سہولتیں میسر نہیں تھیں، لیکن اس دور کے مسلمانوں میں دینِ حقیقی کی سمجھ بوجھ اور اسکی اشاعت کا جذبہ نظر آتا تھا۔ اگر ہم لوگوں میں بھی عہدِ صحابہؓ اور تابعین کی طرح قرآن کریم کے نظامِ حیات خصوصاً معاشی نظامِ ربوبیت کی سمجھ بوجھ پیدا ہوجائے اور لوگ فرقہ واریت کو ترک کر کے دین کی سربلندی کی خاطر اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ صرف چند سالوں میں ہی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعہ دنیا بھر میں لوگوں کی تعلیم وتربیت قرآنی خطوط پہ کر کے اور ان میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کر کے ایک بھرپور قرآنی انقلاب برپا کر دیا جائے۔ آج کے دور میں تو یہ کام بہت آسان ہے۔ کیونکہ آج آپ کے پاس اپنا پیغام چند ساعتوں میں دنیا بھر میں پہنچانے کے لیے جدید ترین سہولیات میسر ہیں۔ ضرورت صرف اپنی جدوجہد اور مساعی کی گاڑی کو درست شاہراہ پہ ڈالنے کی ہے۔ جس سے یہ قرآنی نظام کے قیام کی منزل تک پہنچ سکے۔

آج اگرچہ بہت سے لوگ جو فکرِ قرآنی سے وابستہ ہیں اور دین کی اشاعت اور سربلندی کے لیے کوششیں کر رہے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے اور خود انکی اپنی تعلیم وتربیت اور انکی کوششوں کو بھی درست سمت میں چلانے کی اشد ضرورت ہے۔ ان میں بھی باہمی ذہنی ہم آہنگی کا فقدان ہے جسکی وجہ سے وہ ذاتی مفادات پرستیوں کے تحت کام کرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ ان میں ایسے ہیں جنہیں قرآنی نظام قائم کرنے کی بہت ''جلدی'' ہے اور وہ سیاسی جماعتیں تشکیل دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنے باب ششم میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ قرآنی نظام کی جانب سفر کے سلسلہ میں ہم اس وقت ایک عبوری دور میں موجود ہیں جہاں قرآن ہمیں کہتا ہے کہ سب سے پہلے لوگوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرو۔ یعنی وہ ایک ہی زاویہ میں سوچیں، ایک ہی نقطہ نظر کے حامل نظر آئیں۔ اور اس مقصد کے لیے انکی ذہنی تربیت اور تعلیم وتدریس کا انتظام کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اگر آپ لوگوں کی تعلیم وتربیت اور ان میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کیے بغیر سیاسی پارٹیاں بنا کر انہیں قرآنی نظام کی جانب لیجانے کی کوشش کریں گے تو اس سے کسی قسم کا مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور آپ کی مساعی کا بھی وہی حشر ہوگا جو سوشلزم کا روس میں ہوا تھا۔ اسی لیے موجودہ دور میں سب سے اہم ترین چیلنج جو ہمیں درپیش ہے، وہ لوگوں کو فرقہ واریت سے موڑ کر انکی تعلیم وتربیت کو قرآنی خطوط پہ کرنا، انکے زاویہ نگاہ کو قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار پہ مرکوز کرنا۔ انہیں انکی ذات اور اسکے مقاصد سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کے معاشی نظام پہ عمل کے اس دنیا میں خوشگوار مادی نتائج اور آخرت میں شاندار ارتقائی نتائج دکھا کر انہیں قرآنی نظام کے لیے جدوجہد کرنے کا جذبہ محرکہ عطا کرنا اور پھر اس جذبہ کی مختلف انداز میں نگہداشت کرتے جانا ہے۔ دورِ حاضر میں ہمارے کرنے کا کام تو صرف یہی

ہے۔اب یہ مقصد کب پورا ہوگا، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ہمیں تو ابھی لوگوں کو قرآنی سانچے میں ڈھالتے چلے جانا ہے۔جب مستقبل میں کبھی ایسا ہوگیا تو ایسے کامل الایمان لوگ خود ہی قرآنی نظام قائم کرلیں گے۔کیونکہ یہ تو خدا کا وعدہ ہے کہ قرآن کا یہ دین ایک روز ضرور قائم ہوکر رہے گا۔ملاحظہ کیجیے اس سلسلہ میں کچھ قرآنی دلائل:

قرآن کہتا ہے کہ اس جہاں میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور اس تصادم میں آخرالامر باطل شکست کھا جائیگا۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ

(سورہ الانبیاء۔آیت 18)

ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں۔حتیٰ کہ حق باطل کا بھیجہ نکال کر رکھ دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں، تو ان کے حصہ میں تباہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔کیونکہ وہ حق کے غلبہ کا تصور نہیں رکھتے۔

پھر فرمایا کہ: مفاد پرست گروہ باطل کو غالب رکھنے کے لیے کوششیں کرتے رہتے ہیں:

وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُو

(سورہ الکہف۔آیت 56)

اور جو لوگ حق سے انکار کریت ہیں، وہ باطل کے حیلوں سے حق کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں۔تاکہ اس طرح حق کو مغلوب کردیا جائے۔

لیکن حق پرست جماعتیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں اتر آتی ہیں:

يُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (سورہ الانفال۔آیت 8)

تاکہ حق ثابت ہوجائے اور باطل کا ابطال۔خواہ ایسا ہونا ان لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو قانون شکنی میں ہی اپنا مفاد مضمر سمجھتے ہیں۔

لیکن حق کی حمایت کے لیے انسانوں کی کوئی بھی جماعت نہ بھی اٹھے تو بھی آخرالامر حق غالب آکر رہتا ہے۔اگرچہ اس میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ إِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (سورہ الشوریٰ۔آیت 24)

اللہ خود اپنے قوانین کے زور سے باطل کو محو اور حق کو محکم اور استوار کیے جاتا ہے۔

یہ نکتہ تھوڑا سا وضاحت طلب ہے۔ دیکھئے انسانی عمل کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر اس کے مطابق کام شروع کرے۔ اس سے حق کی جانب سفر جلد طے ہو جائیگا اور اس کا متوقع نتیجہ بھی سامنے آ جائیگا۔ اور پھر جب نتائج سامنے نظر آئیں گے تو انسان واقعی اس کی صداقت کا معترف ہو جائیگا۔

لیکن دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی قانون یا نظریہ کو تسلیم نہ کرے بلکہ اپنے اندازوں اور خود ساختہ نظریات کی رو میں بہہ کر سفر شروع کرے۔ انسان کے اندازوں کے نتائج کا اسے قبل از وقت پتا نہیں چلاتا۔ قرآن نے تو اپنے پروگرام کے نتائج اس پہ عمل سے قبل ہی انسان کو بتا دیے ہیں کہ ایسے کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا۔ یوں کرو گے تو یہ ہوگا۔ لیکن انسان جب اپنے خود ساختہ نظریات اور قیاسات پہ عمل شروع کرتا ہے تو عمل سے قبل اسے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اس کے پروگرام کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ انسانی قوانین کے نتائج عمل درآمد کے بعد ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ ان قوانین کا اسلوب تجرباتی (Cause and Effect)، بلکہ اکثر (Trial and error) ہوتا ہے۔ یہ ایک نظام صدیوں تک اپنائے رکھتا ہے اور پھر صدیوں کے تجربات سے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ نظام غلط تھا۔ یہ راستہ درست نہیں تھا۔ وہ پھر اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس طرح صدیوں پہ محیط سینکڑوں تجربات، مشقتوں اور جدوجہد کے بعد کہیں جا کر انسان حقیقت تک پہنچا پاتا ہے کہ درست راہ کیا تھی۔

اسکے برعکس اگر انسان وحی کی روشنی میں اپنے قوانین اخذ کرے اور اسی کی رہنمائی میں اپنے سفر کا آغاز کرے تو وہ راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور سفر بھی جلد طے ہونے کی سبیل نکلتی ہے۔ وہ عقل کے تجرباتی طریقہ کار کے تحت ٹھوکریں کھا کھا کر حق پہ نہیں پہنچتا بلکہ وحی کی رہنمائی اسے ایک ہی جست میں باطل پہ فتح عطا کر دیتی ہے اور درست راستہ بتلا بھی دیتی ہے اور اس کے نتائج بھی سامنے لے آتی ہے۔ اگر یہ پرکھنا ہو کہ حق کیا ہے؟ کس جانب ہے؟ کس چیز کا نام ہے تو قرآن نے ایک سیدھا سا معیار عطا کر دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (سورہ الرعد۔آیت 17)

وہی نظریہ حیات یا وہی نظام زمین پر باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسانی کے لیے منفعت کا باعث ہو۔

آگے اللہ کہتا ہے کہ مفاد پرست انسانوں کی کوششیں اس اصول کو ناکام بنانے کے لیے ہر دم کی جاتی ہیں، مگر رب کا پروگرام اسے کامیاب بنا کر چھوڑتا ہے۔

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِؤُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ

(سورہ التوبہ۔آیت 32)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نورِ خداوندی کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔لیکن خدا کی مشیت انکی اس کوشش کو بارآور نہیں ہونے دیگی۔یہ نور اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہے گا خواہ مفاد پرست گروہوں کے لیے وہ کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔

یہی وہ نظامِ زندگی ہے جو ہر باطل نظام پہ ایک روز غالب آ کر رہے گا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (سورہ التوبہ۔آیت 33)

خدا نے اپنے رسولوں کو صحیح منزل کی جانب رہنمائی دے کر بھیجا ہے۔یعنی ایک مبنی برحق نظام حیات دے کر۔یہ نظام دنیا کے ہر نظام پہ غالب آ کر رہے گا خواہ یہ بات ان لوگوں کے لیے کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو جو خالص قوانین الٰہیہ کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔اور پھر کیا ہوگا: سنئے:

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (سورہ الزمر۔آیت 69)

یہ کرہ ارض اپنے پالنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔(انشا اللہ)

باطل ہمیشہ کے لیے مٹ جائیگا اور ہر جانب صرف اللہ تعالیٰ کا دین ہوگا اور اسی کا نام قیامتِ دین ہے۔

انسانی ذات کے تصور کی آگاہی اور قرآنی نظامِ معیشت کا قیام ریاست سے جرائم اور لاقانونیت کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

جرائم کی ایک بڑی اور فطری معاشرہ میں دولت کی کشمکش، امیر غریب کی وسیع تر خلیج اور معاشی ناہمواریاں اور زیادتیاں ہوتی ہے۔روٹی کی فکر اور روزگار کی پریشانی ہی انسان کو قانون شکنی اور جرم کے ارتکاب پہ مجبور کرتی ہے۔اگر انسانوں کو معاش کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ذہن جرائم کے ارتکاب کی جانب مائل ہی نہ ہوں۔ممکن ہے کہ آغاز میں ایسا مکمل طور پہ ممکن نہ ہو، لیکن جوں جوں آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت اور انکے ذہنوں کو قرآنی خطوط پہ استوار کرتے چلے جائیں گے اور وہ انسانی ذات کے تصور اور اسکی نشوونما کے اصولوں سے آگاہ ہوتے جائیں گے، ساتھ معاشی بے فکری ہوگی ہوں توں ان کے ذہن صاف اور رویے نیک ہوتے جائیں گے۔اور جرائم آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جائیں

گے ۔اور پورا معاشرہ جنت ارضی کا تصور پیش کرنے لگے گا۔کسی کو جرم کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ جہاں تک زنا ،چھیڑ خوانی جیسے غیر معاشی جرائم کا تعلق ہے،تو لوگ اپنی ذات اوراسکے استحکام کواس قدر ترجیح دیں گے کہ ایسے جرائم کا خیال تک بھی انکے ذہن میں نہ آئے گا۔یعنی سوچیں بلنداور رویے مددگار ہوجائیں گے۔

یہ سب احوال میں ایک مکمل قرآنی نظامِ دین اورریاست کا بتارہاہوں جہاں دین مکمل شکل میں قائم ہو چکاہوگا۔ایسا اگر چہ دیر سے ہوگا،لیکن ہوگا ضرور۔اسکے برعکس دنیا میں بہت سی ایسی فلاحی ریاستوں کا وجود بھی ہے جو اپنے عوام کوکافی حد تک معاشی فکر سے آزادرکھے ہوئے ہیں،مثلامغربی مما لک جیسے ڈنمارک ،ناروے،سویڈن،سوئیٹزرلینڈ وغیرہ۔لیکن وہاں بھی جرائم موجود ہیں۔مثال کےطور پرسویڈن جیسےایک مثالی فلاحی ملک میں خودکشی کےواقعات بہت زیادہ رونما ہوتے ہیں۔اسکی وجہ یہ نہیں کہ لوگوں کومعاشی فکر سے آزادکرنا بھی جرائم کے خاتمہ میں مددگار ثابت نہیں ہو پاتا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا تصورِ حیات زیادہ تر مادیت پرستی پرمبنی ہے۔ان کے سامنے حیات بعدالموت کا تصورموجودنہیں۔وہ اس مادی زندگی کوہی زندگی سمجھتے ہیں۔اگرانہیں انسان کی حیات بعدالموت اورانسانی ذات کےتصوراوراسکی نشوونما کے اصولوں سے متعارف کروایا جائے اورخالص وحی کی رہنمائی میں اپنی زندگی گزارنے کا درس دیا جائےتو کوئی وجہ نہیں کہ وہ لوگ مادیت پرستی کے منفی اثرات کا شکارہونے سے بچ جائیں اور یہ چیز وہاں جرائم کی شرح کم اور بالاخرختم کرنے میں بھی حیران کن طورپر مدد دے سکتی ہے۔کیونکہ وہاں عقل وشعور کے استعمال کا رجحان اسلامی مما لک کی نسبت بہت زیادہ ہے۔وہ لوگ ان حقیقتوں کو جلد پالیں گے۔ضرورت صرف اس امرکی ہے کہ یہ حقائق ان تک موثر انداز میں پہنچائے جائیں۔

دنیا آہستہ آہستہ قرآن کی جانب آرہی ہے۔

انسانی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔آپ پہ یہ حقیقت آشکارہوگی کہ دنیا نے اپنے صدیوں کے ناکام تجربات کے بعد آہستہ آہستہ قرآنی قوانین کواپنانا شروع کردیا ہے۔اوراایسابےاختیارہورہا ہے۔اگر چہ دنیا تا حال مکمل طورپہ اس منزل پہ نہیں پہنچ پائی جس کاتعین قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کیا تھا،لیکن اس کا ہرنیا قدم قدیم شہنشائیت،ملوکیت،اورانسانی غلامی کوتوڑکراجتماعیت، شورائیت اورانسانی فلاح وبہبود پہ مبنی نظام کی جانب بڑھتا جارہا ہے۔

قرآن نے انسان کو بتایا تھا کہ مذہبی پیشوائیت نامی طبقہ باطل کی بنیادوں پہ قائم ہوتا ہے۔یہ مفاد پرستوں کا ٹولہ ہوتا ہے ۔خدااوربندے کے درمیان کسی تیسرے واسطے کی ضرورت نہیں،یہ جوخدااورانسان کے درمیان وسیلہ بنے پھرتے ہیں،یہ

سب باطل ہیں۔قدیم اور جدید دور کا موازنہ کیجیے اور دیکھیئے کہ کیسے آج دنیا سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ عمل میں آرہا ہے۔مغرب نے اسے گرجا گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا ہے۔اور عنقریب وہاں سے بھی ان کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیگا،البتہ اسلامی ممالک میں ابھی مذہبی پیشوائیت زوروں پہ ہے لیکن لوگ آہستہ آہستہ یہاں بھی ان کے اثر سے آزاد ہورہے ہیں۔

قرآن نے کہا تھا کہ غلامی انسانیت کے ماتھے پہ ایک بدنما داغ ہے۔اللہ نے ہر فرزندِ آدم کو ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ہر انسان واجب التکریم ہے۔''ولقد کرمنا بنی آدم''۔دیکھئے دنیا نے کس طرح غلامی کو ایک لعنت قرار دے کر تقریباً مٹا دیا ہے۔

قرآن نے کہا تھا کہ رنگ و نسل،زبان اور قومیت پرستی ایک باطل تقسیم وتفریق ہے۔تمام نوع انسانی ایک عالمگیر برادری (Global Village) ہے۔ساری دنیا کے انسان امتِ واحدہ ہیں۔آپ دیکھیں کیسے کیسے دنیا اس تصور کو اپنانے کی فکر کررہی ہے۔آج دنیا واقعی ایک گلوبل ویلیج بنتی جارہی ہے۔یہ اقوامِ متحدہ کا قیام قرآن ہی کے دیئے ہوئے کعبہ اللہ کے تصورِ مرکزیتِ انسانی کا مرہونِ منت ہے۔ہم تو اسے قائم نہ کر سکے،غیروں نے قائم کر کے دکھادیا۔

یہ سب کچھ اللہ کے کائناتی قوانین کی رو سے خود بخود ہوتا چلا جارہا ہے۔یہی وہ قانون ہے جسے اللہ سنت اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔یہی وہ قانون ہے جو فیصلہ کرتا ہے کہ دنیا میں کونسا نظریہ یا تصور باقی رہے گا اور کونسا نہیں۔یہ قانون بتدریج ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جس سے تخریبی اور منفی نتائج کے حامل تصورات،نظریات و نظام ہائے مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ تعمیری،مثبت اور انسانی فلاح و بہبود پہ مبنی نظریات وتصورات آتے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے اس عمل کو''حق کی جانب سے باطل پہ ضربیں لگانا اور اسکی جگہ لے لینا'' کہا جاتا ہے۔یعنی ابطالِ باطل اور احقاقِ حق:

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (سورہ الانفال۔آیت 8)

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ

(سورہ الانبیاء۔آیت 18)

کیا آپ جانتے ہیں؟

وہ خطے جہاں بدترین غربت مسلط ہے۔

ایشیا:578ملین۔۔۔افریقہ(سب صحارا ریجن):239ملین۔۔۔لاطینی امریکہ اور جزائر غرب الہند:53ملین

شمالی وجنوبی افریقہ:37ملین۔۔۔ترقی یافتہ صنعتی ممالک:19ملین

FAO FAQ ON HUNGER 2011

13 ایک اور قارون قرآن کے نام پر قرآن دشمنی

میں اپنی اس کتاب کے اختتام کی جانب بڑھ رہا ہوں ۔گزشتہ ابواب میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ کیسے کیسے خالقِ کائنات انسانیت کے لیے ایک انتہائی متوازن فلاحی نظام انبیاء کرام کے ذریعے بھیجتا رہا تا کہ اس کرہ ارض پر بنی نوع انسان میں رزق کی مساوی تقسیم کی جائے (تا کہ وہ معاشی فکر سے آزاد ہوکر اپنی اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال سے اس دنیا کے حسن ورعنائیوں میں اضافہ اور بنی نوع انسان کی منفعت کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کرسکیں تا کہ ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے جو تخلیقِ آدم کا حقیقی مقصد اور انسان کی حیاتِ جاوداں کے ناگزیر ہے)،اور کیسے ہر دور میں مفاد پرست اور انسانیت کش عناصر ان انبیاء کرامؑ کے مدمقابل آتے رہے۔انکی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے،اور انبیاء کرام کی وفات کے بعد ان کے دین کو مسخ کر کے مذہب میں تبدیل کر دیتے تا کہ لوگوں کو خود ساختہ پوجا پاٹ پر لگا کر خود اپنی لوٹ مار اور استحصال کا سلسلہ جاری رکھیں ۔اصلی فلاحی نظامِ حیات کو انسانیت کی نگاہوں سے اوجھل کر کے خود ساختہ اور فرضی پوجا پاٹ کو ہی دین قرار دے دیں ۔لوگوں کو ''اللہ'' سے رزق مانگنے پر لگا دیا جائے اور خود ساری دنیا کے وسائل یاجوج ماجوج کی طرح ہڑپ کرتے جائیں ۔انسانیت کو ''آخرت'' بہتر بنانے کا لالی پاپ تھما دیا جائے اور خود اپنی دنیا شاندار اور Luxurious بنالی جائے ۔دوسروں کو ''نجات'' اور مرنے کے بعد کی جنت کی آس پر لگا دیا جائے اور خود سارے وسائل ہڑپ کر کے اس دنیا کو اپنے لیے جنت بنایا جائے ۔انسانیت کو اس کے حقوق سے محروم کرنے کا ذمہ دار بلکہ مجرم کون ہے؟ وہی پرانے کردار جو روز ازل سے اس دنیا کے سٹیج پر اپنا بھیانک رول ادا کرتے آئے ہیں ۔یعنی ملوکیت ،مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داریت ۔

انبیاء کرام کا ایسے مفاد پرست عناصر سے ہمیشہ سامنا رہا اور یہ مسلسل صحائفِ آسمانی کو مٹاتے رہے کہ کہیں انسانیت اس دین کو سمجھ نہ لے،ورنہ انکی مفاد پرستیاں ختم ہو جائیں گی ۔اللہ بھی فلاحی نظام پہ مشتمل ہدایات مسلسل بھیجتا رہا۔حتیٰ کہ انسان کے کرتوت دیکھتے ہوئے اس نے اس آخری کتاب کو پہلے تو مکمل دین کہہ کر نازل کیا۔اور پھر اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیتے ہوئے ان مفاد پرست عناصر کو ایک زبردست چیلنج دے دیا کہ لو اب ذرا میری بھیجی ہوئی کتاب کو مٹا کر دکھاؤ۔

سلسلہ انبیاء کرام ختم ہونے کے بعد بھی انسانیت کے بہت سے خیر خواہ پیدا ہوتے رہے جو اگر چہ نبی تو نہیں تھے، لیکن انہوں نے انسانیت کو وحی الٰہی کی روشنی میں راہ راست پہ لانے کی کوشش کی۔ چنانچہ حسب معمول انکا سامنا بھی مفاد پرستوں سے ہوتا رہا اور انکی مخالفت میں بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے رہے۔ لیکن قرآن کے دشمن قرآن کی تعلیم کو پھیلنے سے روکنے میں ہمیشہ ناکام ہی رہے۔

ہم لوگ بھی قرآنی نظام کی اشاعت کے لیے اپنی زندگیاں وقت کیے ہوئے ہیں اور ہمارا سامنا بھی مفاد پرستوں سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ اکثر تو روایتی فرقہ پرست ہوتے ہیں جو اپنے اسلاف کی جانب سے مقرر کردہ Paradigm سے بالاتر ہو کر کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتے۔ انکی روش کنویں کے مینڈکوں کی سی ہے۔ یہ وہ چمگادڑیں اور الو ہیں جو اندھیروں کے عادی ہیں۔ روشنی انکے مفاد میں نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر باشعور اور باکردار نظر آتے ہیں، کافی حد تک حقائق پرست ہوتے ہیں۔ لیکن انکی ذاتی مفاد پرستیوں کا اندھیرا ختم نورِ قرآنی میسر آجانے کے بعد بھی نہیں چھٹ پاتا۔ قرآن کی تعلیم انکے اندر ذات کی نشو ونما مناسب حد تک نہیں کرتی اور یہ لوگ اپنی عقل کو وحی کے تابع رکھنے کی بجائے الٹا وحی کو اپنی عقل اور مفادات کے تابع کرنے کی کوششیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگ اکثر اعلیٰ اخلاقیات کا سہارا لے کر پہلے لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتے ہیں، پھر اپنے باطل نظریات کو قرآن کا لبادہ اوڑھا کر پیش کرتے اور دوسروں کو Sugar Coated زہر دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ اول الذکر لوگوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

کتابِ ہٰذا کا آخری باب ایک ایسے شخص کے نام کیے دیتا ہوں جو قرآن کے معاشی نظام کے معاملہ پر میرے مدمقابل آچکا ہے اور جسکے باطل سرمایہ دارانہ نظریات نے مجھے مجبور کیا کہ میں مکمل قرآنی دلائل پر مشتمل یہ کتاب تحریر کروں جس میں اسکے اعتقادات ونظریات کا بھرپور قرآنی جواب دیا جائے تاکہ عوام الناس گمراہ نہ ہونے پائیں اور سرمایہ داریت و جاگیرداریت کے استحصالی نظام کے ہاتھوں مسلسل پستی ہوئی انسانیت کے زخموں پر بہترین مرہم رکھا جائے اور انہیں درست انقلابی راہ پہ گامزن کیا جا سکے۔ کہ آج انسانیت کو قرآن کے معاشی نظام کی سخت ضرورت ہے۔

کچھ ماہ قبل فیس بک پر محمد حنیف نامی ایک شخصیت سے سامنا ہوا اور مختلف موضوعات پر ان کے نظریات جاننے کا موقع ملا۔ موصوف کراچی کے رہائشی ہیں اور اسلام کے حوالہ سے ان کا مطالعہ کافی وسیع ہے جس کا اندازہ فیس بک پر ان کی سرگرمیوں

سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ان کی ایک سب سے بڑی خوبی جوان سے پہلی ملاقات ہی میں نظر آ جاتی ہے،ان کا حسنِ اخلاق ہے جس کا مظاہرہ فیس بک پر یہ ہر حامی ومخالف سے کرتے نظر آتے ہیں (اورضرور اپنی عملی زندگی میں بھی دوسروں سے ایسے ہی پیش آتے ہونگے)۔ان کے ساتھ کوئی کتنی ہی بدتمیزی کیوں نہ کر رہا ہو، یہ اینٹ کا جواب پتھر سے ہرگز نہیں دیتے۔ بلکہ جواب میں نہایت تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مخاطب پر اپنے حسین اندازِ گفتگو کا ایسا تاثر چھوڑتے ہیں کہ مخاطب بے ساختہ طور پہ انکو داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔پھر ان کی گفتگو بھی فصاحت و بلاغت کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ دلائل سے بھرپور ہوتی ہے۔

یہ ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہیں۔دینی نکتہ نظر سے یہ روایتی فرقہ پرست اور Rigid شخص نہیں بلکہ حاملِ فکرِ قرآنی اور روایتی مذہب پرستانہ سوچ کے مخالف ہیں۔میں بشمول دیگر احبابِ فکرِ قرآنی بہت سے نظریاتِ قرآن میں ان سے متفق بھی ہوں۔البتہ ایک معاملہ ایسا ہے جہاں حنیف صاحب قرآن کی مخالفت پہ اتر آتے ہیں اور باطل نظامِ سرمایہ داری کی غیر مبینہ حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔اس نظام کو قرآن کی الٹی سیدھی تاویلات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ایک عالم بیزار ہے اور انسانیت جسکے خونی ہاتھوں میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔اور جسکی مخالفت قرآن قدم قدم پہ کرتا نظر آتا ہے۔

پچھلے کچھ ماہ سے حنیف صاحب کا جو المیہ سامنے آیا وہ یہ ہے کہ متعدد دینی و دنیاوی معاملات ایسے ہیں جن میں یہ قرآنی حقائق کو تسلیم کرتے ہیں،لیکن جہاں بات معاشی نظام کی ہو رہی ہو، وہاں یہ ایک دم پٹڑی سے اتر جاتے ہیں اور اسکی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔شاید اس لیے کہ قرآن ''انکی جیب پہ ہاتھ ڈالتا ہے''۔یہ خالصتاً وہی مخالفت ہے جو شروع دن سے حاکم وسرمایہ دار طبقہ انبیاء کرام کی کرتا چلا آیا ہے۔

یہ خدا کا وہ دین ہے جسکی اشاعت تو بڑے بڑے سرمایہ دار ''مومنین'' کو بھی گوارا نہیں،حنیف صاحب تو پھر ایک عام سے شخص ہیں۔مفاد پرستوں کے لیے دین،قرآن،اللہ،رسول،وحی، قانون جیسی تمام اصطلاحات تب تک قابلِ قبول بلکہ حسین نظر آتی ہیں جب تک یہ انکی جیبوں پہ ہاتھ نہ ڈالیں۔جیب سے روپیہ پیسہ ڈھیلا ہوتا ہو تو کوئی ضابطہ،کوئی قانون گوارا نہیں ہو پاتا اور بہت سے مفاد پرست ذہنیت کے حامل انسان نہ چاہتے ہوئے بھی انکی مخالفت پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ ابواب میں جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے،حنیف صاحب اس سے متفق نہیں، وہ اس کے مقابلہ میں روایتی نکتہ نظر کے بھی

حامی نہیں ۔ بلکہ وہ ایک بالکل انوکھی اور منفرد قسم کے نظریات کے حامل شخص ہیں جن پر غور وفکر اور تحقیق سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان کے نظریات روایتی طرزِ فکر اور تصوراتِ معیشت کے حامل افراد سے بھی زیادہ خلافِ قرآن اور کسی بھی معاشرہ کی معیشت کے لیے انتہائی تباہ کن ہیں ۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ یہ نہ روایتی تصوراتِ معیشت کے حامی ہیں نہ قرآن کریم کے اس معاشی نظام کو قرآنی تسلیم کرنے پر تیار ہیں جس کا داعی اللہ تعالیٰ ہے ۔ اور جسے ثابت کرنے کے لیے یہ پوری کتاب تحریر کی گئی ہے ۔ اس کے برعکس حنیف صاحب ایک تیسری قسم کے نظریہ معیشت کے داعی ہیں ۔

حنیف صاحب کا یہ نظریہ کیا ہے، اس کی تائید میں یہ کیا دلائل پیش کرتے ہیں، ان سے پہلے یہ نظریہ کس کی جانب سے پیش کیا جاتا رہا ہے اور قرآن ان کے نظریات کی حیثیت کے بارے میں کیا کہتا ہے، ان تمام امور پر مفصل گفتگو کے لیے میں اپنی اس کتاب کا یہ آخری باب وقف کر رہا ہوں ۔ قارئین سے خصوصی توجہ کی درخواست ہے ۔

حنیف صاحب کے تصوراتِ انفاق (انفاق کی ایک انوکھی تشریح)

ذیل میں انفاق فی سبیل اللہ کے معاملہ پر حنیف صاحب کا موقف تفصیلی طور پر درج کیا جا رہا ہے ۔ اس کے بعد ان نظریات کی قرآنی پوزیشن کے بارے میں بھی مفصل وضاحت پیش کی جائیگی ۔ میں نے ان کے نظریات کو اپنی زبانی بیان کرنے کی بجائے ان کے حقیقی فیس بک کمنٹس یہاں پیش کرنے کو ترجیح دی ہے تا کہ کہیں سے یہ اعتراض نہ اٹھ سکے کہ یہ حنیف صاحب کا موقف نہیں ۔ ملاحظہ فرمائیں:

Mohammad Hanif میرے پاس ایک جنریٹر ھے ــ اس سے میری فیملی بجلی حاصل کرتی ھے میرے جنریٹر میں گنجائش ھے ــ میں اپنے کسی پڑوسی کو ایک تار لگا دیتا ھوں ـــــ اب اس کے گھر بھی بجلی کی سہولت آ گئی ـــــ کیا خیال ھے یہ انفاق نہیں ـــــ

میرے گھر میں بڑا واٹر ٹینک ھے ــ وافر مقدار میں پانی دستیاب ھے ــ میں ان لوگوں کو جو میرے پاس پانی مانگنے آتے ھیں ــ ان کی ضرورت کے مطابق پانی دے دیتا ھوں ـــــ کیا یہ انفاق نہیں ھے ــ

میں ایک استاد ھوں ــ مجھے اللہ نے علم کی دولت سے نوازہ ھے ــ اگر کوئی مجھ سے کچھ سیکھنے کے لیے آتا ھے اور میں اسے کچھ سکھا دیتا ھوں ــ کیا یہ انفاق نہیں ـــــ

ھر نعمت خداوندی ، جس کا اللہ نے آپ کو مالک بنا دیا ھے ، اس سے خود بھی فائدہ حاصل کرو ــ اور دیگر انسانوں کو بھی فائدہ پہنچاؤ ـــــ اس پر روک لگا کر نہیں بیٹھ جاؤ ـــــ اس سے معاشرے میں انسانوں کو سہولت بہم پہنچاو ـــــ رکی ھوئی شے میں سرانڈ پیدا ھو جاتی ھے ــ یہ سرانڈ پیدا ھونے سے بچو ـــــ

August 1 at 4:25pm · Like · 5

Mohammad Hanif ....Yàwàr Sàeëd

جی میں نے کب کہا کہ انفاق فی سبیل اللہ نہیں ہوتا ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟
میں نے یہ عرض کی تھی کہ انفاق ، صرف فی سبیل اللہ سے مخصوص نہیں ـــــ یعنی انفاق صرف فی سبیل اللہ ھی کا نام نہیں ھے ـــــ ابھی جو آیت مبارکہ سورہ طلاق کی آپ نے لگائی ، پھر ھٹا لی ـــــ کیا اس میں فی سبیل اللہ ھے ـــــ
یہ جو 2/215 ھے ـــ اب اگر آپ کا سارا مال حکومت لے لے ـــــ تو یہ آیت کس کے لیے ھے ـــــ کیا ریاست کے ماں باپ بھی ھوتے ھیں ـ

Mohammad Hanif اللہ کریم نے انسان کو پیدا فرمایا ـــــ اسے کئ صلاحیتوں سے نوازہ ـ

اس نے انسانوں میں کسب معاش کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ـــــ

کیونکہ معاشرے کے نظام کو چلانے کے لیے ، یہ تفرقہ لازم ھے ـ

اس کا لا محالہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ معاشرے میں کچھ لوگ ، زیادہ نعمائے خداوندی کے مالک ھوں گے ـ اور کچھ کم کے مالک ھوں گے ـــــ

اب اللہ کریم ان لوگوں سے کہ جن کے پاس سامان رزق کی فراوانی ھے ، یہ ھدایت دیتا ھے کہ تم ان نعمتوں کو اس طرح استعمال کرو ، کہ اس کے نتیجہ میں ، معاشرہ ترقی کرتا چلا جائے ـ جس کا لازمی نتیجہ فرد کی ترقی و خوشحالی ھے ـــــ

وہ کہتا ھے کہ تم ان نعمتوں کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک ھی محدود نہ کر لو ـ بلکہ اسے کھلا رکھو ـــــ

یعنی یہ سب کو فائدہ پہنچانے کا باعث بن جائے ـــــ

لیکن اس ضمن میں وہ کہیں بھی اس انسان سے اس کے مال کی ملکیت نہیں چھیننا چاھتا ـــــ

اب اس لفظ " کھلا رکھنے " کو سمجھنے کی ضرورت ھے ـــــ

کیا اس کا مطلب میں یہ لے لوں کہ ، جو کچھ بھی میرے پاس ھے اسے کسی چوک میں رکھ دوں ـــــ

تو اس کا کیا نتیجہ ھوگا ـ اس پر تو سوچنے کی ضرورت ھی نہیں ھے ـــــ

کھلا رکھنے سے مراد یہ ھی ھے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ ترقی کرے

اب معاشرے کی ترقی کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے

لوگوں کی بھوک انہیں مخصوص اوقات میں کھانا کھلانے سے نہیں ختم ہو سکتی ـــ اس کے لیے ان کے مستقل روزگار کا بندوبست کرنا ہوگا ـــ

کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ ہر آدمی اپنے حصے کا رزق خود پیدا کرے ـــ

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوں ـــ

جن کے پاس مال کی فراوانی ہے وہ اپنا مال ایسے منصوبوں میں لگاتے چلے جائیں جس سے افرادی قوت کی مانگ بڑھتی چلی جائے ـــــ

جو تعلیم یافتہ ہوں ، وہ اپنا علم دوسروں تک اس طرح پہنچائیں کہ معاشرہ جہالت کے اندھیروں سے باہر نکل آئے ـــــــ

ایک طاقتور اپنی طاقت سے کمزوروں کی حفاظت کرے ـ

ایک صاحب علم دوسروں کو علم منتقل کرے ـــ

ایک سائنسدان اپنی تحقیق کے ثمرات دوسروں تک پہنچائے ـــــ

یہ سب انفاق ہے میرے بھائی ـــــ

نہ جانے کیوں یہ لوگ انفاق کو صرف روپے پیسے تک ہی محدود کیوں سمجھتے ہیں ـــــ

شاید اس لیے کہ سوشلزم یہ ہی کہتا ہے ـــــ

ایک طرفہ تماشہ یہ بھی ہے کہ جناب آپ زمین کے مالک نہیں ہو سکتے ـــــ کیونکہ یہ ارض اللہ ہے ـــــ

کیا منطق ہے ـــــ

قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ ساری کائنات ، اللہ کی ہے ـــ

لیکن ہمارے یہ دوست باقی سب کو چھوڑ کر صرف زمین پر کھڑے ہو گئے ـــــ

کیونکہ یہ سوشلزم کا نعرہ ہے ـــ

بہت توجہ کی ضرورت ہے ـــــــــ قرآن کہتا ہے ، ہم اپنے صالح بندوں کو زمین کا وارث بنا دیتے ہیں ـــــ ہم کہتے کہ بات ہی نہ کرو ـــــ

علامہ پرویز علیہ رحمہ کا ایک پمفلٹ ھے ـــــ عالمگیر افسانے ـــ

کبھی اس کا مطالعہ کیجئے گا ـــــ

جس طرح آج ھمارے لوگ اس بات کو ھی حقیقت سمجھتے ھیں کہ کبھی آسمانوں میں ایک مٹی کے پتلے سے آدم کو تخلیق کیا گیا ـــ کیونکہ یہ بات ان کے علماء نے کہی ھے ـــــ

بلکل اس ھی طرح ، ھمارے دوست بھی یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ حقیقت کیا ھے ـــــ

بس ان کے لیے یہ ھی کافی ھے کہ پرویز صاحب نے کیا کہا ھے ـــــــ
سلامت رھیں

August 2 at 3:18pm · Like · 2

Mohammad Hanif جن کے پاس مال کی فراوانی ھے وہ اپنا مال ایسے منصوبوں میں لگاتے چلے جائیں جس سے افرادی قوت کی مانگ بڑھتی چلی جائے ـــ

اور اس سے مزید کمایی کا ذریعہ بنایا جائے حتی کہ تمام وسائل آپ کی ملکیت میں آجائیں اور تمام دنیا آپ کی غلام بن جائے۔ بلواسطہ یا بلا واسطہ

یعنی جب آپ کہیں کہ زائد از ضرورت مال ، بیت المال میں جمع کروا دو ـــــ تب تو یہ مال جس نے کمایا ھے وہ بلکل حق حلال کا ھوا ـــــــ کیونکہ وہ آپ کے نظریہ کے مطابق بیت المال کو جو دے رھا ھے ـــ اور اگر وھی مال وہ اپنے پاس رکھ لے تو ، فساد ، سرمایہ دار ، نا جائز ھو جاتا ھے ـــ

ذرا مجھے بتائیں ، آپ میرا جو مال زائد از ضرورت ھے وہ مجھ سے لے کر بیت المال میں جمع کروا رھے ھیں ـــ تو اس صورت میں مجھ جیسے سرمایہ دار کا یہ مال ، جو بقول دوستوں کے ، استحجصال سے حاصل کیا گیا ھے ، وہ جائز کیسے ھو گیا ـ کیا کسی کا دو نمبر مال ، اللہ کو قبول ھے ـ جواب دلیل سے دیجئے گا ـــــــ

August 4 at 1:00am · Like · 3

Mohammad Hanif شعیب ـــــ ابھی یہ دوست ـــ ماذا ـــ کے قرآنی مفہوم سے انکاری ھیں ـــــ آگے انہیں میں نے " العفو " کے معنی بھی بتانے ھیں ـ جو انشاء اللہ بات کو نکھار دیں گے ـــــ ذرا سوچیں ـــ اتنا بڑا معاملہ ـــ یعنی معاش کا معاملہ ـــــ اور اس پر اللہ ایک مبہم آیت 2/219 نازل فرما رھا ھے ـ اور جس شئے پر یہ سارا فلسفہ بیان ھو رھا ھے ، یعنی زائد از ضرورت مال ـــــ اس زائد از ضرورت کی کوئی تشریح بیان کرنے کی ضرورت ھی محسوس نہیں کی گئی ـ اور اسے ان کے بقول اس سرمایہ دار پر ھی چھوڑ دیا گیا ـــــ کہ تو فیصلہ کر کے کتنی تیری ضرورت ھے ـ معاذ اللہ ـــــ یہ ھمارے دوست نا دانستگی میں ، کسی محترم بزرگ کے غلط نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے ـ اللہ کا کیسا امیج ھمارے سامنے پیش کر رھے ھیں ـــــــ

August 5 at 7:07pm · Like · 3

Mohammad Hanif جناب آپ ہی کے ایک کمنٹ سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ آپ انفاق سے مراد روپیہ پیسہ کا انفاق لینے کی میری وضاحت پر معترض تھے۔یہ دیکھیں آپ کے اولین کمنٹس۔

برائے مہربانی دلیل سے ثابت فرمائیں ـــ کہ انفاق کا معنی ، روپیہ پیسہ کھلا رکھنا ھے ـــــــــــ

جی بلکل میں نے درست اعتراض کیا ھے ـــ بات انفاق کی ھو رھی ھے ـ اور آپ اسے محض روپے پیسے تک محدود رکھ رھے ھیں ـــ اور پھر ابھی آپ سرکار نے ھی تو اس لفظ " انفاق " کا معنی " کھلا رکھنا " کیا ھے ـ تو پھر جہاں یہ لفظ " انفاق " استعمال ھوگا ـ اس کا معنی صرف روپیہ پیسہ کیسے ھو گیا ـــــــ

دراصل مسئلہ کیا ھے ـــــــ جس طرح امت کی اکثیریت نے ، صلوۃ کو صرف نماز تک ھی محدود کر لیا ھے ـ آپ دوستوں نے بھی اس عظیم الشان لفظ " انفاق " بس روپے ، پیسے تک محدود کر لیا ھے ـ ورنہ یہ تو قرآن کریم کی وہ عظیم الشان اسطلاح ہے ، جس میں دین کی روح بسی ھوئی ھے ـ

اور رہ گیا میری طرف سے "اللہ کی راہ میں" کا Mohammad Hanif استعمال ـــــــ تو انفاق ہمیشہ اللہ کی راہ میں ہی ہوتا ہے۔ابلیس کی راہ میں نہیں ہوتا۔ قران میں متعدد مقامات پر لفظ "وانفقو فی سبیل اللہ" کا ذکر ہے۔
اور جب لفظ "اللہ کی راہ میں" استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیش کردہ نظام و قوانین پر عمل کرتے ہوئے اس کی طرف سے دئے گئے احکامات پر عمل کرتے ہوئے انفاق کرنا۔ ٹھیک؟

یہاں بھی آپ غلط فہمی کا شکار ھیں میرے بھائی ـــــــ ذرا غور فرمائیں ـــــــ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ(٣٦) سورہ انفال

بیشک کافر لوگ اپنا مال و دولت (اس لئے) خرچ کرتے ہیں کہ (اس کے اثر سے) وہ (لوگوں کو) اللہ (کے دین) کی راہ سے روکیں، سو ابھی وہ اسے خرچ کرتے رہیں گے پھر (یہ خرچ کرنا) ان کے حق میں پچھتاوا (یعنی حسرت و ندامت) بن جائے گا پھر وہ (گرفتِ الٰہی کے ذریعے) مغلوب کر دیئے جائیں گے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے، (36) طاہر القادری

میرے بھائی ـــ یہ جو لفظ ہے ـ انفاق ـــــــ آپ اسے صرف مسلم یا مومن سے مختص کر رھے ھیں ـ یہیں آپ سے سہو ، ھو رھا ھے ـ نہ ھی یہ لفظ ـ اللہ کی راہ میں صرف روپے پیسے خرچ کرنے کے لیے استعمال ھوتا ھے ، اور نہ ھی صرف مومنین کے لیے ـ

اس کے معنی ، اپنے تمام وسائل کو ، اپنے اپنے مقاصد کے لیے ، عام کرنے کے ھوتے ھیں ـــ
جب یہ انفاق اللہ کریم کرتے ھیں ، تو اس کا معنی ھے کہ کائنات میں موجود ھر شئے ، وہ اپنے بندوں کی نشو ونما کے لیے عام کر دیتا ھے ـ لیکن اس عمل سے اس کا ان اشیاء پر حق ملکیت ختم نہیں ھو جاتا ـــ

یہ ھی انفاق ، کافر بھی کرتا ھے ـــ وہ اپنے وسائل ، اپنے مقاصد کے لیے عام کر دیتا ھے ـــ
بلکل اس ھی طرح ، مومن بھی اپنے تمام وسائل سے اپنی ضروریات کے پورا ھونے کے بعد ، اپنے بھائیوں کے لیے عام کر دیتا ھے ـ لیکن اس عمل میں وہ اپنے حق ملکیت سے ھرگز محروم نہیں ھوتا ـــــــ

Mohammad Hanif ....Ýàwàr Sàeëd

برادر ـــــ ایک مثال دیتا ھوں ـــــ تاکہ سمجھا سکوں کہ ، میرے نزدیک انفاق کا درست مفہوم کیا ھے ـــــــــ

ہم لوگ روزانہ نیٹ استعمال کرتے ھیں ـ ذرا غور فرمائیں ـــ ہر شعبے کا فرد ، اپنی ضرورت کی معلومات ،اور دیگر فوائد ، جب چاھتا ھے ، جتنا چاھتا ھے ، حاصل کر لیتا ھے ـــــــــــــ ظاھر ھے یہ سب ھماری محنت تو نہیں ھے ـ کسی نے محنت کی ـ خود بھی فائدہ اٹھایا ـ اور پھر اپنی اس محنت کو دوسروں کے لیے کھلا کر دیا ـــــــــــ اب کیا اس کے اس عمل سے وہ اپنی محنت کے اس ما حاصل سے ھی محروم کر دیا جائے ؟؟؟ یہ سب کچھ اس ھی کی ملکیت رھے گا ـ بس اس نے اپنے اس علم کو اپنے دماغ میں ، یا کسی مخصوص کتاب میں دفن نہیں کیا ـ بلکہ اسے مفاد عامہ کے لیے کھلا چھوڑ دیا ـــــ

میرا موقف صرف اتنا ھے کہ ، سورہ بقرہ کی آیت زیر بحث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا جا رھا ، کہ لوگ اپنی محنت کی کمائی ، میں سے اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ بھی ھو ، سب کا سب ،وہ دوسروں کو دینے کا پابند ھے ـ اور اگر وہ ایسا نہ کرے ، تو بزور تعزیر اس سے یہ چھین لیا جائے ـــــ

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ارشاد باری تعالی ھے ـــــ

ولا تاکلو اموال الناس باالباطل ـــــ اور تم لوگوں کا مال نا جائز طریقہ سے مت کھا جاو ـــــــــ

تو سوال یہ ھے کہ ـــــ جب کسی کے پاس زائد از ضرورت مال ھوگا ھی نہیں ـ تو اس حکم ربی کی کیا ضرورت تھی ؟؟؟

مشکل یہ ھے کہ ، ھمارے وہ دانشور جن کے نظریات پر ھمارے احباب ، ایسے مباحثوں میں لگے رھتے ھیں ـ وہ اس دور سے تعلق رکھتے ھیں جب سوشلزم اپنے عروج پر تھا ـــــــــ اور وھاں سے یہ نعرہ بلند ھو رھا تھا ـــــــــ کہ کماو صلاحیت کے مطابق ـ اور خرچ کرو ضرورت کے مطابق ـ اور اس سوال کے جواب میں کہ ـ اگر کوئی اپنی ضرورت سے زائد کمائی کا مالک ھی نہیں ھو سکتا تو وہ زیادہ محنت کیوں کرے گا ؟؟؟ جس طرح مارکس لاجواب تھا ـــــ اور کہہ رھا تھا کہ " میں نہیں جانتا کہ کوئی ایسا کیوں کرے گا ـــــــــ لیکن میں یہ جانتا ھوں کہ ایسا ھونا چاھیے ـ اور پھر سوشلزم نے ایسا کس طرح کروایا ـــــ اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ھے ـــــــــ

کا یہ موقعہ نہیں ھے ـــــــــ

تو اپنے دور کے کسی نظریے سے متاثر ھو جانا ، یہ کوئی ، غیر فطری بات تو نہیں ـــ

چنانچہ ، ھمارے بڑوں میں سے بھی کچھ اس نظریے سے متاثر ھو گئے ۔ اور قرآن کریم کو اس انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ـــ مجھے ان کی نیت پر کوئی شک نہیں ـــــ مگر کیا میں قرآن کریم میں موجود ان تمام آیات سے منکر ھو جاوں جہاں ، لوگوں کے مال اور اس کے متعلق احکامات دئے گئے ـــــــــ

وہ خدا ، میرے مرنے کے بعد میری چھوڑی ھوئی میراث کو بھی صرف میرے اھل خانہ تک ھی محدود رکھتا ھے ـــ کسی بیت المال میں جمع نہیں کرواتا ـــــــ اور یہ لوگ ، زندہ انسانوں کو ، قرآن کے نام پر ، ان کی محنت کی کمائی سے محروم رکھنا چاھتے ھیں ـــــــــ

جاری ھے

Mohammad Hanif ذرا غور فرمائیں ـــــــ وہ کون سا جذبہ ھے ، جس پر یہ ساری دنیا کی ترقی کا انحصار ھے ـــ وہ جذبہ ، مسابقت کا جذبہ ھے ـــ آگے بڑھنے کا جذبہ ـــــــ اگر کسی وجہ سے انسان میں سے یہ جذبہ ھی ختم کر لیا جائے ، تو انسان مٹی کا ڈھیر بن کے رہ جاتا ھے ـــــــــ

انفاق کا معنی کسی کی دولت ، جائیداد ، یا کسی اور شئے کو بزور تعزیر چھین لینا نہیں ھے ـــــــــ

بلکہ سچ تو یہ ھے کہ ، اللہ کریم ، انسان سے کوئی بھی بات ، زبردستی منوانا ھی نہیں چاھتا ـــــــــ وہ تو صرف راہنمائی عطا فرما کر اس پر عمل کے لیے میدان خالی چھوڑ دیتا ھے ـــ

July 12 at 10:58pm · Like · 3

برادر محترم آصف بھٹی صاحب ـــــ سلام و Mohammad Hanif رحمت

جہاں تک " فیملی " گروپ کا تعلق ھے ـ تو وھاں ھم میں سے کس نے کتنا وقت دیا ـــ اس کا فیصلہ آپ خود بخوبی کر سکتے ھیں ـ

آپ نے جب 2/219 کی ابتدائی آیات کے حوالے سے ایک سوال اٹھایا ـ تو یقین کریں ، مجھے ایسا لگا کہ بات اپنی منزل تک پہنچنے لگی ھے ـ کیا ھی خوب ھو کہ آپ اس سوال کا جواب بھی خود ھی تحریر کریں ـــ

میں اپنے اس موقف پر بدستور قائم ھوں کہ انفاق ، مومن کی مستقل اقدار میں شامل ھے ـــــ جس طرح ایک کافر ، صرف انفاق کر کے ، مومن نہیں ھو سکتا ـــــ بلکل اس ھی طرح ایک مومن ـ ایمان کے تمام اجزاء پر عمل اور ایمان کے باوجود ، انفاق نہ کرکے ، ھدایت یافتہ نہیں کہلا سکتا ـ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات اس حوالے سے بہت ھی واضح ھیں ـــ
انفاق کا ریاست سے کوئی لینا دینا نہیں ـــــ بھر حال آپ کے نوٹ کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ، مزید کچھ کہنے کی کوشش کروں گا ـــ

البتہ ایک دلچسپ صورتحال سامنے آئی ھے ـ چونکہ میری یہ خواھش تھی کہ برادر پاور صاحب قدم بہ قدم اس موضوع پر میرا ساتھ دیں ـ وہ ایک لفظ " ماذا " پر ھی ٹھہر گئے ھیں ـــــــ ایک طرف وہ ان آیات قرآنی کے سامنے آ جانے کے بعد بھی ، اپنے موقف سے دستبردار نہیں ھو رھے ـ تو دوسری جانب ، ایک عقلی بات بھی نہیں مان رہے ـ کہ جب ان کے خیال میں ، کتنا ـ اور کیا ـــ ایک ھی بات ھے ـ تو پھر وہ اپنے ترجمہ میں کتنا کی جگہ ـــ کیا ـ لکھ دیں ـــــــ تو وہ اس پر بھی راضی نہیں ـ ورنہ بات آگے چلتی ـ اور وہ دلچسپ صورتحال ، جس کا میں ذکر کر رھا تھا ، سامنے آ جاتی ـــــــ

سر دست اتنا ھی کہوں گا ـــــ کہ جب انسانی ضرورت کا تعیین اس انسان نے خود ھی کرنا ھے ـــــ تو مجھے آپ بتائیں پھر بات کیا ھوئی ـ پھر کہاں سے وہ مفہوم برآمد ھوا کہ قرآن ذاتی ملکیت کے خلاف ھے ـ کوئی مال جمع نہیں کر سکتا ـــــــ

یہ کیسی مضحکہ خیز صورتحال ہو گی کہ ایک طرف اللہ آپ سے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی زائد از ضرورت دولت ، بیت المال میں جمع کروا دو ـــــ اور دوسری طرف اسے اس بات کی کھلی اجازت ہو کہ اپنی ضروریات کا تعین بھی وہ خود ہی کر لے ـــــــــ کیا اس ہی کا نام ، قرآن حکیم ہو سکتا ہے ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

برادر محترم ـــــ ماذا ـــــ کا درست مفہوم تو میں نے پیش کر دیا ہے ـ اب ذرا آپ ، العفو ـ کے درست مفہوم پر تدبر فرما لیں ـــــ تو آپ پکار اٹھیں گے کہ واقعی وہ اللہ ، کبھی ایسی طفلانہ ، باتیں نہیں کرتا ـــــ اس آیت کا یہ من مانا مفہوم اگر نہ ہوتا ـــــ تو آپ خود غور کریں کہ کمیونزم کے اس نظریہ کے عمارت ، کہ کماو صلاحیت کے مطابق ـ خرچ کرو ضرورت کے مطابق ـ کس طرح دھڑام سے آ گرتی ہے ـــــــــ

قرآن کا واضح پیغام ہے ـــــ کہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ حاصل کرو ـ زیادہ سے زیادہ نعمائے زندگی حاصل کرو ـــــ

اور اس مرحلے میں وہ ان طبعی قوانین کی بات کرتا ہے کہ جس پر چل کر کوئی بھی وہ نتائج حاصل کر سکتا ہے ـ اس میں وہ نہ مومن کی تخصیص کرتا ہے اور نہ کافر کی ـ

لیکن ان نعمائے خداوندی کے حصول کے بعد ،ان کے استعمال کے لیے وہ مومن کو وحی کے مطابق چلنے کی تلقین کرتا ہے ـ

اس مقام پر نہ تو زائد از ضرورت کی بات ہے اور نہ کم ضرورت کی بات ـــــ

بلکہ وہ تو مومن کی ایک شان یہ بھی بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں ـــــــــ

یہاں پر تو وہ ان نعمائے زندگی کےدرست استعمال کی بات کرتا ہے

ـــــــــ وہ بتاتا ہے کہ تمھاری کمائی میں کس کا کتنا حصہ ہے ـ

تم نے معاشرے کو کیا دینا ہے ـ

Mohammad Hanif ـــــ میں کسی کے کام آ سکتا تھا ـــــ ھرگز نہیں ـــــ آ گیا ـــــ نہ کوئی جزاء کا مطالبہ اور نہ ھی احسان ـــــ نہ شکریہ

البتہ اگر میں جنریٹر کرائے پر دینے کا کاروبار کرتا ھوں ـــ اور میرا کوئی پڑوسی میرے پاس آ کر ، ایک دن ، یا زیادہ کا کم ـــ کے لیے جنریٹر مانگتا ھے ـ تو میں لازماً اس سے کرایہ لوں گا ـــــ ھاں یہ صلہ رحمی ھوگا اگر میں اس پڑوسی کو دوسروں کے مقابلے میں کچھ کم کرائے پر جنریٹر دوں ـ

لیکن آپ مجھے انفاق کو صرف فی سبیل اللہ سے مخصوص کرنے کے حوالے سے قرآنی آیت ، بتائیں ـــــ تاکہ میری اصلاح ھو سکے ـــــ سلامت رھیں

July 31 at 12:50am · Edited · Like

Mohammad Hanif قرآنِ کریم کی رو سے جو نظام قائم ھوتا ھے۔ اس میں زیادہ کمانے والا اپنی فاضلہ کمائی کو نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دیتا ھے۔ ۶/۱۴۲۔ تاکہ وہ اس سے ان لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کا انتظام کرے۔
>>>

Mohammad Hanif اگر انفاق کو سمجھنا ھے تو صرف ایک آیت ھی کافی ھے ــ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ـــــ 9/34

اے ایمان والوا بہت سے عالم اور راہب لوگوں کا مال ناجائز طریقہ پر کھاتے ہیں اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے رہتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ ترجمہ جناب محمد حسین نجفی صاحب

میرے نکتہ نظر کے مطابق ، انفاق کی تشریح کے لیے اس بہتر کوئی آیت شاید نہ ملے ـــــــــ غور فرمائین

چار باتیں بہت اہم بیان ھوئی ھیں ـ

1ـــ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ
یہ وہ شئے ھے جو آپ کی نظر میں شجر ممنوعہ ھے ـــ

2 ـــ بِالْبَاطِلِ ـــــ سمجھنے کی بات ھے ـ باطل کسے کہتے ھیں ـ اللہ نے لوگوں کا مال ان کی مرضی کے خلاف نہ کھانے کا حکم دیا ھے ـــ اور آپ لوگوں سے اس ھی اللہ کے نام پر سب کچھ ، نظام ، بیت المال ، وغیرہ کے نام پر چھین لینا چاھتے ھیں ـ

3 ـــ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ـ یہ ھے انفاق کی ضد ـــــ کنز ـــ عربی زبان میں ـــ کنز ـــ ابن فارس نے اس کے معنی کسی شئے کے اکھٹا ہونے کے کیے ہیں ـــــــ اور آگے سونا اور چاندی ـــ ایس حالت میں جمع کرنے کے معنی ھیں جو منجمد ھو جائے ـــ جامد ھو جائے ـــ کوئی تعمیری نتیجہ نہ نکال سکے ـــ
غور فرمائیں کیا کہہ رھا قرآن ـــــ کہا ـــــ تم لوگوں کا مال ناجائز طور سے نہ کھا جاو ـ یہ باطل عمل ھے ـــ
اور جو کچھ اللہ نے تمھیں عطا فرمایا ھے ـــ اسے ایک جگہ جامد نہ کرو ـ بلکہ اپنی ضرورت پوری کرو جو بچ جائے اسے کسی ایسے منصوبے میں لگا دو جس کے نتیجہ میں ، تمھارے یہ وسائل سارے معاشرے میں خون کی طرح گردش کرنے لگ جائیں ـــ جس سے معاشرے میں خوشحالی آئے ـ لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں ـــــــــ
ـــ وَلَا يُنفِقُونَهَا ـــ اور اگر تم ایسا نہیں کرتے ـــ تو تم نے انفاق نہ کیا ـ

انفاق کا معنی کسی سے اس کا مال ، زمین ، زبردستی ھتھیانہ ھرگز نہیں بلکہ ، انفاق کا معنی ، اپنی زائد از ضرورت متاع ، کا ایسا استعمال ھے جو معاشرے میں تعمیری نتائج پیدا کرے ـــــــــ
اپنی زائد از ضرورت متاع ، کو کسی حالت میں منجمد کرنے کی اجازت نہیں ھے ـــ چاھے وہ بینک بیلنس کی شکل میں ھو ـــ سونے چاندی کی شکل میں ھو ـ پلاٹوں کی شکل میں ھو ـــــــ کوئی بھی ایسا استعمال ، جو معاشرے میں آسانی اور آسودگی نہ پیدا کرے ، اس کی ممانعت ھے ـ

Mohammad Hanif .....Yàwàr Sàeëd

نہیں میرے محترم بھائی ــ بات اتنی سادہ ہرگز نہیں ھے ـ

یہ ھی تو وہ بنیادی جڑ ھے ، جس نے آگے جاکر ، شوشلزم کے ان جابرانہ اقدامات کا جواز پیش کرنا ھے ـ کہ دیکھو ، قرآن کہہ رہا ھے کہ کوئی مال کا مالک نہیں ھو سکتا ـ آؤ اور چھین لو سب کچھ ـــــــ

جب آپ اس ترجمہ ، کہ کتنا انفاق کریں ــ کو قل العفو ـ کے ساتھ ملا کر پڑھیں گے ، تو بات کا مطلب ھے کوئی انسان ، مال ، مویشی ، جائیداد ، کاروبار کا مالک نہیں ھو سکتا ــ

یہ قرآن پر تہمت ھے ـ قرآن کہیں بھی ایسا نہیں کہتا ــ یہ میرا چیلنج ھے ــ اگر کسی کو اعتراض ھے تو قرآن سے دلائل پیش کرے ــ

یہاں میں اس خودساختہ عقیدے کو مسترد کرتا ھوں کہ ھر آدمی بے ایمان ھے ــ وہ جب بھی کمائے گا ، حرام کمائے گا ، لوگوں کا استحصال کرے گا ـــــــ

لیکن اگر اس بنیادی غلطی کی اصلاح ھو جائے ، کہ قرآن کیا کہہ رہا ھے تو پھر آگے کے مراحل آسان ھو جاتے ھیں ــ

قرآن کہہ رہا ھے ــ لوگ پوچھتے ھیں ، کیا انفاق کریں ؟؟

کہا ، وہ جو تمھارے پاس ھے ، جس سے تم فائدہ حاصل کرتے ھو ـ

اب تم ایسا کرو کہ اپنے اس فائدے میں دوسروں کو بھی شامل کرو ــ عام کرو ــ اپنے پاس پوٹلی بنا کر اسے منجمد نہ کر دو ـــــــ

ذرا غور فرمائیں ـــــــ ایک پروفیسر ھے ـ علم کے خزانوں کا مالک ــ اگر وہ اپنا علم صرف خود تک ھی محدود کر لے ، تو یہ کیا ھے ؟؟

ذرا تصور کریں ــ اگر یہ نیوٹن ، آئن اسٹائین ، وغیرہ نے اپنی کمائی عام نہ کی ھوتی تو آج انسانیت کہاں کھڑی تھی ؟؟؟

ذرا غور فرمائیں ـــــــ ایک پروفیسر ھے ـ علم کے خزانوں کا مالک ـ اگر وہ اپنا علم صرف خود تک ھی محدود کر لے ، تو یہ کیا ھے ؟؟

ذرا تصور کریں ـ اگر یہ نیوٹن ، آئن اسٹائین ، وغیرہ نے اپنی کمائی عام نہ کی ھوتی تو آج انسانیت کہاں کھڑی تھی ؟؟؟

اگر ایڈیسن نے بلب ایجاد کر کے ، صرف اپنا گھر روشن کر لیا ہوتا ـ تو ساری دنیا تاریک نہ ھوتی ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟ یہ ھے انفاق میرے بھائی ـــ

آپ ذرا زمانہ قدیم کی طرف توجہ دیں ـــ

کتنے ایسے اطباء کا نام آپ کو مل جائے گا ، جو اپنے جدی پشتی ، دواؤں کے فارمولے اپنے ساتھ قبر میں لے گے ـ اور انھیں انسانیت کے لیے عام نہ کیا ـ یہ ھے انفاق سے انکار ـــ

ھمارے یہ دوست انفاق کے ایک جز ، یعنی پیسے کو ھی کل بنائے بیٹھے ھیں ـــ

روپے پیسے کا انفاق بھی لازم ھے ـــ

لیکن ایسا نہیں ھے کہ اپنی کمائی ، کسی فرد ، گروہ یا ریاست کے حوالے کر کے ، خود لائن میں لگ کر بھیک مانگنا شروع کر دیں ـــــــــ

ھمارے یہ دوست لوگوں کو بھیک منگا بنانا چاھتے ھیں ـــ

لیکن اللہ نے انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ھے ـ وہ بھکاری نہیں ، کارآمد انسان کی بات کرتا ھے ـــ

بہر حال ، جب وہ مقام آئے گا ـ جہاں ھم انفاق کی وسعتوں پر بات کریں گے تو میں انشاء اللہ قرآن سے ثابت کروں گا کہ وہ رب ، مال کمانے ، اس کا مالک بننے سے نہیں روکتا ـــ

ھاں وہ مال کے ارتکاز کی ممانعت کرتا ھے ـــ

وہ اور نعمائے خداوندی کے ساتھ ، اس مال و دولت کے انفاق کا بھی حکم دیتا ھے

وہ اور نعمائے خداوندی کے ساتھ ، اس مال و دولت کے انفاق کا بھی حکم دیتا ھے

لیکن انفاق ایک محدود اصطلاح نہیں ھے ــ اور نہ ھی ، اپنا سب کچھ کسی کے حوالے کرکے ، مفلس بنانے کا نسخہ ھے ــ

وہ سب انسانوں کی خوشحالی چاھتا ھے ــ

لیکن کسی کے عطا کی ہوئی بھیک پر نہیں ــ بلکہ اپنے زور بازو سے کمائے ھوئے رزق پر ــــــــ

سلامت رھیں

برادر محترم ، آصف بھٹی صاحب ــــــــ سلام و Mohammad Hanif رحمت

بھائی میرے دل میں ، کسی کے لیے کوئی بدگمانی نہیں ھے ــ دیکھنا یہ ھے کہ قرآن کیا کہہ رھا ھے ــــــ اس سے کیا فرق پڑتا ھے کہ ، حنیف کیا سمجھتا ھے ــــــــ

بہت خوشی کی بات ھے ، اگر برادر پاور صاحب نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا ھے ــ اللہ کریم ہم دونوں کو ، اور تمام مسلمانوں کو ، صراط مستقیم کی طرف راہنمائی عطا فرمائے ــــــــ

برادر محترم ــــــــ ایک مثال دیتا ھوں ــــــــ

حکومت ایک ٹیکس عائد کرتی ھے ـ کہ اتنی رقم سے زیادہ آمدنی والا ، اتنے فی صد ٹیکس ادا کرے گا ــــــــ اب اگر اس زمرے میں آنے والا کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا ، تو حکومت اسے سزا دے گی ــ اس حوالے سے اسے کوئی اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو ٹیکس دے ، اور نہ چاہے تو نہ دے ــ

لیکن ــــــــ

آپ جانتے ھیں ، کبھی جب سیلاب آ جاتے ھیں ، زلزلے آ جاتے ھیں ـ تو حکومت ایک اپیل جاری کرتی ھے ـ اور ایک فنڈ قائم کر دیتی ھے ــ لیکن اگر میں اس فنڈ میں کچھ نہ دینا چاھوں ، تو میری مرضی ــ حکومت اس بناء پر مجھے سزا نہیں دے سکتی ــ

بس یہ ھی صورتحال ھے ــ

اسلامی ریاست جب قائم ھوگی ـ وہ نظام صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی پابند ھوگی ــ وہ باھمی مشاورت سے ، زکوٰۃ کا نصاب بھی طے کرے گی اور مال دار کی حد کا تعین بھی ــــــ

اس ضمن میں کوئی حیل و حجت نہیں مانی جائے گی ــ لیکن یہ سارا نظام تمکن فی الارض سے مشروط ھے ــــــــ

لیکن انفاق ایک مسلسل عمل ھے ۔ اس کی ابتداء اپنے گھر سے ھی ھو جاتی ھے ۔

کیا کرتا ھے ایک باپ اپنے گھر میں ۔۔۔۔

وہ اپنے سارے وسائل ، اپنے بچوں کے لیے کھلے رکھتا ھے ۔

وہ دیکھتا ھے کہ کس بچے کی کیا ضرورت ھے ۔ وہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ھے اگر کسی کی ضرورت زیادہ ھے تو اسے زیادہ دیتا ھے ۔ اور جس کی ضرورت کم ہوتی ھے اسے کم دیتا ھے ۔۔۔۔

لیکن کیا ایسا کرتے ھوئے ، وہ اپنے مال ، یا دیگر نعمائے زندگی سے ، جو اس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے حاصل کیے ہوتے ھیں ، خارج ھو جاتا ھے ؟؟؟

ھرگز نہیں ۔۔۔۔

بلکہ اسے تو یہ حق حاصل رھتا ھے کہ اپنی زندگی میں لازمی وصیت کرے ۔ وہ جس کو چاہے ، جتنا چاہے ، دے دے ۔۔۔۔۔۔

اور اگر وہ ، وصیت کئے بغیر ھی مر جاتا ھے ، تب بھی اس کا مال ، اسکی جائیداد ، اس کی ھر شئے ، صرف اور صرف اس ھی کے بیوی ، بچوں ، ماں باپ ، بہن بھائیوں میں تقسیم کرنے کا حکم ھے ۔

قرآن کریم کی کسی آیت کی کوئی ایسی تشریح ، جو اس کی بنیادی تعلیم سے ٹکراتی ھو ، وہ درست نہیں ہو سکتی ۔

جاری ھے

جہاں تک آپ کی پیش کردہ نظم کا تعلق ھے ، تو Mohammad Hanif
بخدا یہ تو میرے نکتہ نظر کو سو فیصد ثابت کرتی ھے ۔

اقبال علیہ رحمہ ، ایک بلند مرتبت انسان تھے ۔

میں نہیں جانتا کہ انہوں نے ، اس نظم میں جو واقعہ بیان کیا ھے ، اس کی سند کیا ھے ۔

لیکن اگر ایسا ھی ھوا ھے ، تو اس میں تو صرف میرا ھی موقف بیان ھوا ھے ۔
ذرا غور فرمائیں ـــــــــــ

اگر 2/219 کا وہ ھی مفہوم ھے ، جو پرویز علیہ رحمہ نے بیان کیا ۔ اور جس پر ھمارے بھائی پاور صاحب کو اصرار ھے ،

تو معاذ اللہ ، ثم معاذ اللہ ، ـــــــــ ھمارے یہ دونوں جلیل القدر صحابہ کرام ، اس حکم ربی کے باغی قرار پاتے ھیں ۔

ایک طرف عمر رض ، کئی ھزار دینار کے مالک کی حیثیت سے سامنے آ رھے ھیں ۔

جب کہ ان کے پاس تو چند سو دینار بھی برامد نہیں ھونے چاھیے تھے ۔

سوال یہ ھے کہ کیا حضرت عمر رض ، بھی اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ زائد از ضرورت مال وہ جمع نہیں کر سکتے ـــ

دوسری طرف سیدنا ابوبکر رض بھی اس آیت مبارکہ کے خلاف ، اپنی ضرورت کی کوئی شئے اپنے پاس نہیں رکھتے ۔

جب کہ 2/219 کے زیر بحث ترجمہ کی رو سے ، انہیں اپنی ضرورت سے زائد ھی دینا تھا ـــــــــــ

میرے محترم بھائی ـــــــــ

یہ ھی وہ نکتہ ھے جسے سمجھانے کوشش کر رھا ھوں ۔ لیکن شاید میں سمجھا نہیں پا رھا ـــ

ایک طرف عمر رض ، کئی ھزار دینار کے مالک کی حیثیت سے سامنے آ رھے ھیں ۔

جب کہ ان کے پاس تو چند سو دینار بھی برامد نہیں ھونے چاھیے تھے ۔

سوال یہ ھے کہ کیا حضرت عمر رض ، بھی اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ زائد از ضرورت مال وہ جمع نہیں کر سکتے ۔۔

دوسری طرف سیدنا ابوبکر رض بھی اس آیت مبارکہ کے خلاف ، اپنی ضرورت کی کوئی شئے اپنے پاس نہیں رکھتے ۔

جب کہ 2/219 کے زیر بحث ترجمہ کی رو سے ، انہیں اپنی ضرورت سے زائد ھی دینا تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔

میرے محترم بھائی ۔۔۔۔۔

یہ ھی وہ نکتہ ھے جسے سمجھانے کوشش کر رھا ھوں ۔ لیکن شاید میں سمجھا نہیں پا رھا ۔۔

وہ غلطی جو امت کی اکثیریت کرتی چلی آ رھی ھے ، وہ ھی آپ بھی کر رھے ھیں ۔۔

ذرا سوچیں ۔۔

جب کبھی ھم ، ھمارے ان مولوی صاحبان سے زکوٰۃ کے مصارف کا سوال کرتے ھیں ،

تو وہ یہ آیت مبارکہ پیش کرتے ھیں ۔۔ کہ

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۔۔ 9/60

اور ھم اس پر یہ ھی جرح تو کرتے ھیں کہ اس میں زکوٰۃ کہاں ھے ۔

یہ تو صدقات کے مصارف ھیں ۔

اور ھمارے یہ علماء کرام اس پر کبھی بھی ھمیں تسلی بخش جواب نہیں دے سکے ۔

کیا آپ کے سوال میں یہ ھی صورتحال نہیں ھے ؟؟

قرآن کریم قیامت تک کے آخری انسان کی راھنمائی کی واحد کتاب ھے ۔

اس کتاب عظیم میں کوئی لفظ ، نہ تو ضرورت سے زائد ھے ، اور نہ کم ۔

قرآن کریم کا ھر لفظ ، اپنی اپنی جگہ ھمالیہ سے زیادہ مستحکم اور سمندروں سے زیادہ گہرا ھے ۔

ھر لفظ کے اپنے اپنے مخصوص مفہوم و معنی ھیں ۔

کوئی لفظ ، دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ھے ۔

یہ اللہ کا کلام ھے ۔

اور اس کریم نے جو اصطلاحات قرآن کریم میں بیان کی ھیں ، وہ ھرگز ھرگز ایک جیسے مفہوم و معنی کی حامل نہیں ھیں ۔

قرآن کریم نے معاشی معاملے میں ، چند مخصوص اصطلاحات بیان کی ھیں ۔

صلوٰۃ ، زکوٰۃ ، صدقات ، خیرات ، اور انفاق

یہ ساری کی ساری اصطلاحات ،اپنے

urangzaib Yousufzai likes your
omment: "پیر زادہ ارشاد لگتا ہے
...صاحب کی عقل پ

نہ زکوٰۃ ، صدقات کا ھم معنی ھے ۔

معنی ھے ۔

نہ زکوٰۃ ، صدقات کا ھم معنی ھے ۔ اور نہ ھی انفاق صدقات کا ھم معنی ھے ۔

یہیں وہ غلطی ھو رھی ہے جسے میں درست کرنے کی کوشش کر رھا ھوں ۔

میرے محترم بھائی ۔

انفاق کا حکومت سے کوئی لینا دینا نہیں ھے ۔

یہ مومنین کی انفرادی ذمہ داری ھے ۔ جسے وہ اپنے رب کی رضا کے لیے ادا کرتا ھے ۔ اس کے نتیجہ میں معاشرے میں ، خوشحالی اور ترقی کا عمل جاری و ساری رھتا ھے ۔

حکومت کے پاس صرف ایک شئے ھے ۔ زکوٰۃ ۔

اسلامی معاشرہ ، باھمی مشاورت سے اس بات کا تعین کرے گا ، کہ کس حیثیت کا حامل شخص ، زکوٰۃ کی ادائیگی کرے گا ۔اور کتنی زکوٰۃ ادا کرے گا ۔۔۔۔۔

جب یہ نصاب طے ھو جائے گا ، تو پھر یہ زکوٰۃ لازماً وصول کی جائے گی ۔ اگر رضا کارانہ طور پر نہ دی جائے ، تو بزور تعزیر و طاقت وصول کی جائے گی ۔

البتہ ، ایمرجنسی کی صورت میں ،حکومت اپنے لوگوں سے صدقات کی اپیل کر سکتی ھے ۔

لیکن اسلامی حکومت ، صدقات بھی بزور طاقت حاصل نہیں کر سکتی ۔

اس مقام پر میں یہ بات واضح کر دوں ، کہ مومن کی ایک شان قرآن کریم نے یہ بھی بیان کی ھے کہ وہ اپنے بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ھیں ۔

چنانچہ یہ ممکن ھی نہیں کہ ، ایمرجنسی کی صورتحال میں ، کوئی مومن اپنے بھائیوں کی امداد میں لیت و لعل سے کام لے ۔

جب یہ نصاب طے ھو جائے گا ، تو پھر یہ زکوٰۃ لازماً وصول کی جائے گی ۔
اگر رضا کارانہ طور پر نہ دی جائے ، تو بزور تعزیر و طاقت وصول کی جائے گی ۔

البتہ ، ایمرجنسی کی صورت میں ،حکومت اپنے لوگوں سے صدقات کی اپیل کر سکتی ھے ۔

لیکن اسلامی حکومت ، صدقات بھی بزور طاقت حاصل نہیں کر سکتی ۔

اس مقام پر میں یہ بات واضح کر دوں ، کہ مومن کی ایک شان قرآن کریم نے یہ بھی بیان کی ھے کہ وہ اپنے بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ھیں ۔

چنانچہ یہ ممکن ھی نہیں کہ ، ایمرجنسی کی صورتحال میں ، کوئی مومن اپنے بھائیوں کی امداد میں لیت و لعل سے کام لے ۔

لیکن اصولی بات یہ ھی ھے کہ حکومت ، صدقات کی اپیل کر سکتی ھے ۔ زبردستی وصول نہیں کر سکتی ۔

جو نظم آپ نے تحریر فرمائی ھے ۔ وہ صدقات سے متعلق ھے ۔

اور یہ عمر رض کی مرضی تھی کہ وہ اپنے گھر کا آدھا سامان لے آئے ۔
اور ابوبکر صدیق رض کی مرضی تھی کہ وہ سارے کا سارا لے آئے ۔

اس نظم کا انفاق سے کوئی تعلق نہیں ھے ۔

اگر انفاق کی وہ ھی تعریف ھے ، جس پر ھماری بحث چل رھی ھے ، تو پھر ، سیدنا عمر رض کے پاس ھزاروں دینار کا کیا جواز ھے ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

معاذاللہ، کیا سیدنا عمر فاروق رض ، اس آیت مبارکہ 2/219 کو ھمارے جتنا بھی نہیں سمجھتے تھے ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟ تتفکرو ۔

July 26 at 12:37am · Edited · Like · 3

برادر محترم آصف بھٹی صاحب ـــــ سلام و Mohammad Hanif رحمت

آپ کے نوٹ " انفاق فی سبیل اللہ " کو دوبارہ بغور پڑھا ـــــ اور وھاں موجود اپنے تبصرے کو بھی ـــــ اور میرے خیال میں میں اپنے اس تبصرے سے آج بھی متفق ھوں ـــــ میرے تبصرے کے جواب میں آپ نے لکھا ـــ " کہ آپ کے تبصرے نے میرے مضمون کی کمی دور کر دی " اس سے میں نے یہ تاثر لیا ، گویا کہ آپ میرے موقف سے متفق ھیں ـــــ اس لیے مزید کسی بات کی گنجائش ھی نہ تھی ـــــ

میں آج بھی اپنے اس موقف پر قائم ھوں کہ " انفاق " کا حکومت سے کوئی لینا دینا نہیں ھے ـــــ ارشاد باری تعالٰی ھے ـــــ

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ـــ 22/41

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے ـــ ترجمہ جناب مودودی صاحب

اسلامی حکومت کی حدود متعین ھیں ـــــ قرآن اپنے متبعین سے کوئی بات بزور تعزیر منوانے کا قائل نہیں ـ وہ افراد کی ایسی تربیت کرتا ھے کہ وہ اس پیمانے میں ڈھلتے چلے جاتے ھیں ، جو اس کا منشاء ھے ـــ اس ھی کا نام صبغت اللہ ھے ـــــ اللہ کے رنگ میں رنگ جانا ـــ

وہ مومنین سے ان کا مال چھین کر نہیں ـــــ بلکہ انہیں ان کے مال کا مالک تسلیم کرتے ھوئے ، اس مال کو وحی کی روح کے مطابق خرچ کرنے کی تربیت دیتا ھے ـــــ

البتہ آپ کے نوٹ کے ایک ابتدائی جملے پر آپ کی توجہ مرکوز کروانا چاھوں گا ـــــ جہاں آپ نے انسانی فلاح و بہبود کے کاموں کو " فی سبیل اللہ " کے زمرے میں شمار کیا ھے ـــــ
فی سبیل اللہ " بھی قرآنی اصطلاحات میں ایک مخصوص معنی و مفہوم کی اصطلاح ہے ـــــ جہاں تک میرا مطالعہ میری راھنمائی کر سکتا ھے ، میں یہ سمجھتا ھوں ، کہ " فی سبیل اللہ " کی اصطلاح اور انسانی فلاح و بہبود کے کام ، دو مختلف معنی و مفہوم ھیں ـــــ

اگر قرآن کریم کی کسی آیت یا آیات کے حوالے دے کر میری راھنمائی فرما دیں تو نوازش ھوگی ـــ جہاں اللہ کریم نے انسانی فلاح کے کام کو " فی سبیل اللہ " کہا ھو ـــــ

سلامت رھیں

Mohammad Hanif ــــــــــــ بہت خوب برادر یاور صاحب

لیکن اس کے لیے آپ کو وہ قرآنی حوالے دینے ہوں گے جو انفاق کو " فی سبیل اللہ " کے ساتھ مخصوص کرتے ہوں ــــــــ

ہمارے عقائد ، نظریات یا سوچیں اپنے آپ میں سند نہیں ہو سکتیں ــــــــ

ممکن ہے مجھ سے سہو ہو رہا ہو ــــــ لیکن اس کے لیے مجھے قرآنی راھنمائی کی ضرورت ہوگی ــــــــ

جہاں تک میرا تصور انفاق ہے ــــــ یہ ایک وسیع المعنی لفظ ہے ــ جس کا سیدھا سا مفہوم " کھلا رکھنا " ہے ــــــــ

اب " کھلا رکھنا " کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ میں اپنی کوئی شے جا کر چوراہے میں رکھ دوں ــ

اس کا درست مفہوم میرے نکتہ نظر کے مطابق ــ آسانی سے دستیاب ہونا ــــــ ہے ۔

یعنی اگر اللہ کریم نے مجھے کسی نعمت سے نوازہ ہے ــ تو میرا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ میں بھی اس سے مستفید ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے فیض یاب کروں ــــــــ

اس کی ایک مثال دیتا ہوں ــ

میرے پاس ایک جنریٹر ہے ــ جس سے میں اور میرے بچے فائدہ حاصل کرتے ہیں ــ

اور میرے جنریٹر میں اتنی گنجائش ہے کہ میں اپنے پڑوسی کو بھی لائٹ دے دوں ــــــــ

اب میں اس پڑوسی کو لائٹ دے دیتا ہوں کہ وہ بھی اس نعمت سے فائدہ حاصل کرے ــــــــــ

اب اس کا مطلب یہ تو ھرگز نہیں ھے کہ دوسرے دن میرا وہ پڑوسی میرے جنریٹر پر اپنے حق ملکیت کا اعلان کر دے ــ کہ جناب اب چونکہ آپ نے مجھے لاٹٹ دے کر انفاق کیا ھے تو اس کا مطلب ھے کہ یہ جنریٹر میرا ھوا ــــــــ

میرے نزدیک انفاق کا معنی کسی بھی نعمت خداوندی کو اپنی ذات تک محدود نہ کرنا ھے ــــــ

بلکہ اس سے جہاں تک ھو سکے دوسروں کو بھی مستفید کرنا ھے ــــــــ

لیکن اس عمل میں ، وہ انسان اپنی اس نعمت خداوندی کے حق ملکیت سے ھرگز خارج نہیں ھو جاتا ــــــ

اور نہ ھی کوئی کسی کو زبردستی انفاق پر مجبور کر سکتا ــــــ نہ کوئی فرد ، نہ گروہ اور نہ ریاست ــــــــ

ایسا کرنا قرآن کریم کے اس مستقل قانون کی خلاف ورزی ھوگی جس میں ھر انسان کو اس کے عمل کے نفع اور نقصان کا ذمہ دار قرار دیا گیا ھے ــــــــ

جب میرے غلط اعمال کی سزا میں کوئی دوسرا شریک نہیں ھو سکتا ــــــــ

تو میرے اچھے عمل کے صلے میں کوئی کیسے زبردستی شریک ھو سکتا ھے ؟؟؟؟؟؟؟؟؟

سلامت رھیں

Mohammad Hanif ایک صورتحال یہ ھے کہ میں ایک فیکٹری کا مالک ھوں ۔ میں نے سو افراد کو روزگار مہیا کیا ھوا ھے ـــــ میں اس فیکٹری سے لاکھوں روپے ماھانہ کماتا ھوں ـــــ اب سوال یہ ھے کہ میری ضرورت سے زائد رقم جو میرے پاس ھر روز جمع ھو رھی ھے میں اس کا کیا کروں ـــــ

اس کے دو طریقے ھیں ـــــ ایک یہ کہ میں یہ زائد رقم ، سونے کی شکل میں تبدیل کر کے لاکر میں بند کر دوں ـــ سینکڑوں ایکڑ زمین خرید کے ، اسے آباد نہ کروں ـــــ یا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کروں کہ زائد رقم ایک جگہ منجمد ھو جائے ـــــــــ

اللہ کریم نے اس کی ممانعت فرمائی ھے ـــ وہ کہتا ھے کہ ایک طرف تم اپنے مال میں سے حکومت کے مقرر کردہ شرح کے مطابق ، زکوٰۃ حکومت کے پاس جمع کروا دو ـــــــ تو دوسری طرف تم اس زائد از ضرورت مال کو ، مزید ایسے منصوبوں میں لگا دو ، جو مزید روزگار کے مواقع پیدا کرے ـــــ تا کہ کوئی بھی انسان بے روزگار نہ رہ جائے ـــ

وہ رب انسان کو بھکاری ھرگز بنانا نہیں چاھتا ـــــ کہ ھم اپنا مال حکومت کو دے دیں ، اور حکومت ان غریبوں کی روٹی کا بندوبست کرے ۔ ھرگز نہیں ـــــــ خدا اپنے بندوں کی تذلیل ھرگز نہیں چاھتا ـــــ

وہ بھوکے کو کھانا کھلانے کی بات نہیں کرتا بلکہ بھوک مٹانے کی بات کرتا ھے ۔

وہ کہتا ھے کہ تم کچھ ایسا کرو ، کہ ھر انسان اپنی ضرورت کو احسن طریقے سے خود ھی پورا کر سکے ۔

وہ کہتا ھے کہ تم اپنی زائد صلاحیتوں کے محاصل کو ایک جگہ منجمد کر کے اسے متعفن نہ کرو بلکہ اسے معاشرے کی فلاح کے لیے کھلا رکھو ـــ یعنی اسے اس معاشرے میں ایسے منصوبوں میں لگاتے چلے جاو ، جس کے نتیجہ میں ، ریاست میں کوئی بے روزگار نہ رھے ۔ ھر کسی کو اپنے ھاتھوں کی کمائی ملے ۔

اور اس ھی مقام پر یہ بھی واضح کر دوں کہ ، یہ ھی وہ طریقہ ھوگا ، جب وسائل روزگار اتنے وسیع ھوں گے کہ کوئی شخص آپ کو "انڈر ویج " کر ھی نہیں سکے گا ـــــــ

آپ غور فرمائیں کیا ھوتا ھے آج ـــ

یک نوکری کے لیے سینکڑوں افراد لائن لگا کر کھڑے ھوتے ھیں ـــ اس کے نتیجہ میں سرمایہ دار اپنی مرضی کی اجرت مقرر کرتا ھے ـــ وہ کہتا ھے کہ اگر تم نے پانچ ھزار میں کام کرنا ھے تو ٹھیک ورنہ میں کسی اور کو رکھ لیتا ھوں ۔ اور وہ انسان یہ سوچ کر پانچ ھزار میں لگ جاتا ھے کہ چلو ، دو وقت کی نہ سہی ، ایک وقت کی روٹی تو مل جائے گی ـــــــ

اب ذرا سوچیں ، کہ دس افراد ھوں ، اور سو ملازمتیں ھوں ، تو کیا ھوگا ؟؟ یہ مزدور اپنی مرضی کی تنخواہ مانگے گا ـــــ اور آجر اس مزدور کے مطالبے کے مطاق اجرت دینے پر مجبور ھوگا ـــــــــ

یہ ھے میرے بھائی انفاق کا درست مفہوم ـــــــــ اس میں کسی کی کمائی بزور بازو یا تعزیر کے ھتھیانے کا کوئی تصور نہیں ھے ـ مومن اپنی کمائی کا مالک ھوگا ـــــ لیکن وہ اس مال کو ایک جگہ منجمد ھرگز نہیں کرے گا ـــ بلکہ وہ اپنی زائد از ضرورت کمائی کو ، معاشرے کی فلاح کے منصوبوں میں لگاتا چلا جائے گا ـــــــ اب یہ کام انفرادی طور پر بھی کیا جاسکتا ھے اور اجتماعی سطح پر بھی ـــــــ یہاں کوئی جبر نہیں ـ ھوگا ـــــ

اور یہ ھی اس قانون خداوندی کا تقاضہ ھے ـــفرمایا ـ

مَّنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا
ـــــ 17/15

جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے لئے اختیار کرتا ہے۔ اور جو گمراہ ہوتا ہے گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے ـ ترجمہ جناب جالندھری صاحب

یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا ، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ـ ھرگز نہیں ـــــ ما سوائے ان معذوروں کے کہ جو اپنے ھاتھوں سے اپنا رزق حاصل کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ھوں ـــــ ھر شخص اپنے ھاتھوں کی کمائی کھائے گا ـــ نہ کسی سے انفرادی طور پر بھیک لے گا اور نہ ھی ریاست سے اجتماعی طور پر ـــ

سلامت رھیں

ان کمنٹس سے انفاق فی سبیل اللہ کے فریضہ کے متعلق حنیف صاحب کا موقف کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ان کے مطابق:

(1) انسان کو اس کی ملکیت سے دستبردار کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ جو کچھ ایک فرد کماتا ہے، وہ سب اسی کی محنت کی کمائی ہے، پس اس کی ملکیت ہے۔اس کمائی سے حکومت اس سے قانونی طور پر مقررہ شرح کے مطابق زکوٰۃ تو وصول کر سکتی ہے، لیکن اس کے علاوہ کوئی بھی چیز اس سے بزور طاقت وصول نہیں کی جا سکتی نہ وہ فرد کسی کو دینے کا پابند ہے۔ہاں صدقات وعطیات کی بات اور ہے۔وہ اپنی مرضی یا حالات کے مطابق جس قدر چاہے، از خود دے سکتا ہے۔اور اسی طرح انفاق کے فریضہ کی ادائیگی بھی فرد کی اپنی صوابدید پر ہے۔اب یہ انفاق ہوتا کیا ہے؟

(2) انفاق ایک ایسا فریضہ ہے جس کے تحت ایک صاحب استطاعت اپنی زائد آمدن کو پوٹلی میں باندھ کر محفوظ کر لینے کی بجائے اسے ''کھلا رکھتا ہے''۔اس کھلا رکھنے سے مراد ان کے مطابق یہ نہیں کہ مال نقد سارے کا سارا ضرورتمندوں کو دے ڈالو۔ بلکہ ان کے نزدیک کھلا رکھنے کا معنی یہ ہے کہ یہ اضافی مال بھی ملکیت تو آپ ہی کی ہے۔لیکن آپ اس مال کو کچھ یوں استعمال کرنے کے مجاز ہیں جس سے اس مال سے حاصل ہونے والے فوائد میں دوسروں کو بھی شریک کیا جا سکے۔مثلاً اس مال سے لوگوں کے روزگار کا بندوبست کیا جائے۔اس سے فیکٹریاں، کارخانے لگائے جائیں، سکول، کالج کھولے جائیں، سی این جی اور پٹرول پمپ بنائے جائیں، شاپنگ مارٹ تعمیر کیے جائیں۔ایسا کرنے سے لوگوں کو روزگار ملے گا اور لوگ از خود کمائیں گے۔اس سے مزید آمدنی پیدا ہوگی، اس آمدنی سے آپ ایسے مزید وسائل پیدا کریں گے۔اور مزید لوگوں کو روزگار ملے گا۔اور پھر پہلے سے بھی زیادہ آمدن ہونے لگے گی۔اور اس سے پھر آپ مزید سرمایہ کاری کریں گے۔اور یہ سلسلہ لامحدود حد تک چلتا جائے گا۔زیادہ سے زیادہ لوگ برسرِ روزگار ہوتے جائیں گے اور اپنا رزق خود کمانے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ ہے ان کے نزدیک انفاق کا درست مفہوم۔یعنی انفاق سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ اپنا زائد روپیہ ضرورتمندوں کے حوالے کر دو۔ بلکہ انفاق سے مراد لوگوں کو اپنی ملکیت کے فوائد میں شریک کرنا ہے۔ پیداواری منصوبوں میں اضافہ کرتے جانا ہے جن سے افرادی قوت کی مانگ میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوتے چلے جائیں۔

اس کے علاوہ حنیف صاحب کے نزدیک انفاق صرف یہی نہیں۔ایک سائنسدان کا اپنی تحقیق یا ایجاد کے ثمرات دوسروں تک پہنچانا، ایک معلم کا طلباء کو علم دینا، ایک طاقتور کا کمزوروں کی حفاظت کرنا اور اپنے جنریٹر سے ہمسائے کو بجلی کا کنکشن دینا، پانی

مانگنے آنے والے کو پانی دینا بھی انفاق کہلاتا ہے۔

اسی طرح ایک ٹیکنالوجی جو ایک فرد واحد یا ٹیم ایجاد کرے، اور پھر اس کا استعمال دنیا بھر میں پھیل جائے، وہ بھی انفاق کہلاتا ہے، مثلاً انٹرنیٹ یا فیس بک جسے ایک گروہ نے ایجاد کیا، لیکن اس کا استعمال دنیا بھر میں عام ہوگیا۔ اب وہ فرد یا موجد اپنی ملکیت سے تو محروم نہیں ہوا، لیکن اس نے خود بھی اسے ایجاد کر کے فائدہ اٹھایا اور دوسرے لوگ بھی مستفید ہوئے۔

مزید فرماتے ہیں کہ یہ سب کام ایک فرد انفرادی طور پر سرانجام دے گا۔ حکومت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ نہ اسے ایسا کرنے کا کوئی اختیار ہے۔ انفاق ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مال کو دوسروں کو دینے کی بجائے یوں استعمال رہے کہ وہ ملکیت آپ ہی کی رہے، لیکن اس کے فوائد میں دوسرے لوگ بھی شامل ہوں۔ لیکن کسی صورت انفاق کا مطلب خرچ کر دینا نہیں۔ کہ مال آپ کے ہاتھ سے چلا جائے۔

(3) حنیف صاحب کے نزدیک انفاق صرف مومن ہی نہیں کرتا۔ یہ کائنات کی ہر چیز کر رہی ہے۔ اللہ میاں بھی انفاق کرتا ہے۔ کافر بھی کرتا ہے۔ ایک کسان بھی زمین میں بیج بوتا ہے تو وہ بھی انفاق کر رہا ہوتا ہے۔

(4) سورہ البقرہ میں انفاق سے متعلق ایک آیت مبارکہ کچھ یوں ہے۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (سورہ البقرہ۔ آیت 219)

حنیف صاحب کے مطابق اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ اپنی محنت کی کمائی ساری کی ساری دوسروں کو دے دو۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرے گا اس سے بزور قوت لیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اپنی زائد کمائی سے کیا انفاق کریں؟ انہیں کہہ دو کہ جو بھی ضرورت سے زائد ہو (اس کی سرمایہ کاری کرو۔ لوگوں کو روزگار دینے کے لیے کارخانے فیکٹریاں اور دیگر پیداواری وسائل وجود میں لاؤ)۔

انفاق کا قرآنی مفہوم

قرآن کریم کی رو سے حنیف صاحب کا تصور انفاق سرے سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس کی جو بنیاد وہ پیش کرتے ہیں (ملکیت اپنے پاس رکھ کر اس کے فوائد میں دوسروں کو شریک کرنا، یعنی روزگار دینا)، سرے سے ہی انفاق کے مفہوم سے متصادم ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔

انفاق کے لغوی معنی:

انفاق لفظ ''نفق'' سے ماخوذ ہے۔نفق سے مراد ایک ایسی سرنگ یا ایک ایسا پائپ ہے جس کے دونوں دہانے کھلے ہوں۔البتہ جس سرنگ میں نکلنے کا راستہ نہ ہو،اسے ''سرب'' کہتے ہیں لیکن جس سرنگ میں آنے جانے کے دونوں دہانے کھلے ہوں،وہ نفق کہلاتی ہے۔اسی طرح جنگلی چوہے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ ایسا بھی ہوتا ہے جس پہ وہ مٹی کی ہلکی سی پرت چڑھائے رکھتا ہے،اور جیسے ہی دشمن بل میں گھس کر اسکا شکار کرنے کی کوشش کرے،چوہا اس سوراخ کی پرت سر سے اتار کر کھول کر بھاگ جاتا ہے۔یہ سوراخ بھی نفق کہلاتا ہے۔اسی طرح منافق کو بھی منافق اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک راستے سے دین میں آتا ہے اور دوسرے راستے سے نکل جاتا ہے۔اسی طرح ایک لفظ ہے ''نفقت السوق''۔بازار میں تجارت کی غرض سے مال آتا اور نکلتا رہتا ہے۔اسی لیے یہ لفظ اس معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

لغت تاج کی رو سے انفاق کے معنی ہیں اپنی دولت (جسکا انفاق مقصود ہو) کو کھلا رکھنا، عام کر دینا، باقی نہ رہنے دینا۔ختم کر دینا۔یعنی اسے روکے نہ رکھنا۔اسی لیے قرآن نے اس کے مقابل ایک لفظ ''امساک'' (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 100) لا کر انفاق کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔چونکہ روپے پیسے کو کھلا رکھنے کا نتیجہ دولت کی ارتکاز کی بجائے سرمایہ کا ہاتھ سے نکل جانا، ختم ہو جانا ہوتا ہے، یعنی جب انسان انفاق کرتا ہے تو وہ دولت (زائد از ضرورت) اس کے پاس باقی نہیں رہتی، ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے ضرورتمندوں تک پہنچ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انفاق کے معانی کسی چیز کے کم یا ختم ہو جانا بھی لیے جانے لگے۔یہاں تک کہ اس مفہوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی کہ انفاق سے کوئی چیز کم یا ختم ہو جاتی ہے۔چنانچہ ''انفقت الابل'' کی اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب اونٹ کی کھال موٹاپے کی وجہ سے جھڑ جائے۔یعنی منتشر اور پراگندہ ہو کر ختم ہو جائے۔

قرآن کریم میں انفاق کے بنیادی معانی اپنی محنت سے حاصل شدہ کمائی کو مفادِ عامہ کے لیے عام کر دینے کے ہیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (سورہ البقرہ۔آیت 219)

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا انفاق کریں (یعنی کس قدر مال و دولت پرورشِ عامہ کے لیے دیں؟)۔کہہ دو کہ جو کچھ تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔

یعنی فاضلہ دولت جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے، ساری کی ساری پرورشِ عامہ کے لیے وقف ہونی چاہیے۔یہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔

یہ قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہے جس پر آگے چل کر مزید دلائل دیے جائیں گے کہ کیسے انفاق اپنی زائد دولت کو اپنے ہاتھ سے نکال دینے کا نام ہے۔ایک مومن کی فاضلہ دولت ہر دم انسانیت کے لیے کھلی رہتی ہے۔اور یہ فاضلہ دولت نظام ریاست کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہر شہری اس میں اپنی اپنی محنت سے کمائی ہوئی زائد دولت ڈالتا جاتا ہے اور ریاست اسے ہر شہری کی مساوی نشوونما و پرورش کے لیے وقف کرتی جاتی ہے۔ چونکہ نظامِ خداوندی میں ہر فرد کی تمام ضروریات زندگی کی ذمہ داری خود ریاست پر ہوتی ہے،اس لیے کسی فرد کو کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔نہ ہی اسے اپنی اولاد یا اپنے مستقبل سے متعلق کوئی خدشات درپیش ہوتے ہیں۔ یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ اس ضابطہ حیات کے تحت قائم ہوتا ہے جس کے متعلق پچھلے ابواب میں میں سیر حاصل گفتگو کر چکا ہوں۔

مزید یہ کہ انفاق کے لغوی معنی خرچ کرنے کی بجائے کھلا رکھنا اس کے مفہوم کو مزید واضح کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ''کھلا رکھنے'' کا مطب ہے بنی نوع انسان کی پرورش ونشوونما کے لیے مال کا نظام خداوندی کی تحویل میں رہنا۔(نہ کہ انفرادی طور پر کھلا رکھنا)۔تاہم بعض مقامات پر اس کے معنی خرچ کرنا بھی آتے ہیں جہاں عزیز،رشتہ دار،مساکین،ضرورتمند و نادار لوگوں پر (انفاق) خرچ کرنے کی بات کی گئی ہے۔

حنیف صاحب کے مفہوم کا قرآنی تعلیمات سے تصادم

جیسا کہ میں نے حنیف صاحب کے کمنٹس سے واضح کیا کہ:

ان کے نزدیک انفاق کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں،یہ ایک فرد کی اپنی صوابدید پر ہے۔

سورہ البقرہ کی آیت نمبر 219 کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی کمائی پر مجموعی طور پر حقِ ملکیت رکھتا ہے۔اور اس میں سے بقدر ضرورت رکھ سکتا ہے اور باقی جو زائد از ضرورت ہو،اس سے کچھ اس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ دوسروں کو روزگار ملے،وہ اس سے فائدہ اٹھائیں،لیکن وہ چیز ملکیت اسی کی رہے جو انفاق کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ زائد از ضرورت بھی آپ ہی کی ملکیت ہے جسکی آپ سرمایہ کاری کر سکتے ہیں اور لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کر سکتے ہیں۔

اب میری جانب سے پیش کردہ قرآنی مفہومِ انفاق کو دوبارہ پڑھیے اور پھر حنیف صاحب کی جانب سے پیش کردہ تصور کا اس سے موازنہ کیجیے۔آپ کو معلوم ہوگا کہ حنیف صاحب کی جانب سے پیش کردہ تصورِ انفاق بنیادی طور پر ہی غلط اور خلافِ قرآن ہے۔قرآن کریم کے تصور معیشت اور انفاق کی نفی ہے۔

یہ کھلا رکھنا سے یہ مراد لیتے ہیں کہ وہ چیز ملکیت تو آپ ہی کی رہے، لیکن اس کے فوائد یا اس سے مزید پیداوار میں دوسرے بھی شریک ہوسکیں۔

جیسا کہ میں نے انفاق کے لغوی مفہوم کے تحت لغت سے واضح کیا کہ انفاق نام ہی ایسے کام کا ہے جس میں آپ کے پاس موجود فاضل دولت جس کا انفاق مقصود ہے، ختم ہوجاتی ہے۔ ریاست کی تحویل میں چلی جاتی ہے جس سے پھر ضرورتمندوں اور محروموں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ آپ کے پاس تو کچھ باقی بچتا ہی نہیں۔ یعنی انفاق سے چیز ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ دولت ختم ہوجاتی ہے، کم ہوجاتی ہے۔ اس کا معنیٰ ''اپنی ملکیت میں رکھ کر دوسروں کو فائدہ میں شریک کرنا'' تو ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اس طرح انفاق کا بنیادی مفہوم (ختم ہوجانا) ہی مسخ ہوجاتا ہے۔ جب آپ فاضل دولت سے سرمایہ کاری کرتے ہیں تو آپ کو گھر بیٹھے لوگوں کی محنت کی کمائی سے صرف سرمایہ کے بل بوتے پر آمدن ملنے لگتی ہے۔ اور پھر آپ کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، پھر آپ مزید منصوبے لگاتے ہیں جہاں مزید لوگ کام کرکے اپنی محنت کی کمائی آپ کے سرمایہ کی شمولیت کی وجہ سے آپ کو دیتے چلے جاتے ہیں۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور آپ کی دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ تو اس طرح تو دولت کا ارتکاز ہو رہا ہے۔ آپ کا انفاق تو آپکی فاضل دولت کو ختم کرنے کی بجائے مزید بڑھاتا جارہا ہے۔ اس لیے حنیف صاحب کے اس تصور کی بنیاد ہی غلط ہے۔ ان کے تصور کو سرمایہ داری بلکہ یہودی سرمایہ داری کا نام دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے جس میں دولت چند ہاتھوں میں صرف سرمایہ کے بل بوتے پر منصوبے لگانے سے سمٹتی چلی جاتی ہے۔ قرآنی انفاق کو اس سے منسوب کرنا خطرناک تحریف قرآن ہے جو فاضلہ دولت کو فرد سے لے کر ملت کی تحویل میں دینے کی بات کرتا ہے۔

سورہ البقرہ میں تو صرف ایک اصولی حکم دیا گیا، لیکن آگے جا کر اس حکم کی اللہ نے خود وضاحت بھی فرمادی کہ زائد از ضرورت (عفو) مال دوسرے ضرورتمندوں کے لیے دیا جائے۔ اس اصولی حکم کے علاوہ خود قرآنی حکومت سے کہا گیا کہ وہ زائد از ضرورت مال خود وصول کرکے اسے مناسب مقامات پر حسبِ ضرورت خرچ کرے۔

قارئین توجہ دیجیے گا۔

خُذِ الْعَفْوَ (سورہ الاعراف۔ آیت 199)

اے رسول، ان سے زائد از ضرورت لو۔ وصول کرو

مزید برآں فتح الباری شرح بخاری میں حافظ ابن حجر عسقلانی سورہ اعراف کی اس آیت کی تفسیر میں متعلق لکھتے ہیں کہ:

''بعض علماء نے اس کے معنیٰ ''خز من عفا لك من اموالهم اى ما فضل '' کیے ہیں، یعنی وہ مال جو ضرورت سے زائد ہو، لے لو۔ اور یہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل کا حکم ہے۔'' (فتح الباری شرح بخاری۔ جلد 8، صفحہ 305، مطبوعہ شاہ فہد کمپلیکس)

بعض علماء کرام نے اس کا مطلب ''درگزر کرنا'' بھی کیا ہے، لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔ کیونکہ لفظ ''خذ'' کا لغوی معنی ہی لینا، وصول کرنا (To receive) ہے۔ جیسے سورہ حشر آیت 7 میں حکم ہے کہ ''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوه'' ۔ اسے درگزر کے مفہوم میں لینا غلط ہے۔ یہ مادی طور پر کچھ لینے کے معانی میں آئے گا۔

یہی حقیقت سورہ انفال میں ان الفاظ میں بیان کی گئی کہ:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ (سورہ انفال۔ آیت 1)

اے رسول وہ تجھ سے زائد از ضرورت مال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اسے ''اللہ و رسول'' (مرکزی اتھارٹی) کی تحویل میں رہنا چاہیے۔

کیا ان واضح آیات کی روشنی میں حنیف صاحب کے اس نظریہ کہ ''انفاق کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں'' کو تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے ہاں عموماً انفال کا ترجمہ مترجمین ''مال غنیمت'' کرتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اول تو اللہ نے اموال غنیمت کے لیے قرآن میں ''غنم، غنائم'' وغیرہ جیسے الفاظ الگ الگ استعمال کیے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مال غنیمت کے متعلق کہا ہے کہ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ و رسول (قرآنی ریاست) کے لیے ہوگا اور باقی 4/5 حصہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائیگا (سورہ انفال۔ آیت 41)۔ لہٰذا انفال کو مال غنیمت کہنا غلط ہے۔ لفظ ''انفال'' نفل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں زائد۔ جیسے ہمارے ہاں نمازوں میں فرائض کے بعد نوافل ادا کیے جاتے ہیں۔

مفہوم کے اعتبار سے اس زائد از ضرورت مال (انفال) کی مختلف اقسام ہو سکتی ہیں مثلاً:

(1) ہمارے ہاں انکم ٹیکس حکومت کے واجبات میں سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ ٹیکس جس کی ادائیگی واجب ہے۔ اگر کوئی شخص انکم ٹیکس کے علاوہ ضروری امور کے لیے حکومت کو کچھ عطیہ دیتا ہے تو یہ ''انفال'' کی کیٹیگری میں داخل ہوگا۔ یعنی واجبات سے زائد۔ اسی کو صدقات کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

(2) انتظامی نکتہ نگاہ سے مرکزی حکومت مقامی حکومتوں کو اجازت دے کہ وہ اس قسم کی آمدنی از خود وصول کر کے اس میں سے

اپنے اخراجات پورے کیا کریں۔اگر ایسا ہو کہ بعض اوقات کسی جگہ اخراجات پورے ہونے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جائے تو یہ انفال (زئد از ضرورت) ہوگا۔اسے پھر ریاستی مرکز کی جانب منتقل کر دیا جائیگا۔

(3) تیسری قسم ''العفو'' ہے۔یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد افرادِ ملت کے پاس کچھ بچ رہے۔فرمایا کہ یہ زائد از ضرورت مال حکومت کی تحویل میں جانا چاہیے۔

اب ظاہر ہے کہ جب زائد از ضرورت مال کسی کے پاس ہی نہیں رہے گا تو نہ تو ارتکازِ دولت کی کوئی گنجائش نکلے گی نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا ہوگا۔ویسے بھی یہ بات لوجیکل ہے کہ جب ہر شخص اور اس کے کنبے کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری قرآنی ریاست نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے تو پھر دولت کس لیے جمع کی جائیگی؟ یہی بنیادی وجہ ہے جو قرآن میں دولت جمع کرنے کے خلاف سخت تاکیدی اور وعیدی احکامات دئے گئے ہیں۔

اب حنیف صاحب نے انفاق سے جو یہ مراد لی ہے کہ زائد دولت سے آپ سرمایہ کاری کر کے ایسے منصوبے لگائیں جن سے افرادی قوت کی مانگ میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور انسانوں کو روزگار ملے۔تو پہلی بات تو یہ کہ یہ کام صرف حکومت کے کرنے کا ہے، نہ کہ آپ کا انفرادی فریضہ۔اپنی ملکیت میں دوسروں کو مستفید کرنے یا مفادِ عامہ کی اشیاء بنانے کے لیے عربی میں انفاق نہیں بلکہ دوسری اصطلاحات موجود ہیں جیسے منفعت، تمتع وغیرہ۔لیکن انفاق کا یہ مفہوم عربی لغت کی رو سے ثابت ہی نہیں کیا جا سکتا۔

پھر جو انفاق آپ کر رہے ہیں، سرمایہ کاری کے ذریعہ نئے کاروباری منصوبے لگا کر۔اس سے تو آپکی دولت کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہے۔تو یہ کیسا انفاق ہے جو آپ کو تو روز بروز مالدار بناتا چلا جا رہا ہے، آپ کی فاضلہ دولت میں اضافہ کرتا جا رہا ہے جو آپ گھر بیٹھے وصول کر رہے ہیں اور آپ کے ماتحتوں کی حالت ویسی کی ویسی ہی ہے۔کیا انفاق کی ایسی تشریح کرنا قرآن کے اس عظیم الشان حکم میں خطرناک تحریف نہیں؟ کیا منافع کی نیت سے کی جانیوالی یہودی سرمایہ کاری کو کسی صورت بھی قرآنی انفاق کا نام دیا جا سکتا ہے جس سے دولت آپ کے ہاتھ سے نکل کر ریاستی تحویل اور پھر وہاں سے ضرورتمندوں کو پہنچ جاتی ہے؟ایک مثال سے واضح کرنا چاہوں گا کہ حنیف صاحب کا تصورِ انفاق کس قدر خطرناک معاشی نتائج پیدا کرتا اور معاشرہ میں امیر اور غریب کے درمیان حائل خلیج مزید وسیع کرتا چلا جاتا ہے۔میں نے یہ سوال حنیف صاحب سے متعدد مقامات پر کیا، لیکن وہ اس کا جواب کہیں نہیں دے پائے۔بلکہ ایک پوسٹ پر تو انہوں نے از خود اسکا

جواب دینے سے صاف انکار کیا۔ حالانکہ وہ ایسے انسان ہیں کہ دوسروں کے ہر ایک نکتے کو پکڑتے اور ایک ایک شق کا جواب دیتے نظر آتے ہیں، لیکن یہ سوال جو بنیادی نوعیت کا حامل تھا، جس سے ان کے نظریہ انفاق کی بنیاد پر ہی کاری ضرب پڑ رہی تھی اور وہ غلط ثابت ہو رہے تھے، جواب دینے سے انکار کر دیا گیا۔

سوال یہ تھا کہ ''فرض کیجیے کہ آپ کے پاس ایک کروڑ روپیہ فاضلہ دولت ہے۔ اور اس رقم سے آپ اپنے تصورِ انفاق پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کو روزگار دینے کے لیے ایک کارخانہ یا چھوٹی موٹی کوئی فیکٹری لگاتے ہیں، اس فیکٹری میں آپ پچاس لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں۔ اور ان کی مختلف تنخواہیں ہیں۔ تیس مزدوروں کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے فی کس ماہانہ مقرر کی جاتی ہے جبکہ ان کے بیس مینیجرز کی ماہانہ تنخواہ بیس ہزار روپے مقرر کی جاتی ہے۔ یہ فیکٹری کام شروع کرتی ہے اور ایک سال بعد یہ فیکٹری تین کروڑ روپیہ آمدن پیدا کرتی ہے۔ جس میں سے مزدوروں اور دیگر ملازمین کی سالانہ تنخواہوں کی مد میں ایک کروڑ پانچ لاکھ روپے اور دیگر Maintenance اخراجات کی ادائیگی کے بعد آپ کو نیٹ پرافٹ کی مد میں ڈیڑھ کروڑ روپے منافع ہوتا ہے۔ آپ نے ایک کروڑ روپیہ لگا کر ایک سال بعد گھر بیٹھے ڈیڑھ کروڑ روپے کما لیے۔ آپ کا وہاں صرف سرمایہ شامل تھا۔ اور اس کے علاوہ صرف آپ وہاں مقرر کردہ یونٹ مینیجر سے کارکردگی رپورٹ لیتے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ نہ آپ نے کوئی صلاحیتیں استعمال کیں، نہ آپ نے وہاں کوئی محنت کی۔ دوسروں نے محنت کی، آپ نے صرف سرمایہ لگا کر انہیں فیکٹری بنا کر دی۔ اور ایک سال بعد آپ کے ان ملازمین (جنہیں آپ نے انفاق کے نام پر روزگار دیا) کی حالت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مزدور اور دیگر ملازمین جو تنخواہیں لیتے تھے، ان سے نہ جانے ان کی گھریلو ضروریات بھی پوری ہوتی تھیں یا نہیں، لیکن آپ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ آپ نے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو ابتدا میں ان کے ساتھ تنخواہ کی شکل میں طے شدہ تھا۔ اب ان کی ضرورت پوری ہوتی ہے یا نہیں، آپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ آپ گھر بیٹھے ایک کروڑ لگا کر ڈیڑھ کروڑ کے مالک بن گئے۔ یہ تھا حنیف صاحب کے انفاق سے پیدا ہونے والے نتائج۔ اب قرآن کی تعلیم پر غور کیجیے اور اس کا موازنہ حنیف صاحب کے تصور سے کیجیے۔ کیا کسی صورت بھی اسے قرآنی انفاق کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ یہودی سرمایہ کاری ہے جس کے ذریعے صرف سرمایہ سرمائے کو کما رہا ہے، اور آپ کی دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جبکہ انفاق کا مفہوم کہتا ہے کہ اس سے دولت ہاتھوں سے نکلتی ہے، واپس نہیں رہتی۔ لیکن حنیف صاحب اس کے برخلاف اس زائد دولت کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے اس سے سرمایہ کاری کے ذریعے مزید روپیہ کمانے کی نیت سے لوگوں کو

روزگار دیتے ہیں جس سے ان لوگوں کی ضروریات پوری ہوں یا نہ ہوں، انہیں ان کا منافع مل جاتا ہے۔یعنی اس تصور کے تحت بھی لوگوں سے صرف عدل ہو رہا ہے، احسان نہیں۔ان سے صرف کام لیا جا رہا ہے اور طے شدہ اماؤنٹ کے تحت معاوضہ دیا جا رہا ہے، ضرورتوں کو پورا نہیں کیا جا رہا۔کیا یہ انفاق ہے؟

پھر فرض کیجیے کہ آپ کی اس فیکٹری کا منافع اگلے سال مزید بڑھ کر ایک کروڑ کے قریب پہنچ گیا۔اس سے آپ نے ایسی ایک اور فیکٹری لگائی اور پھر اس سے بھی کروڑوں روپیہ منافع کی مد میں آپ کی جیب میں آنے لگ گیا۔تنخواہیں ملازمین کی وہاں بھی گزارے لائق ہی رہیں۔وہ بیچارے محنت سے خون پسینہ ایک کر کے کام کرتے رہے، اور ان کی محنت کی کمائی آپ گھر بیٹھے صرف فیکٹری مالک ہونے کی وجہ سے وصول کرتے رہے۔اور اسے انفاق کا نام دیتے رہے۔

ذرا سوچیے کہ ایسا ''انفاق'' دس سال بعد آپ کو کس پوزیشن پر لا کھڑا کرے گا؟ آپ کروڑ پتی سے ارب پتی بن جائیں گے۔ (یعنی جو فاضلہ دولت آپ کے ہاتھوں سے نکل کر ضرورتمندوں کے پاس جانی تھی، وہ آپ ہی کے پاس رہی)۔اور آپ کے ملازمین وہیں انہیں تنخواہوں پر کام کر رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ اس عرصہ میں ان کی انفرادی تنخواہوں میں دس پندرہ ہزار کا اضافہ کر دیا گیا ہوگا۔لیکن اس سے ان کی حالت کیسے سدھر سکتی ہے؟ ان کی تمام ضروریات زندگی پوری ہونے کی گارنٹی کیسے دی جا سکتی ہے؟ جب کہ ان کی محنت کی کمائی فیکٹری کے منافع کی شکل میں آپ بطور مالک ہڑپ کرتے جا رہے ہیں۔گھر بیٹھے۔یوں آپ کے اور آپ کے ملازمین کے درمیان معاشی خلیج مزید وسیع ہوتی چلی گئی۔

دراصل حنیف صاحب نے انفاق کا یہ جو تصور پیش کیا ہے، جو قرآنی انفاق ہونے کی بجائے یہودی سرمایہ کاری کو مشرف با قرآن کرنے کی مذموم کوشش ہے۔اس میں انفاق کرنے والے کا بنیادی محرک کیا ہوتا ہے؟ وہ کونسے عوامل ہیں جو اسے ایسا غیر قرآنی قدم (زائد دولت کو دے ڈالنے کی بجائے سرمایہ کاری میں لگانا) پر مجبور کرتے ہیں؟ وہ محرکات ہیں ''منافع کی امید''۔ہر سرمایہ دار سرمایہ کاری صرف منافع کے لالچ میں ہی کرتا ہے۔اس کے پیش نظر منفعتِ عامہ یا انسانی فلاح و بہبود جیسا کوئی خیال نہیں ہوتا۔انسانوں کو روزگار دینے کا بہانہ کرنا صرف ایک ڈھکوسلہ ہے۔ایک بہانہ ہے اپنے پیسے سے سرمایہ کاری کرنے کا۔پھر ستم یہ کہ حنیف صاحب کی طرف سے اس ''قارونی انفاق'' کی وجہ ''معاشرہ میں تعمیری نتائج پیدا کرنا'' بتائی گئی ہے۔اب جس طرح کے تعمیری نتائج اس تصور کے میں نے اپنی اس مثال سے واضح کیے، خود ہی دیکھ لیجیے۔یہ تعمیری کی بجائے تخریبی نتائج ہیں جو امیر کو امیر سے امیر تر اور غریب کو غریب سے غریب تر بناتے چلے جاتے ہیں۔

حنیف صاحب کے تصورِ انفاق کے ''تعمیری نتائج''۔

اس انفاق کی رو سے فیکٹریوں پر فیکٹریاں اور کارخانے کاروبار وغیرہ کھلتے چلے جاتے ہیں، شاپنگ مال، کاروباری پلازے، دوکانیں وغیرہ خرید خرید کر کرائے پر دی جاتی ہیں۔ اس سے ان کے نزدیک ''افرادی قوت'' میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر یہ مزید اثاثہ جات خریدتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ تمام ریاستی مشینری ایسے سرمایہ داروں کے کنٹرول یا ملکیت میں آجاتی ہے اور ملک ایک طرح سے اس طبقہ کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ جیسے آجکل دنیا یہودی سرمایہ داروں کی معاشی طور پر غلام بن چکی ہے۔

اگر سرمایہ دار کو انسانی مفاد اتنا ہی عزیز ہے تو پھر وہ صرف سرمایہ کے بل بوتے پر لگائی گئی فیکٹری کے منافع میں کیوں شریک ہوتا ہے جہاں اس نے کوئی بھی محنت سرانجام نہیں دی۔ بلکہ محنت دوسروں نے کی۔ کیا کوئی سرمایہ کار ایسا کر سکتا ہے کہ انفاق کے نام پر ایک فیکٹری لگا کر وہاں لوگوں کو روزگار دے اور تمام آمدن کا مالک ملازمین کو ہی بنا دے۔ خود کوئی منافع نہ لے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ یہ پھر قرآنی انفاق ہو جائیگا جہاں دولت ہاتھ سے نکل کر غریب ضرورتمند کے پاس چلی جاتی ہے۔ اور یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے حامل لوگوں کو منظور نہیں۔ کیونکہ اس طرح پھر ان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ سرمایہ داری کی یوں بنیاد ہی ختم ہو جائیگی۔ اس لیے بہتر سمجھا جاتا ہے کہ یہودی امریکی سرمایہ داری اور W-T-O کے کاروبار کو انفاق کا نام دے کر سرمایہ داری نظام کا ازسرِنو احیاء کیا جائے۔ چاہے اس کے لیے قرآن سے کوئی دلیل ملے یا نا۔

پھر اپنے اس تصورِ انفاق کی تائید میں مزید یہ فرماتے ہیں کہ:

Mohammad Hanif جن کے پاس مال کی فراوانی ھے وہ اپنا مال ایسے منصوبوں میں لگاتے چلے جائیں جس سے افرادی قوت کی مانگ بڑھتی چلی جائے ــ

اور اس سے مزید کمایی کا ذریعہ بنایا جائے حتی کہ تمام وسائل آپ کی ملکیت میں آجائیں اور تمام دنیا آپ کی غلام بن جائے۔ بلواسطہ یا بلا واسطہ

یعنی جب آپ کہیں کہ زائد از ضرورت مال ، بیت المال میں جمع کروا دو ــــ تب تو یہ مال جس نے کمایا ھے وہ بلکل حق حلال کا ھوا ــــــ کیونکہ وہ آپ کے نظریہ کے مطابق بیت المال کو جو دے رھا ھے ــ اور اگر وھی مال وہ اپنے پاس رکھ لے تو ، فساد ، سرمایہ دار ، نا جائز ھو جاتا ھے ــ

ذرا مجھے بتائیں ، آپ میرا جو مال زائد از ضرورت ھے وہ مجھ سے لے کر بیت المال میں جمع کروا رھے ھیں ــ تو اس صورت میں مجھ جیسے سرمایہ دار کا یہ مال ، جو بقول دوستوں کے ، استحجصال سے حاصل کیا گیا ھے ، وہ جائز کیسے ھو گیا ــ کیا کسی کا دو نمبر مال ، اللہ کو قبول ھے ــ جواب دلیل سے دیجئے گا ــــــ

اس سے ان کی نیت کھل کر سامنے آ گئی کہ یہ فالتو روپیہ بھی اپنے ہاتھ سے جاتا نہیں دیکھنا چاہتے، اسے بھی سرمایہ کاری کر کے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ تا کہ ارتکازِ دولت ہو سکے۔ فرماتے ہیں کہ ''اگر زائد از ضرورت مال بیت المال میں قرآنی ریاست کی تحویل میں جمع کرا دوں تو پھر تو وہ جائز ہو گیا، لیکن اگر اپنے پاس رکھوں تو اسے سرمایہ یا ناجائز مال کا نام دیا جاتا ہے۔ استحصال سے حاصل کیا گیا مال جائز کیسے ہو گیا؟ کیا اللہ کو ناجائز مال قبول ہے؟''

گزارش یہ ہے کہ آپ کو کس نے کہا کہ یہ مال جو آپ نے کمایا ہے ناجائز ہے؟ بے شک یہ آپ کی محنت کی کمائی ہے، مگر (جیسا کہ میں نے مضمون کے پہلے باب میں ملکیت کے عنوان کے تحت واضح کیا) اس میں آپ کی ذاتی محنت کمائی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو تفویض کردہ صلاحیتوں اور وسائل پیداوار وزمین کا حصہ ہے۔ اس میں آپ کا حصہ تو بہت کم ہے۔ زیادہ حصہ تو رب کائنات کا ہے۔ اس لیے آپ اس میں ''لیس للانسان الا ماسعیٰ'' کے اصول کے تحت صرف اپنی محنت کے بقدر رکھیں گے اور جو وسائل پیداوار اور سرمایہ کے ذریعے کمائی گئی آمدن ہو گی، وہ اللہ کی بتائی ہوئی تقسیم کے مطابق معاشرہ یا مرکزِ ملت کی تحویل میں دینے کے پابند ہونگے۔ تا کہ وہ پھر اس مال سے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کر سکے۔ (ملاحظہ کیجیے شہد کی مکھی کے متعلق باب)۔ اور بات صرف وسائلِ پیداوار یا زمین کی نہیں، انسان کے تو حواسِ خمسہ، دماغ، سانسیں، صلاحیتیں تک اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ پھر وہ کیسے کہتا ہے کہ میری محنت کی کمائی صرف میری ہے؟ اس لیے حنیف صاحب قرآنی حکم پر عمل کرتے ہوئے بیت المال کو سب کچھ دے ڈالنے کے حق میں اس لیے نہیں کہ یوں مال ہاتھ سے نکل جائیگا۔ اس لیے اس مال کو اپنے پاس رکھا جائے تا کہ اس سے سرمایہ کاری کے نام پر مزید مال کمانے کی سبیل نکالی جا سکے۔

اب جو شخص زائد از ضرورت مال اپنے پاس رکھے گا، وہ تو خود ہی سرمایہ و فساد ہو گیا۔ کیونکہ اس مال سے وہ مزید مال کمائے گا، سرمایہ کاری کرے گا۔ جس سے وہ مزید امیر ہوتا جائیگا۔ ایسا ہی اس جیسے دوسرے سرمایہ دار کریں گے اور یوں ملک کے تمام وسائل پر قابض اور اپنے ماتحتوں کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ تو یہ فساد نہیں تو کیا امنِ عامہ اور جنت ارضی کا فارمولا ہے؟ حنیف صاحب کی منطق بھی عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ''کیا کسی کا دو نمبر مال اللہ کو قبول ہے''۔؟ بھئی کون کہہ رہا ہے کہ دو نمبر

مال؟ یہاں اصطلاح تو ''فاضلہ دولت'' کی استعمال ہورہی ہے۔اورآپ خود ہی اسے 'دونمبر مال'' کا خطاب دے رہے ہیں۔یادرکھیے یہ مال چونکہ وسائلِ پیداوار،زمین،سرمایہ،انسانی صلاحیتوں،دماغی قوتوں سے کمایا گیا ہے اس لیے اس کی تقسیم بھی اللہ کی ہی مرضی سے ہوگی۔''لیس للا نسان الا ماسعیٰ'' انسان کے لیے صرف اس قدر جائز ہے جو اس نے محنت کر کے کمایا۔باقی جو وسائل پیداوار،زمین اورسرمایہ کی آمدن ہوگی،وہ اگرتو آپ بذریعہ انفاق مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں تو پھر تو جائز ہے۔کیونکہ اللہ کا مال اللہ (قرآنی ریاست) کے پاس پہنچ گیا،جہاں سے یہ مال اگلے مرحلے میں ضرورتمندوں اورمحروموں کو ملے گا۔لیکن اگر یہ مال آپ نے اللہ کے نظام کی تحویل میں دینے کی بجائے اپنے پاس رکھ لیا تو پھر ظاہری بات ہے کہ یہ آپ کے لیے ناجائز کہلائے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ (دوسروں کو دے کر اپنے ہاتھ سے نکال دینا) کی مزید وضاحت کے لیے کچھ آیاتِ قرآنی

انفاق فی سبیل اللہ کی مزید وضاحت کے لیے کچھ آیاتِ قرآنی پیش کرنا چاہوں گا جس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائیگی کہ انفاق سے مرادسرمایہ کاری اوراثاثوں کی ملکیت اپنے پاس رکھ کر دوسروں کو روزگار دینا نہیں بلکہ دوسرے ضرورتمند اور محروم افراد کے لیے اپنی فاضلہ آمدنی نظام کو دے کر انکی معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنا اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دینا ہے اورایسے لوگوں کی مستقل کفالت اوریاستی سطح پران کے روزگار کے انتظام کے لیے فاضلہ دولت قرآنی حکومت کی تحویل میں دے دینا ہے۔تاکہ وہ خود اپنے طور پر افرادِ معاشرہ کی پرورش ونشوونما کا انتظام کرے۔تاکہ روزگار کے بہانے کوئی انسان کسی انسان کو اپنا غلام نہ بنا سکے نہ ہی کسی فرد واحد سے لیتے ہوئے کوئی ذلت محسوس کرے۔قرآن ان دونوں کے بیچ ریاست کو ایک بنیادی میڈیم کے طور پر لاتا ہے۔تاکہ ہر شخص ریاست ہی کا ملازم ہو اوراس ملازمت کے تحت اپنے فرائض منصبی (صلوٰۃ) انجام دے کر حکومت سے معاوضہ پائے۔نہ کہ افراد سے۔ملاحظہ فرمائیں:

وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ فَلأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلاَّ ابْتِغَاء وَجْهِ اللّهِ وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 272)

اپنے مال و دولت میں سے جو کچھ تم مفادِ عامہ کے لیے دیتے ہو،دراصل وہ تمہاری اپنی ہی ذات کے لیے ہوتا ہے۔اس سے تمہاری اپنی ذات کی ہی نشوونما ہوتی ہے۔بشرطیکہ جو کچھ بھی تم اس مد میں دیتے ہو،اس کا جذبہ محرکہ اللہ کے قانون کے تحت نظام کی تشکیل ہو۔یوں جو کچھ تم دو گے،اس نظام کے قیام کے بعد وہ سب تمہاری اجتماعی فلاح پر خرچ ہوگا،اس میں تمہاری ذرہ برابر بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔

قارئین غور کیجیے۔ کیسے اللہ تعالیٰ انفاق پر عمل کرتے ہوئے فاضلہ دولت نظامِ معاشرہ کو دے دینے کی تاکید کرتے ہوئے مومنین کو حوصلہ دے رہا ہے کہ تم یہ مت سمجھنا کہ یہ پیسہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہرگز نہیں۔ جو کچھ تم نے دیا ہے، اس سے ''دینے کے اصول'' کے تحت تمہاری اپنی ذات کی نشوونما ہی ہوئی ہے۔ بشرطیکہ تمہارا انفاق کا مقصد ایک فلاحی نظام کی تشکیل بمطابق قوانین الٰہی ہو۔ یوں جو کچھ تم دو گے، وہ بالآخر تم سب کی اجتماعی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر ہی خرچ ہوگا۔ تم تسلی رکھو۔ اس سے تمہاری ذرہ برابر بھی حق تلفی یا تم پہ ظلم نہیں ہوگا۔ جو کچھ تم لوگوں کو دیتے ہو، اس سے معاشرہ کی ناہمواریاں دور کرنے میں مدد ملتی ہے اور بالآخر ایسا نظام قائم ہوتا ہے جس میں مرکز کے ذریعے تم سب کو اپنے اپنے دیئے ہوئے کا فائدہ پہنچے گا۔ یعنی تمہاری بحیثیت قوم فلاح و بہبود کے لیے یہ رقم استعمال کی جائیگی۔

اب سوچیے کہ اگر انفاق سے مراد ذاتی طور پر مختلف ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری ہوتی تو کیا اللہ تعالیٰ ایسے احکامات نازل کرتا جس میں وہ مومنین کو تسلی اور حوصلہ دے رہا ہے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا انفاق کردہ روپیہ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ بلکہ اس سے تمہاری ہی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

بصورت دیگر تو ایسی تسلیوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ سرمایہ کار تو خود ہی فاضلہ دولت سے بذریعہ سرمایہ کاری مزید دولت پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے اور اس کی آمدن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر انفاق یہی ہے تو پھر رب کی جانب سے ''اس کا فائدہ تمہاری ہی ذات کی نشوونما کی صورت میں برآمد ہوگا'' اور ''تم پر ہرگز بھی ظلم نہیں ہوگا'' جیسے احکامات کے کیا معنی؟

(2) اللہ تعالیٰ نے دیگر مقامات پر انفاق کو قرض سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یوں تو قرض اس مال کو کہا جاتا ہے جو دیا ہی واپس لینے کے لیے جائے، لیکن اس واپسی میں ایک اور اہم نکتہ بھی پوشیدہ ہے۔ آپ نے کبھی جگالی کرتی ہوئی گائے یا بھینس کو تو دیکھا ہی ہوگا۔ تمام کھایا ہوا چارہ ابھر کر معدہ سے منہ میں آجاتا ہے اور دانت اسے چبا چبا کر قابل ہضم بنا دیتے ہیں اور پھر اسے معدہ میں لوٹا دیتے ہیں۔ یہ امر ''قریض'' کہلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح گزشتہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ تم دوسروں کے لیے دیتے ہو، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ تمہارا روپیہ ہاتھ سے جا رہا ہے، لیکن دراصل یہ اس قریض کی مانند ہے جو تم نے خام مال کی شکل میں ریاست کو دیا، اور پھر ریاست نے اسے قابل ہضم صورت میں تمہیں واپس لوٹا دیا۔ یعنی اجتماعی فلاح و بہبود کی صورت میں۔ اسی بات کی وضاحت درج ذیل آیت کی صورت میں کی گئی کہ:

إِن تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ

(سورہ تغابن۔آیت 17)

جو کچھ تم قرآنی ریاست کو معاشرہ کا توازن درست کرنے کے لیے دیتے ہو، وہ تمہیں دگنی صورت میں ریاست کی جانب سے واپس مل جاتا ہے۔اور تمہاری حفاظت کا سامان بن جاتا ہے۔

(3)وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ

(سورہ سباء۔آیت 39)

جو کچھ تم انفاق کرتے ہو، اس کی مثال ان پتوں کی سی ہے جو خزاں کے بعد درختوں سے نکلتے ہیں، یا اس کی مثال ایک بیج کی سی ہے جس کے ایک ایک پودے میں سینکڑوں دانے پیدا ہوں۔یعنی جو کچھ بھی اجتماعی مفادِ عامہ کے لیے ریاست کو دیا جائیگا، ریاست اسے کئی گنا بڑھا کر تمہاری خوشحالی کا سامان کر دے گی۔اجتماعی فلاح و بہبود عام ہو جائیگی۔

(4)لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ (سورہ آل عمران۔آیت 92)

تم اس وقت تک کشادہ دل اور نیک نہیں ہو سکتے جب تک اپنی آمدنیوں کا پسندیدہ ترین حصہ اجتماعی مفاد کے لیے وقف نہ کر دو۔

''پسندیدہ ترین حصہ''۔واہ کیا بات ہے۔قرآن نے نیکی کا دارومدار ہی اپنے پسندیدہ ترین حصہ کو منفعتِ عامہ کے لیے وقف کر دینا قرار دے دیا۔جبکہ ہمارے ہاں نیکوکاروں کے معیار ہی اور قسم کے ہیں۔کیا سرمایہ داری جس میں ''پسندیدہ ترین حصہ''غریب کے پاس جانے کی بجائے آپ کی جیبوں میں واپس چلا آتا ہے، انفاق قرار دی جا سکتی ہے؟

(5) اسی طرح ایک اور جگہ ایسے انفاق کو بلا نتیجہ قرار دیا گیا جسے زبردستی یا بہ جبر کیا جائے۔دلوں میں بے رغبتی سی نظر آئے۔(سرمایہ کاری میں بے رغبتی کا عنصر نہیں ہوتا۔بلکہ یہ منافع کے سہانے سپنے سجا کر کی جاتی ہے۔نمائش ہوتی ہے اپنی دولت کی)

وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ (سورہ التوبہ۔آیت 54)

اور اگر یہ لوگ (منافقین) مالی امداد اپنے دل کی خوشی سے نہیں، بلکہ مجبوری اور ناگواری سے دیتے ہیں (تو ایسے لوگ اس نظام کے اراکین کیسے بن سکتے ہیں جسکی بنیاد ہی دل کی رضا و رغبت پر ہوتی ہے)

اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لاَ تُبْطِلُواْ صَدَقَاتِکُم بِالْمَنِّ وَالأذَی کَالَّذِیْ یُنفِقُ مَالَہُ رِئَاء النَّاسِ وَلاَ یُؤْمِنُ بِاللّہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ فَمَثَلُہُ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ فَأَصَابَہُ وَابِلٌ فَتَرَکَہُ صَلْداً لاَّ یَقْدِرُونَ عَلَی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُواْ وَاللّہُ لاَ یَھْدِیْ الْقَوْمَ الْکَافِرِیْنَ (سورہ البقرہ۔آیت 264)

اے مومنو۔اگر تم نظام خداوندی کے قیام کے لیے کچھ دیکر احسان جتاتے پھرو اور دوسروں کے لیے مصیبت بن جاوتو اس سے تمہارا انفاق تعمیری نتائج کی بجائے تخریبی نتائج پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔تم ایسا نہ کرنا،ایسا وہی کرسکتا ہے جسے اس نظام کی صداقت اور مستقبل کی زندگی پر یقین نہ ہو۔لیکن اس خیال سے کہ میں نے انہی لوگوں میں رہنا ہے،پس ان سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔اس مد میں کچھ دیدے۔

اس انفاق کی مثال یوں سمجھو کہ جیسے کسی سخت چٹان پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہہ جم جائے (اور یوں لگے جیسے وہ کھیتی باڑی کے لیے بہت عمدہ زمین ہے) لیکن جب بارش کا ایک تیز چھینٹا اس پر پڑے تو وہ ہلکی سی تہہ کی مٹی بہہ جائے اور اندر سے اصلیت ظاہر ہوجائے۔اسی طرح (ایک ایک دانہ سے سینکڑوں دانے ملنا تو ایک طرف) فصل کاشت کرنے میں جس قدر محنت صرف ہوئی تھی،وہ بھی ضائع ہوجائے۔

وَاللّہُ یُرِیْدُ أَن یَتُوبَ عَلَیْکُمْ وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُونَ الشَّھَوَاتِ أَن تَمِیْلُواْ مَیْلاً عَظِیْماً یُرِیْدُ اللّہُ أَن یُخَفِّفَ عَنکُمْ وَخُلِقَ الإِنسَانُ ضَعِیْفاً یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ لَا تَأْکُلُواْ أَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَکُونَ تِجَارَۃً عَن تَرَاضٍ مِّنکُمْ وَلَا تَقْتُلُواْ أَنفُسَکُمْ إِنَّ اللّہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْما (سورہ النساء۔آیات 27-29)

(6) پھر فرمایا کہ انفاق ایک ایسی چیز ہے کہ مومن یہ کرتے ہوئے نہ کسی صلہ کی خواہش رکھتا ہے نہ ستائش کی امید۔کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ وہ جتنا زیادہ کسی کو دیتے ہیں،اس سے انکی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور معاشرہ پر خوشگوار معاشی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

إِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّہِ لَا نُرِیْدُ مِنکُمْ جَزَاء وَلَا شُکُوراً

(سورہ الدھر۔آیت 9)

اس لیے کہ جو انفاق نوع انسانی کی اجتماعی پرورش کے لیے ریاست کو فاضلہ دولت دے کر کیا جاتا ہے،اس کا اجر انسان کو اپنی

ذات کی نشوونما کی صورت میں ملتا ہے:

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی (سورہ اللیل۔آیت 18)

(7)یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ

(سورہ البقرہ آیت 215)

اے رسول لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کے نظام کے قیام اور استحکام کے لیے کس قدر مال دینا چاہی؟ کہہ دو کہ اللہ کے نظام کے ابتدائی دور کے حوالہ سے جس قدر بھی ہو سکے اپنے اردگرد کے لوگوں کا خیال رکھو۔اپنے والدین کی ضروریات پوری کرو،ان لوگوں کی مدد کرو، جو معاشرہ میں کمزور اور بے سہارا رہ جائیں،اور ان کی بھی مدد کرو جو کمانے کے قابل نہ رہیں،جن کی معیشت کا پہیہ کسی وجہ سے رک جائے یا بے روزگار ہو جائیں،اور باہر سے آنے والے مسافروں کی دیکھ بھال پر بھی خرچ کرو۔دیکھو جو کچھ بھی تم دوسروں کی فلاح پر خرچ کرو گے،اللہ کے علم میں ہوگا۔

قارئین درج بالا تمام نکات پر غور کیجیے اور سوچئے کہ انفاق کس چیز کا نام ہے، دوسروں کو ''دے دینے'' کا یا سرمایہ کاری کر کے فیکٹریاں کارخانے لگا کر لوگوں کو روزگار دینے کے بہانے ان کی محنت کی کمائی گھر بیٹھ کر صرف سرمایہ کے بل بوتے پر ہتھیاتے جانا؟ خود امیر سے امیر تو اور دوسروں کو غریب سے غریب تر کرتے ہوئے دولت کو صرف چند ہاتھوں تک مرتکز کرتے جانا اور اسے مساوی طور پر معاشرہ کی رگوں میں گردش نہ دینا۔

اگر حنیف صاحب کا مفہوم انفاق لیں تو یہاں پھر جو مساکین، کمانے کے قابل نہ رہنے والے،معذور اور والدین، مسافر وغیرہ پر انفاق کی مد میں خرچ کرنے کا حکم ہے، اس کی صورت کیا ہوگی؟ کیا آپ ان لوگوں کو پہلے اپنی فیکٹریوں میں کام پر لگائیں گے؟ پھر مزدوری دیا کریں گے؟ تاکہ وہ اپنے ''زورِ بازو'' سے کما کر کھا سکیں۔

حنیف صاحب کے تصورِ انفاق کو باطل قرار دینے والی آیاتِ قرآنی

جیسا کہ واضح کیا گیا کہ حنیف صاحب کے نزدیک انفاق کا تصور اپنی فاضلہ دولت کی ملکیت سے دستبردار ہو کر اسے مفادِ عامہ کی غرض سے ریاستی تحویل میں دے دینا نہیں بلکہ اسے بھی اپنی ملکیت میں رکھ کر اس سے سرمایہ کاری کے ذریعہ نئے

پیداواری منصوبے قائم کر کے لوگوں کو روزگار دینا ہے۔ حنیف صاحب کے تصورِ انفاق کو قرآنی احکامات کی مدد سے بنیادی طور پر غلط ثابت کرنے کے لیے گزشتہ سطور میں کافی کچھ لکھا گیا۔ اب مزید اس غلط تصور اور یہودی سرمایہ کاری کو انفاق کا رنگ دینے کی مذموم کوشش کے مزید قرآنی ابطال کے ذریعہ نکتہ نظر کو واضح کرنے والی آیات پیش خدمت ہیں:

(1) سرمایہ کا منافع مت کھاؤ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (سورہ آل عمران۔ آیات 130 تا 132)

اے وہ لوگو جنہوں نے اللہ کے نظام کو قبول کر لیا ہے سرمایہ کا منافع مت کھاؤ۔ جس سے استحصال کے ذریعے نجی دولت میں اضافہ در اضافہ کیا جاتا ہے۔ تم اس سلسلہ میں اللہ کے قوانین کی پیروی کرو۔ یہی کامیابی کی حقیقی راہ ہے۔ اور اپنے معاشرہ کو سرمایہ دارانہ نظام کی بھڑکائی ہوئی آگ سے بچاؤ جس میں اللہ کے نظام و قوانین کے خلاف زندگی بسر کرنے والے لوگ جلتے ہیں۔ تم اللہ کے دیئے ہوئے نظام کی اطاعت کرو تا کہ تمہاری انسانی صلاحیتوں کی درست نشوونما ہو سکے۔

قارئین اس عظیم الشان آیت مبارکہ پر بار بار غور کیجیے۔ یہ سرمایہ کاری اور جاگیردارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینک رہی ہے۔ سرمایہ پر منافع کمانا حرام قرار دے رہی ہے جس کے ذریعے گھر بیٹھے دوسروں کی محنت کی کمائی سرمایہ دار اپنی جیبوں میں ڈالتا ہے۔ انسان کے لیے صرف وہی جائز ہے جس کے لیے اس نے محنت کی، سرمایہ پر منافع وہ نہیں لے سکتا۔ کیونکہ ربا کے متعلق ہم گزشتہ ایک باب میں پڑھ چکے ہیں کہ یہ ایک مہلک چیز ہے جو نہ صرف قومی پیداوار میں کمی کا باعث بنتا ہے، بلکہ اس سے سرمایہ کار کی تخلیقی، فکری و جسمانی صلاحیتیں کند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا قومی پیداوار میں حصہ نہ ہونے کے برابر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے رباخوری کو اللہ و رسول کے خلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ حنیف صاحب اسے انفاق کا درجہ دے رہے ہیں۔ تعجب ہے۔

حنیف صاحب کا تصورِ ملکیت

اسی طرح حنیف صاحب ملکیت کے تصور پر بھی شدید غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی جائز ذرائع سے کماتا ہے، وہ سب اس کی ملکیت ہے چاہے وہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو؟ اور اسے اس کی ملکیت سے دستبردار ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ ماسوائے ایک زکوٰۃ کے (جو قرآنی حکومت ایک مقررہ شرح پر زبردستی وصول کرنے کا بھی اختیار رکھتی

ہے)،لیکن اس کے علاوہ کسی فرد، ریاست یا گروہ کو اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اس کی ملکیت سے دستبردار کر سکے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے اس مضمون کا پہلا باب ہی حنیف صاحب کی اس غلط فہمی اور خلافِ قرآن نظریہ کے رد میں لکھا ہے جہاں قرآن سے ہی ثابت کیا ہے کہ انسان کی کمائی ہوئی آمدن ساری کی ساری اسکی محنت کی نہیں ہوتی۔اس میں زیادہ تر حصہ اللہ کی جانب سے دئے گئے وسائل پیداوار، زمین اور انسانی صلاحیتوں کا ہوتا ہے۔اس لیے ان کی تقسیم انسان کی مرضی سے نہیں، بلکہ اللہ کی مرضی سے ہونی چاہیے۔انسان صرف اپنی محنت کے بقدر خود رکھے اور باقی اللہ تعالیٰ کے بتائے گئے اصولوں کے مطابق معاشرہ کے سائلین ومحرومین کے لیے وقف کر دے۔ذیل میں ایک ڈایاگرام پیش کی جارہی ہے جس سے حنیف صاحب کے ''انفاق'' کے نتائج کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

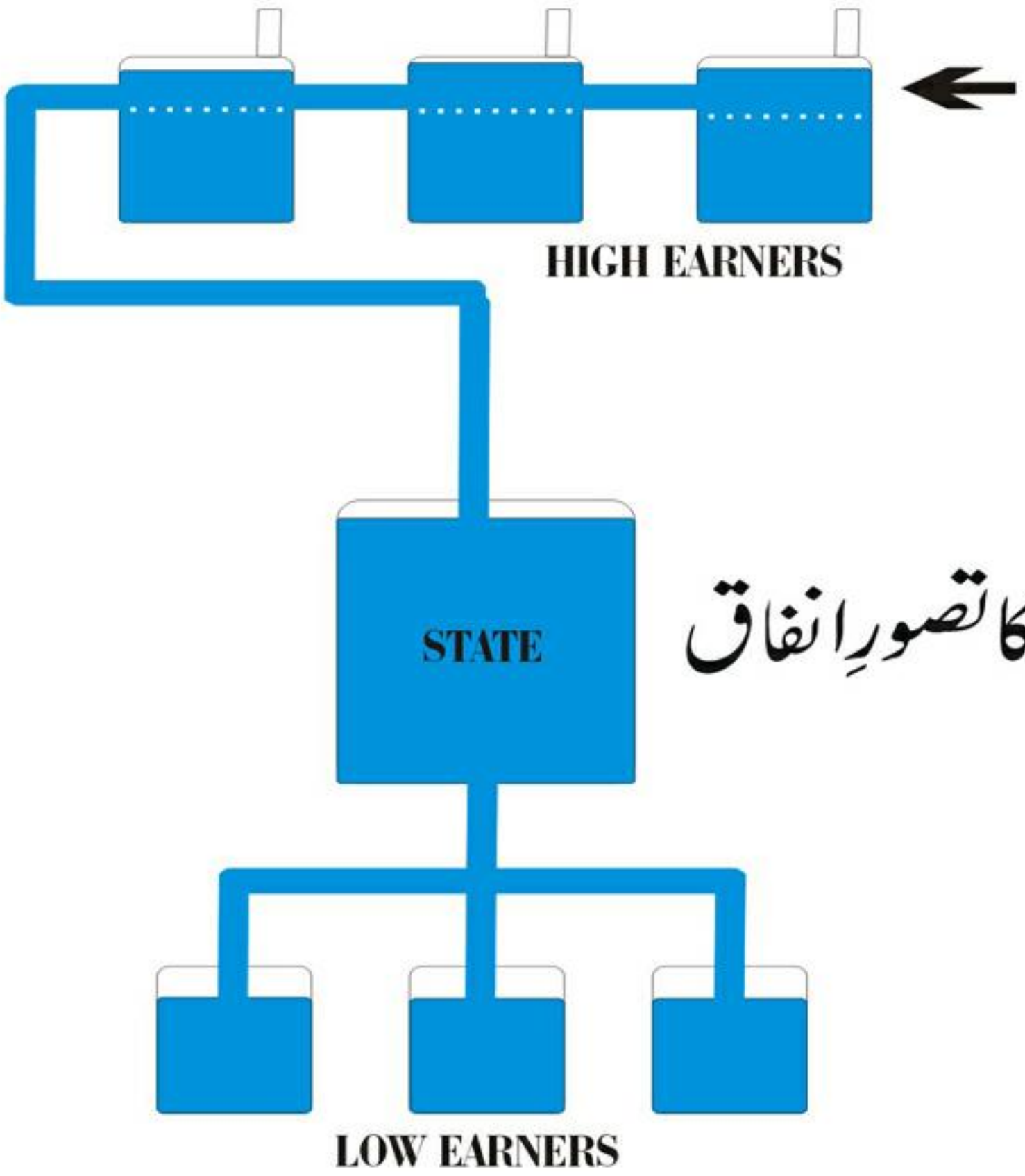

قرآن کا تصورِ انفاق

FIGURE 1

حنیف صاحب کا تصورِ انفاق
(منافع بخش انفرادی سرمایہ کاری)

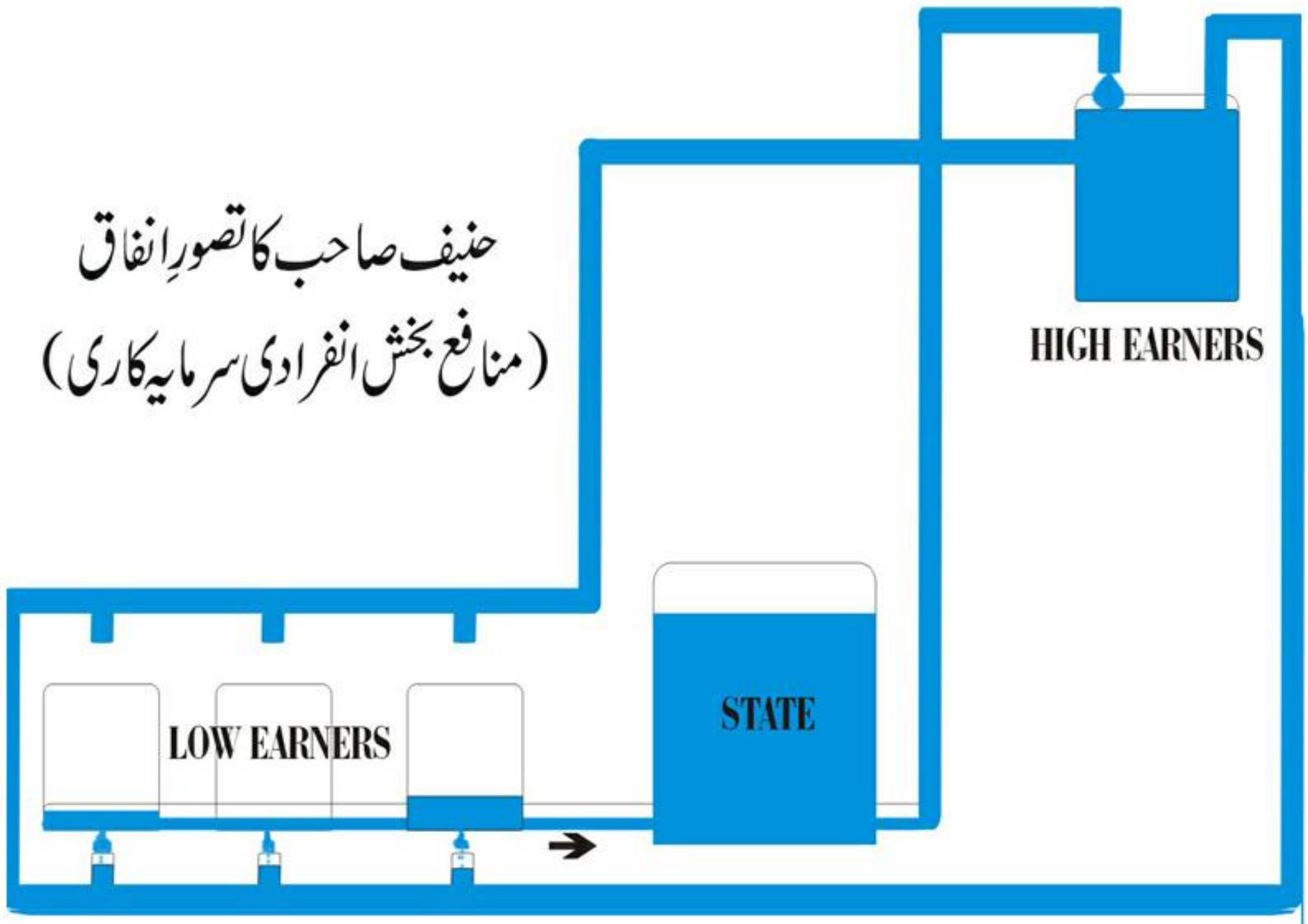

FIGURE 2

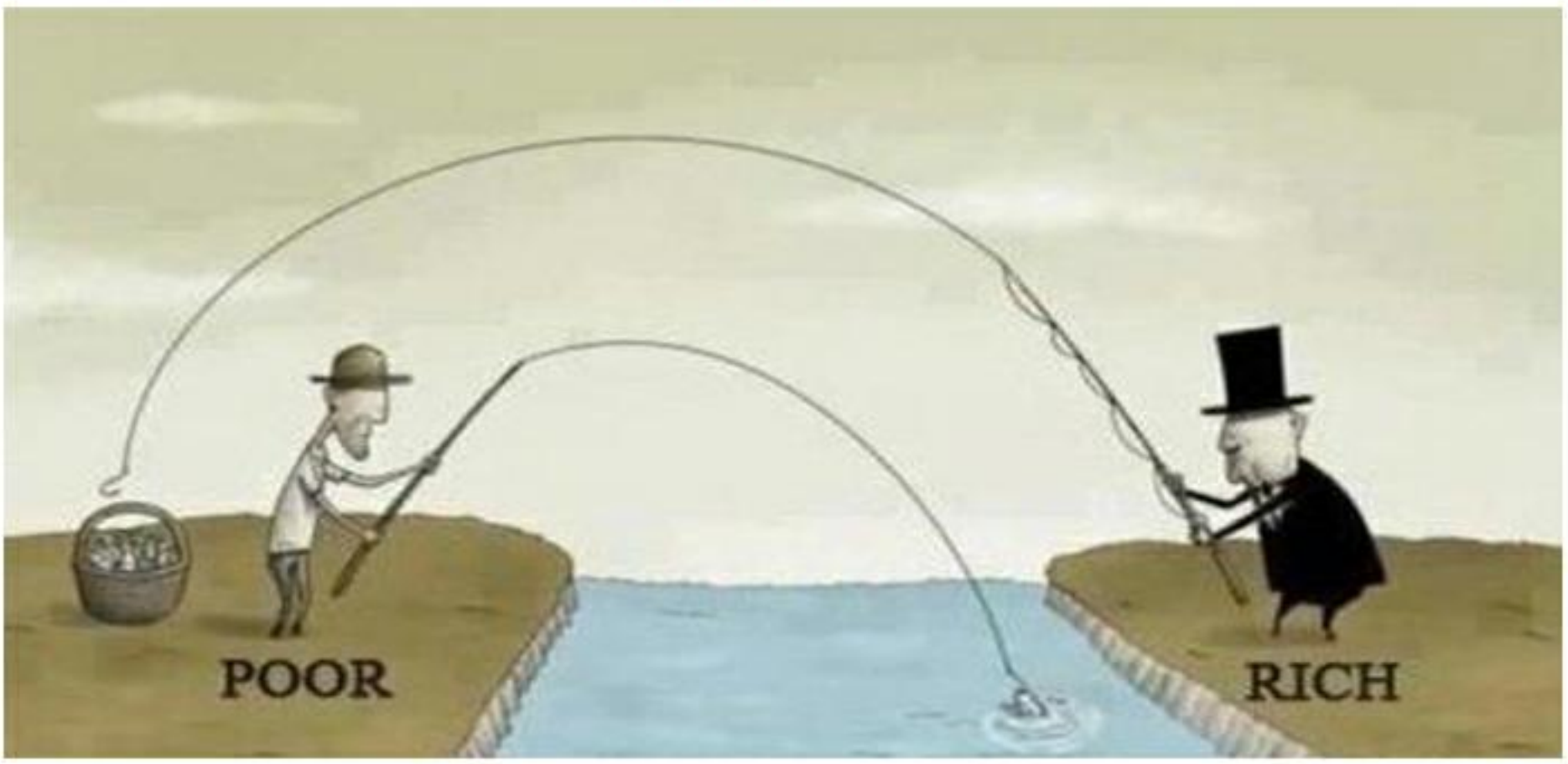

اس ''انفاق'' میں انفرادی سرمایہ کاری کے ذریعہ سرمایہ دار کی جانب سے غریبوں کی محنت کی کمائی ہڑپ کرنے کے عمل کی مزید وضاحت بذریعہ تصویر

حنیف صاحب کے تصورِ انفاق (یہودی سرمایہ کاری) کے پاکستان میں سامنے آنے والے ''تعمیری نتائج'' کی کچھ جھلکیاں

پاکستان کے 10 امیر ترین افراد (جو حنیف صاحب کے نظریہ انفاق پہ عمل پیرا ہیں)

میاں محمد منشاء: پاکستان میں سرفہرست دولتمند اس وقت میاں محمد منشاء ہے۔ جسکی دولت کا تخمینہ 2.5 بلین امریکی ڈالرز ہے۔ مسلم کمرشل بینک کا مالک محمد منشاء اس وقت 40 کمپنیوں کا مالک ہے۔ وسیع تر سرمایہ کاری کی بدولت اسکی دولت مزید بڑھ رہی ہے مگر اسکے دوستوں کا کہنا ہے کہ محمد منشاء نمود و نمائش پسند نہیں کرتا۔

آصف علی زرداری: صدرِ پاکستان آصف علی زرداری دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ ایک سیاستدان ہے اور اسکی دولت کا تخمینہ 1.8 بلین امریکی ڈالرز ہے۔ سابق وزیرِ اعظم بینظیر بھٹو کا خاوند آصف زرداری برطانیہ میں آٹھ مقامات پر بڑی جائیداد کا مالک ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کئی ملین ڈالرز سے تعمیر شدہ ایک حویلی کا مالک بھی ہے۔ پاکستان بھر میں موجود شوگر ملز میں اسکے بڑے بڑے شیئرز ہیں۔

سرانور پرویز: تیسرے نمبر پر سرانور پرویز ہے۔ یہ 1.5 بلین امریکی ڈالرز کا مالک ہے اور ایک بزنس مین ہے۔ یہ

بیسٹ وے گروپ کا چیئرمین ہے جسکا آغاز اس نے 1976ء میں کیا تھا۔اس کے بعد سے پچاس کے قریب کیش اینڈ کیری برنسز کا مالک ہے۔انور پرویز اور اسکے شراکت داراب عالمی سطح پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

شریف برادران: نواز شریف اور شہباز شریف پاکستان کے چوتھے امیر ترین لوگ ہیں۔انکی دولت کا تخمینہ 1.4 بلین امریکی ڈالرز ہے۔ یہ سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ کاروباری لوگ ہیں۔ جب نواز شریف سعودی عرب میں مقیم تھا،تب غیر ملکی تعمیراتی کمپنیوں کے پاکستان میں کام کی کمیشن وصولی کیا کرتا تھا۔

صدرالدین ہاشوانی: صدرالدین ہاشوانی کی دولت 1.1 بلین ڈالرز کے عدد کو چھوتے ہوئے اسے پاکستان کے امیر ترین افراد میں پانچویں نمبر پر کھڑا کیے ہوئے ہے۔اس شخص نے کانوں،معدنیات، ہوٹلز،انشورنس کمپنیوں،تمباکو،بیٹریوں کے کاروبار سمیت تعمیرات، انجینئرنگ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بہت سے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔

ناصر شون: چھٹے نمبر پر ناصر شون اور اسکا خاندان ہے۔شون گروپ کا سربراہ ناصر شون ایک بلین ڈالرز کا مالک ایک

بزنس مین ہے۔

عبدالرزاق یعقوب: عبدالرزاق بھی ایک کاروباری شخص ہے اور اسکے اثاثہ جات کی مالیت بھی 1 بلین ڈالرز ہے۔ یہ اے آر وائی گروپ کا صدر ہے۔

Abdul Razzaq Yaqub

رفیق حبیب اور راشد حبیب: آٹھویں نمبر پر 720 ملین امریکی ڈالرز دولت کے مالک یہ دونوں افراد دنیا بھر میں ایک سو کمپنیوں کے مالک ہیں۔ انکی مالی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے 1948ء میں قلاش پاکستانی حکومت کو 80 ملین روپے کا چیک دیا تھا۔

مسٹر فاروقی: مسٹر فاروقی سندھ کی مقامی حکومتوں کا وزیر ہے اور اسکی دولت کا تخمینہ 400 ملین امریکی ڈالرز ہے۔

NO IMAGE AVAILABLE FOR MR.IMRAN

مسٹر عمران: مسٹر عمران اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا خواہشمند نہیں، اس لیے تصویر دستیاب نہیں ہوسکی۔ عمران ایک کاروباری شخص ہے اور کاروباری مقاصد کی وجہ سے اس نے اپنا مکمل نام بھی خفیہ رکھا ہوا ہے۔ اسکے اثاثوں کی مجموعی مالیت 250 امریکی ڈالرز ہے۔ اسلام آباد میں موجود اسکی رہائش گاہ انتہائی پرتعیش ہے جہاں ایک ذاتی جم

خانہ،ٹینس کورٹ اور ایک سوئمنگ پول بھی موجود ہے۔

(www.Studysols.com-Top Richest men of Pakistan)

دنیا کے دس امیر ترین افراد

دنیا کے دس امیر ترین افراد

کارلوس سلم ہلو :69 بلین امریکی ڈالرز۔ٹیلی کام۔میکسیکو

بل گیٹس :61 بلین امریکی ڈالرز۔مائیکروسافٹ۔امریکہ

وارن بفٹ :44 بلین امریکی ڈالرز۔برک شائر ہاتھوے۔امریکہ

برنا ڈآرنالٹ :41 بلین امریکی ڈالرز۔ایل وی ایم ایچ۔فرانس

امانکیو آرٹیگا :37.5 بلین امریکی ڈالرز۔زارا۔سپین

لیری ایلیسن :36 بلین امریکی ڈالرز۔اوریکل۔امریکہ

ائک باٹسٹا :30 بلین امریکی ڈالرز۔کان کنی،پٹرولیم۔برازیل

سٹیفن پیرسن :26 بلین امریکی ڈالرز۔ایچ اینڈ ایم۔سویڈن

لی کا شنگ :25.5 بلین امریکی ڈالرز۔ہانگ کانگ

کارل البریکٹ :25.4 بلین امریکی ڈالرز۔آلڈی۔جرمنی

(www.forbes.com/billionaires)

یہ ہے حنیف صاحب کی جانب سے پیش کردہ تصورِ انفاق (قارونی انفاق) پہ عمل کا نتیجہ۔جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔یعنی وہ سرمایہ دارانہ Scenario جسے قرآن کریم سے ثابت کرنے کی مذموم اور شرمناک کوشش کی جاتی ہے۔مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

حنیف صاحب کا تصورِ ملکیت

Mohammad Hanif کیسی عجیب بات ھے ـــــ دوست یہ بات بڑے دھڑلے سے کہہ رھے ھیں۔ کہ جی قرآن یہ کہتا ھے ـــــ قرآن یہ کہتا ھے ـــــ یہ جائز ھے ۔ یہ ناجائز ھے ـــــــ لیکن کسی کے پاس قرآن سے کوئی دلیل نہیں ھے ـــــ ذرا ھم بھی تو دیکھیں کہ کس آیت میں قرآن نے کسی کو مال کی ملکیت سے منع کیا ھے ـــــ کس جگہ قرآن نے کہا ھے کہ جو کچھ بھی تم کماؤ ـــ وہ فلاں فرد ، گروہ یا ریاست کو دے دو ـــــــ

کسی کا خودساختہ عقیدہ ، کیا اپنے آپ میں سند ھوتا ھے ؟؟؟؟ اگر ایسا ھے تو دنیا میں کوئی بھی غلط نہیں ھے ـــــــ

کیا زیادہ بہتر یہ نہیں کہ اپنے عقائد کو بیان کرنے کی بجائے ، قرآن کریم کی واضح آیات سے یہ ثابت کیا جائے ، کہ قرآن میں مال کی ملکیت پر پابندی ھے ـــ یا جو کچھ کمایا جائے ، اسے کسی کو لازماً دینا ھے ـــــ

اور اگر صرف اپنے نظریات ھی کو بیان کرنا ھے ، تو پھر کسی مکالمے کی کیا ضرورت ھے ـــــ بس کہہ دیں کہ یہ ھی ٹھیک ھے کیونکہ ھم کہہ رھے ھیں ـــــــ

لیکن انفاق ایک مسلسل عمل ھے ـــ اس کی ابتداء اپنے گھر سے ھی ھو جاتی ھے ـــ

کیا کرتا ھے ایک باپ اپنے گھر میں ـــــ

وہ اپنے سارے وسائل ، اپنے بچوں کے لیے کھلے رکھتا ھے ـــ

وہ دیکھتا ھے کہ کس بچے کی کیا ضرورت ھے ۔ وہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ھے اگر کسی کی ضرورت زیادہ ھے تو اسے زیادہ دیتا ھے ۔ اور جس کی ضرورت کم ھوتی ھے اسے کم دیتا ھے ـــــ

لیکن کیا ایسا کرتے ھوئے ، وہ اپنے مال ، یا دیگر نعمائے زندگی سے ، جو اس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے حاصل کیے ھوتے ھیں ، خارج ھو جاتا ھے ؟؟؟

ھرگز نہیں ـــــ

بلکہ اسے تو یہ حق حاصل رھتا ھے کہ اپنی زندگی میں لازمی وصیت کرے ـــ وہ جس کو چاہے ، جتنا چاہے ، دے دے ـــــــــ

اور اگر وہ ، وصیت کئے بغیر ھی مر جاتا ھے ، تب بھی اس کا مال ، اسکی جائیداد ، اس کی ھر شئے ، صرف اور صرف اس ھی کے بیوی ، بچوں ، ماں باپ ، بہن بھائیوں میں تقسیم کرنے کا حکم ھے ۔

قرآن کریم کی کسی آیت کی کوئی ایسی تشریح ، جو اس کی بنیادی تعلیم سے ٹکراتی ھو ، وہ درست نہیں ھو سکتی ـــ

ملکیت کا قرآنی تصور

یہ بات درست ہے کہ قرآن نے بعض اموال میں انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے لیے کچھ حدود و قیود اور شرائط بھی عائد کی ہیں۔ غیر مشروط حقِ ملکیت ہرگز نہیں دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسی اقسام کے اموال بھی ہیں جن کے لیے قرآن انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم تو کرتا ہے مگر اس حقِ ملکیت کی حیثیت بھی عینی (Ultimate) نہیں بلکہ وکالتی یا امانتی ہے۔ غور کیا جائے تو فرد کی حیثیت ان اموال میں معاشرہ کی طرف سے ایک وکیل کی سی ہے۔ ورنہ عام طور پر مال معاشرہ کی ہی ملکیت میں ہے۔ اور وہ معاشرہ بھی اس مال کی عینی مالک نہیں بلکہ وہ بھی اللہ کی جانب سے نیابتاً ہی اس میں حقِ تصرف رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ اصول تو بہر حال طے شدہ ہے کہ ہر چیز کا مالکِ حقیقی اللہ کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ انسان کو صرف اس مال پر وکالتی یا امانتی ملکیت حاصل ہے، عینی ملکیت نہیں۔

دیکھئے قرآن اس ضمن میں کیا کہتا ہے:

آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ (سورہ الحدید۔آیت 7)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جن اموال میں اس نے تمہیں خلیفہ (امین) بنایا ہے، ان کو منفعت عامہ کے لیے وقف کر دو (کھلا چھوڑ دو)۔

اس آیت میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش موجود نہیں۔ یہ اس امر کے لیے نص صریح ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جو بھی مال و دولت ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا مال ہے۔ اور انسان اس مال میں محض وکیل ہے، اصیل نہیں۔

اسی طرح سورہ نور میں جہاں مکاتبین (وہ غلام جو مکاتبت کر کے آزادی حاصل کرنا چاہیں) ان کی امداد اور اعانت کا حکم ہے۔

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ وَلَا تُكْرِهُوا (سورہ النور۔آیت 33)

اور ان (مکاتبین) کو خدا کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں (بطور امانت) دیا ہے۔

یہاں غور کیجیے کہ کیا اعلان کیا جا رہا ہے۔ کہ مالدار لوگ ان مکاتبین کو اپنا مال نہیں دیتے بلکہ اللہ کا مال دیتے ہیں۔ دینے والے تو محض درمیانی وسیلہ بنتے ہیں۔

تیسری آیت جو سورہ نحل کی ہے، اس سے بھی زیادہ واضح اور محکم ہے۔

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلَی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ

(سورہ النحل۔آیت 71)

اللہ تعالیٰ نے حصول رزق میں بعض کو بعض سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔پس جو لوگ زیادہ مال کما سکتے ہیں،وہ زائد از ضرورت کو اپنے ماتحتوں کی جانب کیوں نہیں لوٹا دیتے؟ کیونکہ یہ مال انہی کا ہے۔یہ لوگ اس خیال سے ایسا نہیں کرتے کہ یوں تو وہ سب ان کے برابر آجائیں گے۔(گدھا گھوڑا ایک جیسے ہوجائیں گے)۔ایسا خیال کرنے میں وہ اللہ کی نعمتوں سے انکاری ہیں۔

یہاں قرآن نے یہ چیز ثابت کر دی ہے کہ دولت مند لوگ اپنے ہاتھ کے نیچے کے لوگوں کو جو دیتے ہیں،وہ دراصل ان مالداروں کے مال کا حصہ نہیں ہوتا جسے وہ نکال کر بطور خیرات دے دیتے ہیں، بلکہ یہ دراصل ان ضرورتمندوں کا ہی اپنا حق ہوتا ہے جسے یہ مالدار لوگ خدا اور ان ضرورتمندوں کے درمیان وسیلہ بن کر پورا کرتے ہیں۔کیونکہ اس مال کے معاملہ میں یہ اور وہ ضرورتمند سب برابر ہیں۔اور ہر گروہ یکساں حقدار ہے۔کیونکہ سرچشمہِ رزق (زمین و وسائل پیداوار) تو ایک ہی ہے جس سے یہ دونوں رزق کماتے ہیں۔دونوں کا یکساں حق ہے۔کیا یہ لوگ اللہ کی اس نعمت کا انکار کرنا چاہتے ہیں؟ نعمت کا انکار ہوتا ہی تب ہے جب انسان یہ تصور ذہن میں بٹھا لے کہ جو مال اس کے قبضہ میں ہے،وہ اس کی اپنی عینی ملکیت ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ یہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت تو ہے ہی نہیں۔یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہے۔

مندرجہ بالا حکم سے بھی صریح حکم سورہ النساء میں موجود ہے جہاں اللہ فرماتا ہے کہ:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا وَاکْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (سورہ النساء۔آیت 5)

اور سفہاء لوگوں کو تم اپنے اموال مت دو (جو اس کا درست استعمال نہیں کر سکتے) جنہیں رب نے تمہارے لیے قیام کا باعث بنایا ہے۔بلکہ اس میں انہیں بس کھانے پینے کی ضروریات کے مطابق ہی دو۔

اس آیت میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کو مال و زمین پر تصرف کا حق اسی صورت مل سکتا ہے جب وہ ہوش و حواس کے ساتھ اس فریضہ کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔اگر کسی مالک میں یہ صلاحیت نہیں تو اس کے حقوقِ ملکیت موقوف ہو جاتے ہیں۔یعنی وہ مال جس پر فرد کو قبضہ حاصل تھا، وہ قرآنی معاشرہ کا اجتماعی مال تھا جو ریاست کی ملکیت تھا۔جب اس شخص کی

لاپرواہی یا نالائقی کی وجہ سے وہ سلسلہ ختم ہوا تو مال اپنے اصلی سرچشمہ (ریاست) کی جانب لوٹ جاتا ہے۔

اس آیت میں لفظ ''اموالکم'' دعوتِ فکر دے رہا ہے۔یعنی سفہاء کے اموال کو قرآن نے ان کے اموال قرار نہیں دیا، بلکہ لفظ ''اموالکم'' کے استعمال سے اسے معاشرہ یا ریاست کا مال قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ایک انسان کے اندر یہ شعور (کہ جو مال اس کے پاس ہے، وہ دراصل معاشرہ کی ملکیت ہے، اور وہ اس جماعت کی جانب سے اس مال پر محض وکیل، امین یا نائب ہے) ہی اس انسان کو کوان فرائضِ منصبی کو قبول کرنے اور انجام دینے پر مجبور کر سکتا ہے جو ایک ریاست اس فرد کے ذمہ عائد کرتی ہے اور جسے اس شخص کی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔یہی وہ حدود و قیود ہیں جن کی بدولت اللہ کا نظام اس شخص کو اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ریاست کی جانب سے تفویض کردہ فرائض منصبی کی انجام دہی پر مجبور کرتا ہے۔اور جن میں غفلت برتنے پر اس کے حقِ تصرف پر حد بندی بھی عائد کی جا سکتی ہے۔

فرض کیجیے کہ اگر ایک شخص کے ذہن میں یہ تصور بیٹھ جائے کہ یہ مال میری ذاتی ملکیت ہے۔اور مجھے تا حیات یہی کافی ہے۔ مجھے کسی ریاست یا معاشرہ کی ضرورت نہیں، نہ میں کوئی کام کروں گا۔جو میرے پاس موجود ہے، وہ صرف میرا ہے۔تو اس تصور کے ساتھ وہ شخص اپنے فرائض منصبی کیوں ادا کرے گا؟ کیونکر محنت کرے گا؟ اور معاشرہ کا حصہ بھی خود کو کیسے سمجھے گا؟ ایسی سوچ معاشرہ میں بہت بڑا بگاڑ پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔اسی لیے قرآن نے کسی انسان کو مال کا عینی مالک قرار نہیں دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست یا معاشرہ میں بھی یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ وہی اس مال کی اصلی مالک ہے، اور اسی وجہ سے اسے فرائض کو عائد کرنا اور حدود قائم رکھنے کے لیے عملی اقدامات کرنا ہیں۔تا کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو سکے۔

یہ بات ویسے بھی عقل تسلیم نہیں کرتی کہ ایک انسان زمین کا خود مالک ہو سکتا ہے، انسان صرف اس کی پیداوار اور غلہ کا مالک ہوتا ہے، نہ کہ خود زمین کا۔تو اس حساب سے انسانی اختیار صرف استفادہ کا ہے، نہ کہ عینی ملکیت کا۔قرآن کی رو سے عینی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بنیادی مسئلہ پر بھی غور فرمائیں۔قرآن مال سے استفادہ کے لیے بھی اس بات کا داعی نہیں کہ وہ لوگوں کے ایک مخصوص طبقہ ہی میں قید ہو کر رہ جائے اور انہیں میں گردش کرتا رہے اور دوسرے لوگ اس کو حاصل ہی نہ کر

پائیں۔فرمایا کہ:

یَ لَا یَکُونَ دُولَۃً بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَاءِ مِنکُم(سورہ الحشر۔آیت 8)

کہ مال تم میں صرف دولتمندوں کے ہی درمیان نہ گردش کرتا رہے(جیسا کہ انفرادی سرمایہ کاری کا نتیجہ ہوتا ہے)

اس دلیل کے ساتھ ایک روایتی واقعہ بھی پیش خدمت ہے جس سے اس آیت کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ جب رسول اللہ نے مہاجرین کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی تو لوگ بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ کی جانب گئے۔تنگدستوں نے اپنے ساتھ کیا لانا تھا،جو مالدار تھے،وہ بھی اپنا مال ساتھ نہیں لا سکے۔لہٰذا ان مالداروں کی حالت بھی وہاں پہنچ کر مخدوش ہوگئی۔انصار مدینہ نے انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی نفس میں پوشیدہ بخل کر کچل کر اپنے قلوب کو مہاجرین کے لیے کشادہ کر دیا۔انہوں نے ان سے برادرانہ تعلقات قائم کئے اور ہر چیز جو ان کی ملکیت میں تھی،میں ان مہاجرین بھائیوں کو شریک کیا۔حتیٰ کہ بعض مخصوص ترین اشیاء میں بھی۔یہ سب انہوں نے کسی مجبوری میں نہیں کیا بلکہ خوشدلی اور کشادہ دل وحوصہ سے کیا۔

سورہ حشر میں ہے کہ:

یُحِبُّونَ مَنۡ ہَاجَرَ اِلَیۡہِمۡ وَلَا یَجِدُونَ فِیۡ صُدُورِہِمۡ حَاجَۃً مِّمَّاۤ اُوۡتُوۡا وَیُؤۡثِرُونَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُونَ(سورہ الحشر۔آیت 9)

وہ لوگ جو ان کی جانب ہجرت کر کے آئے ہیں،انصار ان سے محبت کرتے ہیں اور جو اموال ان کو دئے ہیں،ان کو مہاجرین کے حوالے کرنے میں سینوں میں تنگی محسوس نہیں کرتے۔بلکہ اپنی ضروریات پر ان کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔اگرچہ وہ خود ان چیزوں کے انتہائی محتاج ہیں۔

قارئین ملاحظہ فرمائیں۔عقیدہ صحیح ہو تو وہ انسان کو کیا بنا دیتا ہے۔انصارؓ نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

مگر مدینہ کے متمول افراد اور تنگدست مہاجرین میں پھر بھی عدم توازن کی ایک خلیج حائل تھی۔رسول اللہ نے انصار کی یہ سخاوت ملاحظہ کی تھی،اس لیے انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی کہ جو کچھ وہ مہاجرین کے لیے کر رہے ہیں،اس سے زائد ان سے مطالبہ کریں۔

لیکن پھر بنونضیر کا واقعہ پیش آیا جس میں جنگ ہوئے بغیر ان کا مال فے ،اللہ ورسول (مرکزِ ملت) کی ملکیت قرار پایا۔چنانچہ مسلمانوں میں مہاجرین کے طبقہ کا معاشی توازن درست کرنے کے لیے رسول اللہ نے تمام مال فے مہاجرین کوخصوصیت سے عطا کیا۔انصار میں صرف دوآدمی ایسے تھے جنہیں اس میں بھی حصہ دیا گیا، کیونکہ وہ واقعی ضرورتمند تھے۔قرآن نے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے:

مَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ

(سورہ الحشر۔آیت 7)

مختلف آبادیوں کے جواموال فے حاصل ہوں،وہ صرف اللہ ورسول (مرکزِ ملت) اوررشتہ داروں،یتیموں ،مساکین اور مسافروں کے لیے ہیں۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ دولت تم مالداروں ہی میں گردش نہ کرتی رہے (بلکہ معاشرہ میں مالی توازن قائم رہے)۔لہٰذا رسول جوتمہیں دے دے،وہ لے لو، جونہ دے،اس سے باز رہو۔اور متقی بنو۔یاد رکھو،خدا کا عذاب (نافرمانوں کے لیی) بہت سخت ہے۔ یہ اموال فے صرف ان ضرورتمندوں مہاجرین کے لیے ہیں جن کواپنے شہر اور مال ودولت سے محروم کر کے نکالا گیا۔وہ اللہ کے فضل و رضا کے طالب اوردین الٰہی اور رسول اللہ کے مددگار ہیں۔ یہی لوگ (اپنے دعویٰ ایمانی میں) سچے ہیں۔

رسول اللہ کی طرف سے بنی نضیر کے مال کوصرف مہاجرین میں ہی تقسیم کرنا،اور پھر قرآن کی جانب سے اس کی تائیدوتصدیق اور بھرپور وجہ بیان کرنا کہ دولت صرف چند گھرانوں تک ہی سمٹ کر نہیں رہ جانی چاہیے، بلکہ اسے گردش میں رکھا جائے ،تمام انسانوں تک۔یہ اس مسئلہ کی حقیقت کو بالکل واضح کردیتا ہے جس کے بعد مزید تصریحات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسلام تمام افرادِ ملت میں معاشی توازن قائم کرنا چاہتا ہے، یہ بنیادی طور پر اس بات کے خلاف ہے کہ دولت جماعت کے صرف چند ہاتھوں تک ہی محدود ہوکر رہ جائے۔اس کے برعکس اس کی تعلیم یہ ہے کہ مختلف طبقات میں ایک اعتدال پیدا کردیا جائے ، کیونکہ ایک جانب مال ودولت کے انبار لگ جانا اور دوسری طرف فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جانا بہت بڑے اجتماعی فساد کا باعث ہوتا ہے۔یہ باہمی نفرتوں کو بھڑکاتا ہے۔مختلف طبقات میں حسد، کینہ اور بغض وعناد کے احساسات جنم لینے لگتے

ہیں۔یہی حکمت ہے اس حکم کی اور یہی وہ آیت ہے جو معاشرہ میں امیر وغریب کے تصور کو باطل قرار دے کر رد کرتی ہے۔

اس کے علاوہ اموال کی ایک اور قسم ایسی بھی ہے جس سے انسانوں کا مفادِ عامہ وابستہ ہوتا ہے،اور افراد کو کسی طرح بھی انہیں اپنے لیے مخصوص کر لینا جائز نہیں ہوتا۔مثلاً پانی، چارہ اور آگ وغیرہ۔

چونکہ قدیم خطہ عرب میں یہ تین اشیاء اجتماعی زندگی کی ضروریات میں شمار ہوتی تھیں اس لیے ان تینوں اشیاء سے استفادہ حاصل کرنا پورے معاشرہ کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔مگر ظاہر ہے اجتماعی زندگی کی ضروریات ہر زمانہ میں یکساں نہیں ہونگی،اس لیے اصولِ قیاس کے تحت مزید جو بھی اشیاء اس حکم کے زمرے میں آئیں،انہیں اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

المختصر،تمام قسم کا اموال فرد کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ یہ معاشرہ، جماعت، ریاستی نظام کی ملکیت ہوتی ہے اور اس پر انفرادی قبضہ مالکانہ حیثیت سے نہیں بلکہ محض وکالتی یا امانتی حیثیت سے ہوتا ہے۔جس کے لیے بہت سی شرائط وضوابط ہیں۔نیز بعض اموال کا شمار اموالِ عامہ میں ہوتا ہے جس پر کسی شخص کی انفرادی تحویل بھی برحق قرار نہیں دی جا سکتی۔ان تمام انفرادی تحویلات کا بھی ایک حصہ ایسا ہے جو مکمل طور پر معاشرہ کا حق ہے اور ریاست اس حصہ کو ایسے لوگوں سے واپس لے کر ان طبقات پر خرچ کر سکتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہو،تا کہ وہ اپنی مالی حالت کو درست کر سکیں اور یوں ان کی بہتری سے معاشرہ کی اجتماعی بہتری عمل میں آ سکے۔

خلاصہ گفتگو

(1) قرآن مال و دولت اور اراضی پر انفرادی حق ملکیت کو عینی ملکیت (Ultimate Possession) کی حیثیت سے بالکل بھی تسلیم نہیں کرتا۔اس سلسلہ میں آیاتِ قرآنی سے اس نظریہ کو ثابت کیا گیا۔

(2) جو مال و دولت اور اراضی انفرادی تحویل میں ہو،اس پر افراد کا امانتاً یا وکالتاً حق تصرف ہے۔ورنہ وہ سب معاشرہ یا ریاست کی اجتماعی ملکیت ہوتے ہیں۔

(3) اموال کی بھی دو اقسام ہیں:

(i) جن پہ وکالتی یا نیابتی حق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

(ii) جن پہ یہ حق بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(4) ایسے اموال یا وسائل پیداوار جن سے مفادِ عامہ وابستہ ہو،ان پر انفرادی تحویل کا سرے سے ہی کوئی حق تسلیم نہیں کیا

جاسکتا۔ جیسے پانی، آگ، سبزہ وغیرہ۔

(5) اجتماعی زندگی کی ضروریات ہر دور اور زمانہ میں یکساں نہیں ہوسکتیں۔ مندرجہ بالا تین اشیاء پر انفرادی ملکیت کا حق قطعی طور پر تسلیم نہ کرنے کی وجہ چونکہ ان کا مفادِ عامہ سے وابستہ ہونا ہے۔ لہٰذا اگر کسی دور میں کچھ مزید چیزیں بھی ایسی پیدا ہوجائیں جن سے افراد کا مفادِ عامہ وابستہ ہو تو ان اشیاء کو بھی بذریعہ قیاس اس فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے اور پھر ان پر بھی انفرادی حقِ ملکیت ختم ہوجائیگا۔

اب حنیف صاحب جس سرمایہ کاری کو انفاق کا نام دیتے نظر آتے ہیں تو قرآنی نظام میں تو انفرادی سرمایہ کاری اور منافع خوری کی تو سرے سے گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ اس میں سرمایہ سے مزید سرمایہ کمایا جاتا ہے جو کہ رباء کے زمرے میں آتا ہے اور پھر اس سے دولت صرف چند ہاتھوں میں ہی مرتکز ہونے لگتی ہے (پیچھے مثال سے بھی یہ چیز واضح کی گئی) جو قرآن کے اس حکم کی شدید خلاف ورزی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دولت کو گردش میں رکھو، اسے چند ہاتھوں تک مرتکز نہ ہونے دو۔

(6) حنیف صاحب نے ایک جگہ چیلنج دیا تھا کہ قرآن کہیں ایسا نہیں کہتا کہ کوئی انسان اپنی جائیداد، مویشی و مال وغیرہ کا مالک نہیں ہوسکتا، یہ قران پر تہمت ہے، اگر کسی کو اعتراض ہے تو دلائل پیش کرے۔ اب میں حنیف صاحب کو ببانگ دہل چیلنج دیتا ہوں کہ میں نے جو تصریحات ملکیت کے عنوان سے بمعہ قرآنی دلائل پیش کی ہیں، ان کا رد مجھے قرآن کریم کی رو سے پیش کرکے دکھائیں۔

Mohammad Hanif اگر انفاق کو سمجھنا ھے تو صرف ایک آیت ھی کافی ھے ــ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ـــــ 9/34

اے ایمان والو! بہت سے عالم اور راہب لوگوں کا مال ناجائز طریقہ پر کھاتے ہیں اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے رہتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ ترجمہ جناب محمد حسین نجفی صاحب

میرے نکتہ نظر کے مطابق ، انفاق کی تشریح کے لیے اس بہتر کوئی آیت شاید نہ ملے ـــــــــ غور فرمائین

چار باتیں بہت اہم بیان ھوئی ھیں ــ

1ـــ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ
یہ وہ شئے ھے جو آپ کی نظر میں شجر ممنوعہ ھے ــ

2 ــ بِالْبَاطِلِ ـــــ سمجھنے کی بات ھے ــ باطل کسے کہتے ھیں ــ اللہ نے لوگوں کا مال ان کی مرضی کے خلاف نہ کھانے کا حکم دیا ھے ــ اور آپ لوگوں سے اس ھی اللہ کے نام پر سب کچھ ، نظام ، بیت المال ، وغیرہ کے نام پر چھین لینا چاھتے ھیں ــ

3 ــــ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ــ یہ ھے انفاق کی ضد ــــــ کنز ــ عربی زبان میں ــــ کنز ــــ ابن فارس نے اس کے معنی کسی شئے کے اکھٹا ہونے کے کیے ہیں ــــــــ اور آگے سونا اور چاندی ــــ ایس حالت میں جمع کرنے کے معنی ھیں جو منجمد ھو جائے ــ جامد ھو جائے ــ کوئی تعمیری نتیجہ نہ نکال سکے ــــ

غور فرمائیں کیا کہہ رہا قرآن ــــــــ کہا ــــــــ تم لوگوں کا مال ناجائز طور سے نہ کھا جاو ــ یہ باطل عمل ھے ــــ

اور جو کچھ اللہ نے تمھیں عطا فرمایا ھے ــ اسے ایک جگہ جامد نہ کرو ــ بلکہ اپنی ضرورت پوری کرو جو بچ جائے اسے کسی ایسے منصوبے میں لگا دو جس کے نتیجہ میں ، تمھارے یہ وسائل سارے معاشرے میں خون کی طرح گردش کرنے لگ جائیں ــ جس سے معاشرے میں خوشحالی آئے ــ لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں ــــــــ

ــــ وَلَا يُنفِقُونَهَا ــ اور اگر تم ایسا نہیں کرتے ــ تو تم نے انفاق نہ کیا ــ

انفاق کا معنی کسی سے اس کا مال ، زمین ، زبردستی ھتھیانہ ھرگز نہیں بلکہ ، انفاق کا معنی ، اپنی زائد از ضرورت متاع ، کا ایسا استعمال ھے جو معاشرے میں تعمیری نتائج پیدا کرے ــــــــ

اپنی زائد از ضرورت متاع ، کو کسی حالت میں منجمد کرنے کی اجازت نہیں ھے ــ چاھے وہ بینک بیلنس کی شکل میں ھو ــ سونے چاندی کی شکل میں ھو ــ پلاٹوں کی شکل میں ھو ــــــــ کوئی بھی ایسا استعمال ، جو معاشرے میں اسانی اور اسودگی نہ پیدا کرے ، اس کی ممانعت ھے ــ

جاری ھے

حنیف صاحب اس آیت مبارکہ کا اکثر ذکر کرتے ہیں اور اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانے کی ممانعت ہے، پس انسان جو کچھ کماتا ہے، وہ اس کی ملکیت ہے جس سے اسے محروم کرنے کا کسی کو حق نہیں، اگر ایسا کوئی کرے گا تو ''لیاکلون الناس بالباطل'' کے زمرے میں آئے گا۔ اس سے یہ انفرادی ملکیت کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس آیت کی زد سیدھی حنیف صاحب کے ہی نظریات پر پڑتی ہے، بجائے اس کے کہ ان کا اپنا موقف درست ثابت کرے۔

اس میں یہ الفاظ ''اموال الناس'' کو سمجھنے میں غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ دراصل اموال الناس کا مطلب یہ نہیں کہ جو کسی نے کمایا، سارے کا سارا اس کا اموال بن گیا۔ میں نے پیچھے یہ واضح کیا کہ انسان کی کمائی میں زیادہ تر حصہ ان نعمائے خداوندی کا ہوتا ہے جو رب کی جانب سے بلا مزد و معاوضہ انسان کو ملتی ہیں، پھر انسان اپنے مال پر عینی ملکیت ہرگز نہیں رکھتا،

بلکہ اس کی ملکیت محض امانتاً یا وکالتی ہوتی ہے۔اگر وہ اس کا درست استعمال کرے گا تو اس کی ملکیت میں رہنے دی جائیگی،اور اگر غلط استعمال کرے گا تو ریاست اس سے اس ملکیت کا اختیار بھی واپس لے لینے کی پابند ہے۔

قارئین اپنی کمائی میں جس فاضلہ دولت سے یہ سرمایہ کاری کرنے اور لوگوں کو روزگار دینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں؟ وہ کن کا مال ہے؟ کیا وہ فاضلہ دولت سرمایہ کار کی ملکیت سمجھ لی جائے؟ نہیں۔وہ فاضلہ دولت ریاست کی ملکیت ہوگی جس سے وہ معاشرہ کے تمام محروموں اور ضرورتمندوں کو سامانِ رزق یکساں بنیادوں پر فراہم کرتے ہوئے ان کی ناہمواریوں کو دور کرے گی۔

اب غور کیجیے کہ جو فاضلہ دولت آپ نے انفاق کی شکل میں ریاست کو دینی تھی،اور جس سے وہ معاشرہ کے ضرورتمندوں تک پہنچنی تھی،اس سے آپ فیکٹریاں اور کارخانے لگانے کے چکروں میں ہیں۔تو کیا یہ ریاستی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہوگی؟ کیا یہ ان غریبوں کا مال باطل طور پر کھانے کے مترادف نہیں جو آپ انہیں پہنچانے کی بجائے اپنے تصرف میں لا کر ''مستفید'' ہو رہے ہیں؟ جو سرمایہ دار ایسا کرتا ہے،وہ خود لوگوں کا مال باطل طور پر کھاتا ہے،پس اس آیت کی زد میں آتا ہے۔

اسی طرح اس آیت میں معاشرہ میں موجود احبار و رھبان،مذہبی پیشوائیت وغیرہ کے بارے میں بھی بتایا گیا کہ وہ بھی لوگوں کا مال باطل طور پر کھاتے ہیں۔یعنی وہ خود کچھ محنت نہیں کرتے بلکہ گھر بیٹھے مذہبی نذرانے وصول کرتے رہتے ہیں۔

بالکل ایسی ہی صورتحال سرمایہ دار کی ہے جو خود کچھ نہیں کرتا بلکہ اس کا سرمایہ سرمائے کو کماتا ہے،اس کے کرائے کے مکان، کرائے کے پلازے،فیکٹریاں،شاپنگ مال،کارخانے وغیرہ سے اس کو گھر بیٹھے لوگوں کی محنت کی کمائی ملتی جاتی ہے۔کیا یہ لوگوں کا مال باطل طور پر کھانے کے مترادف نہیں؟

آگے لکھتے ہیں کہ ''اپنے مال سے اپنی ضرورت پوری کرو،جو بچ جائے،وہ کسی ایسے منصوبے میں لگاؤ جس سے تمہارے یہ وسائل سارے معاشرے میں خون کی طرح گردش کرنے لگ جائیں''۔جس سے معاشرہ میں خوشحالی آئے۔لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔''

حیرت ہے کہ اس سرمایہ کاری کے جواز میں ایسی کوئی بھی آیت قرآنی آج تک حنیف صاحب پیش نہیں کر سکے جو انہی الفاظ سے یہ ثابت کرتی ہو کہ جو اپنی ضرورت سے زائد ہو،وہ کاروباری منصوبوں میں لگا کر منافع خوری کرو۔جبکہ اس کے خلاف

میں بیسیوں آیات لگا کر واضح کر چکا ہوں کہ یہ حنیف صاحب کی صرف شعبدہ بازی ہے کہ اس سے معاشرہ میں تعمیری نتائج پیدا ہوتے ہیں، لوگ خوشحال ہوتے ہیں۔ دراصل سرمایہ کاری صرف سرمایہ کار کو ہی خوشحال اور امیر تر کرتی ہے۔ ملازمین کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں لاتی۔ میں نے پیچھے ایک فیکٹری کی مثال دی تھی، اسے ذرا دوبارہ پڑھ لیجیے اور بتائیں کہ آخر میں لوگوں کی حالت میں کیا تبدیلی آئی اور کیا سرمایہ دار کی دولت دوگنی تین گنی ہو کر واپس اس کی جیب میں نہیں آ گئی؟ کیا یہ انفاق ہے؟

متفرقاتِ حنیف

دو بنیادی تصورات (انفاق فی سبیل اللہ اور تصورِ ملکیتِ فرد واحد) پر حنیف صاحب اور قرآن کے نکتہ نظر کا تقابلی جائزہ آپ نے ملاحظہ کیا۔ اب میں چاہوں گا کہ مضمون کے اس آخری باب کے آخری حصہ میں حنیف صاحب کی جانب سے پیش کردہ متفرق نظریات و عقائد پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

Comment No:181 کیا قرآن میں غربت کے خاتمے کے واضح احکامات پر مشتمل کوئی آیت مبارکہ موجود نہیں؟

دیکھئے قرآن کریم پر کتنی بڑی تہمت لگائی جا رہی ہے۔ حنیف صاحب کی جسارت دیکھیے کہ کھلا چیلنج دے ڈالا کہ قرآن میں غربت کے خاتمے کی کوئی تعلیم نہیں ملتی۔ سچ پوچھیں تو میں نے اپنی یہ پوری کتاب انہی خرافات کے جواب میں لکھی ہے۔ اس پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ خود فیصلہ کریں کہ کیا قرآن میں غربت کے خاتمے کی کوئی تعلیم موجود نہیں؟ وہ امیر و غریب کا فرق خود برقرار رکھنا چاہتا ہے؟ خدا کو انسانی معیشت کی بہتری سے کوئی سروکار نہیں؟ کیا وہ صرف نماز روزہ تسبیح کا ہی پابند بنانا چاہتا ہے؟ آپ خود فیصلہ کریں کہ کون سچا ہے حنیف صاحب یا پھر وہ قرآن جس کی ساری تعلیم ہی معاشی مساوات کی تلقین پر مشتمل ہے اور جسے اس پوری کتاب میں واضح کر دیا گیا ہے۔

حنیف صاحب کا یہ سوال ہی Illogical ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت کیوں نہیں ہے کہ جہاں واضح طور پر غربت مٹانے کا حکم کچھ یوں ہوتا کہ ''دنیا سے غربت ختم کرو''۔ یہ اللہ کا اسلوبِ بیان نہیں ہے بھائی۔ اگر ایسا تھا تو اس نے ان کفار پہ کیوں تنقید کی اور انہیں احمق قرار دیا جو رسول اللہ ﷺ پہ معترض تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ اللہ اگر ہماری ہدایت چاہتا تھا تو وہ خود کیوں نہ ہمارے پاس آیا؟ یا کسی فرشتہ کو کیوں نہ بھیجا؟ ایسے ایمان کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو صرف کچھ نظریات پیش کرتا ہے اور غور و فکر اور تفکر و تدبر کے بعد ان پہ عمل کے ذریعہ بنیادی مقصد کی تکمیل کا تقاضہ کرتا ہے۔ انسان کو عقل اسی لیے

دی گئی ہے کہ وہ الہامی اشاروں کو سمجھتے ہوئے تدبر تفکر کے ذریعہ اپنے ہاں صحیح نظامِ زندگی قائم کرے۔

جیسے سورہ النحل میں شہد کی مکھی کی زندگی کو انسانوں کے لیے شفاء اور تدبر و تفکر کرنے والوں کے لیے اس کی حیات میں کارآمد نشانیاں موجود ہونے کی بات کی گئی۔ کیا اللہ تعالیٰ اس سورت میں شہد کی مکھی کی سرگرمیاں خود ہی بیان نہیں کر سکتا تھا؟ یقیناً وہ یہ سب بیان کر دیتا، مگر پھر شہد کی مکھی پہ غور و فکر اور تحقیق کون کرتا؟ کون اپنی عقل کو استعمال میں لاتا؟ جبکہ اللہ تو انسانوں کو عقل کے استعمال اور پھر حقائق تک پہنچنے کے لیے عقل کو وحی کے تابع رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔

رب العالمین کی کتاب قرآن کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور ممکن نہیں کہ اس نے انسانی زندگی کے سب سے بڑے مسئلہ (معیشت) پہ خاموش ہو۔ اور امیر غریب کا فرق ختم کرنے کی بات ہی نہ کرتا ہو۔ یہ پرلے درجے کی جہالت ہے۔ قرآن اس الزام سے پاک ہے۔ اس نے ایک متوازن اور بہترین نظام دے دیا ہے دنیا سے غربت و افلاس اور معاشی ناہمواریاں ختم کرنے اور اسے جنتِ ارضی بنانے کا۔ یہ پوری کتاب میرے اس موقف کی قرآنی تائید پر مشتمل ہے۔

اب بھی اگر قارئین میں سے کسی کی تسلی نہیں ہو پائی اور غربت و افلاس اور معاشی ناہمواریوں کے خاتمہ پر قرآن سے شواہد درکار ہیں تو ٹھیک ہے، وہ بھی پیش خدمت ہیں:

فی الحال میں وہ آیاتِ قرآنی پیش کرنا چاہوں گا جو واضح طور پر دنیا سے غربت کے خاتمے کے احکامات پر مشتمل ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ

(سورہ النحل۔ آیت 71)

اللہ نے تم میں سے بعض کو اکتسابِ رزق کی استعداد میں برتری دی ہے۔ جنہیں یہ استعداد زیادہ ملی ہے، وہ زیادہ رزق کو ان لوگوں کی جانب نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ کہ ''ایسے تو گدھا گھوڑا برابر ہو جائیں گے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ انہیں استعداد کی زیادتی اللہ کی جانب سے بطور نعمت ملی ہے، ان کے ذاتی ہنر یا اختیار و ارادہ کی حاصل شدہ نہیں۔

اس آیت جلیلہ کے اس واضح حکم پر غور کریں، کہ جو لوگ زیادہ کماتے ہیں، وہ اپنی فاضلہ دولت کو ان کم کمانے والوں کی جانب نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اور جواب طلبی پر یہ موقف دیتے ہیں کہ ''ایسے تو وہ ہمارے برابر کھڑے

ہوجائیں گے‘‘۔یہ تو پھر اس حقیقت سے انکار ہوا کہ انکی استعداد کی زیادتی اللہ کی جانب سے دی ہوئی نہیں، بلکہ ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔

اس آیت پر بار بار غور وفکر کیجیے اور سوچیئے کہ اللہ تعالیٰ کیا زیادہ کمانے والوں اور کم کمانے والوں کی معاشی مساوات کا واضح حکم نہیں دے رہا؟ اور زیادہ کمانے والے اس حکم کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر رہے کہ نہیں بھئی۔’’اس طرح تو یہ لوگ ہمارے برابر آجائیں گے۔گدھا گھوڑا ایک سے ہوجائیں گے۔انہیں ہم اپنی فاضل کمائی نہیں دے سکتے۔انہیں غریب ہی رکھا جائیگا۔

اس قارونی جواب پر اللہ انہیں وعید دیتا ہے کہ کیا تم اللہ سے کفر کر رہے ہو؟ جو اپنی استعداد کی زیادتی کو اپنی ہی پیدا کردہ سمجھ رہے ہو؟ اگر تمہیں میں نے زیادہ دیا ہے تو اوقات سے باہر مت نکلو۔تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ جو تم نے کمایا ہے یہ تمہارا کدھر سے ہوگیا؟ حواس خمسہ میرے، دماغی صلاحیتیں میری دی ہوئیں، وسائل پیداوار اور زمین جس سے تم پیداوار لیتے ہو، جس پر تم فیکٹریوں پر فیکٹریاں اور پلازے ومکانات تعمیر کرتے ہو، یہ کس کی دی ہوئی ہیں؟؟؟ یہ سب میرا ہے، تمہارا نہیں۔ اور میری ملکیت ہر انسان کے لیے کھلی ہے۔اس لیے تم سب کی جانب سے اس زمین و وسائل پیداوار کے ذریعے کمائی بھی میری ہی مرضی کے مطابق ہوگی۔اب حنیف صاحب کو اس قدر واضح آیت نظر نہیں آسکی اور قرآن پر اتنی بڑی تہمت لگا بیٹھے کہ یہ معاشی مساوات کا قائل نہیں۔یاللعجب۔

(2) اسی طرح غربت کے خاتمہ کی واضح ہدایات پر مشتمل ایک اور آیت آپ کے پیش خدمت ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (سورہ یٰس۔آیت 47)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ سامان زندگی اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے دوسرے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی دو (انفاق)، تو جو لوگ اللہ کے اس نظام پرورش سے انکار کرتے ہیں، وہ ان لوگوں سے جو اس پہ ایمان رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اگر اللہ کی یہی مرضی تھی کہ رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے، کوئی محروم نہ رہے تو اس خدا نے خود ہی ایسا کوئی انتظام کیوں نہ کر دیا کہ ان سب کو روٹی ملتی رہے (انسانوں سے ہی کیوں کہا کہ تم ایسا نظام قائم کرو کہ پورے معاشرے کی ضروریات پوری ہوتی جائیں)۔

انہیں کون بتائے کہ یہ کس قدر کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔(انہیں یہی معلوم نہیں کہ انسانی معاشرہ میں اللہ کے یہ فرائض انسانوں کے ہاتھوں پورے کروائے جاتے ہیں)۔مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے اختیار وارادہ کا درست استعمال کرتے ہوئے اپنی ذات کی نشوونما کرے۔ورنہ اللہ کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ جیسے اس نے کائنات مجبور پیدا کی ہے، انسانوں کو بھی مجبور بنا دیتا۔وہ اسکے احکام پر چلتے جاتے۔انسان دراصل خود کو اختیار وارادہ کے شرف سے محروم کر کے اپنی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا ہے۔یہی اس کی کھلی گمراہی اور بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

اب یہاں اللہ کی جانب سے انفاق کے حکم پر اس نظام کے منکرین کی جانب سے دئے جانے والے اس جواب پر کہ ''اللہ نے خود کیوں ان کی روٹی (اطعمہ) کا انتظام نہیں کر دیا'' اور انفاق اور طعام کے باہمی تعلق پر، حنیف صاحب جیسے انسانوں کے لیے دعوتِ فکر ہے جو کہتے ہیں کہ ''انفاق سے مراد یہ نہیں کہ میں اپنی فاضلہ دولت کسی چوراہے میں جا کر رکھ دوں''۔

آگے حنیف صاحب فرماتے ہیں کہ اسلامی ریاست صرف لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی پابند ہے، لیکن اللہ نے کہیں بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ سب کو بریانی، تکے، نہاریاں اور کباب کھلاؤ۔یا سب کو ہزار گز کے بنگلے دلواؤ۔

واہ جناب۔کیا خوب تجزیہ کیا ہے اللہ تعالیٰ کی منشاء کا۔''مزاج شناس رسول'' تو دیکھے ہی تھے، لیکن حنیف صاحب سے ملاقات کے بعد علم ہوا کہ ''مزاج شناسِ خدا'' بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ غریب لوگ KFC، میکڈونلڈز یا کسی فائیو سٹار ہوٹل وغیرہ کے قریب بھی پھٹکیں۔بریانی، تکے، نہاری، کباب، پیزہ، مٹن کڑاہی وغیرہ کی خواہش کریں۔شاندار شاپنگ مالز اور بڑے بڑے کاروباری اداروں میں نظر آئیں۔غریب کی کیا مجال کہ وہ بڑی سی لینڈ کروزر، فیراری اور مرسڈیز کو خواب میں بھی دیکھے۔یا بڑے بڑے بنگلے کوٹھیوں کی حسرت کرے؟

یہ سب آسائشیں اور سہولتیں صرف سرمایہ داروں کے لیے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے یہ سب آسائشات صرف سرمایہ داروں کے لیے مختص کر رکھی ہیں۔ضروری نہیں کہ ساری دنیا کے انسان ان سے لطف اندوز ہوں۔اللہ ہرگز ایسا نہیں چاہتا۔جو غریب ہیں، ''استطاعت نہیں رکھتے''۔وہ ایسی آسائشات کا سوچیں بھی مت۔''آرام سے اپنے گھروں میں رہ کر جو روکھی سوکھی دال روٹی ملتی ہے، اس پر قناعت کریں۔اپنے سے نچلوں کو دیکھیں اور اللہ کا شکر کریں کہ انہیں یہ روکھی سوکھی بھی مل رہی ہے۔(ساتھ سرمایہ دار کا بھی شکریہ ادا کریں کہ اس نے یہ بھی نہیں چھین لی)۔دنیا کی خوشحالیوں کی تمنا کرنے والے آخرت

میں کچھ نہیں پاسکیں گے۔اگر غریب کی دنیا محرومی ومسکنت میں گزر رہی ہے تو کیا ہوا؟ آخرت غریبوں کی ہی ہے۔مرنے کے بعد یہ سب ملے گا۔جو دنیا میں جتنا زیادہ غریب ومحروم ہوگا،اللہ کے نزدیک اتنا ہی باعزت اور کامیاب تصور ہوگا۔''

تو یہ ہے وہ نظریہ جسے حنیف صاحب اللہ کی جانب منسوب کررہے ہیں کہ وہ معاذاللہ معاشی مساوات کا قائل نہیں۔میں اس ضمن میں کچھ آیات قرآنی پیش کرنا چاہوں گا جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ اللہ تعالیٰ جو نظام یا دین پیش کرتا ہے،اس کے قیام کے بعد سامنے آنے والی انسانی معاشرہ کی تصویر کس قسم کی ہے؟

قارئین میں نے گزشتہ ابواب میں قرآنی نظام کے قیام کی تیسری منزل کے عنوان کے تحت اس بات کی وضاحت کی تھی کہ جب جماعت مومنین قلبی تبدیلی کے عمل سے گزرنے کے بعد اجتماعی نظام کے قیام کے لیے تیار ہوجاتے ہیں تو ریاست ان کے ساتھ ایک معاہدہ کرتی ہے جس کا قرآن نے یوں ذکر کیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

(سورہ التوبہ۔آیت 111)

اللہ (قرآنی ریاست) نے مومنین سے ان کی جان و مال خرید لیے اور اس کے بدلے میں انہیں جنت دینے کی ذمہ داری لے لی۔

یہ معاہدہ افراد مملکت اور اسلامی ریاست کے درمیان ہوتا ہے جس کے متعلق تفصیلی وضاحت پیچھے کی جا چکی ہے۔فی الحال یہ بتانا مقصود ہے کہ اس معاہدہ پر عمل کے نتیجہ میں جو قرآنی معاشرہ قائم ہوتا ہے اور اسلام پر عمل کے نتائج اسی دنیا میں مرتب ہونے لگتے ہیں،ان کے تحت معاشرہ کا نقشہ کیسا ہوتا ہے؟ آیئے اسکی وضاحت کے لیے ایک واضح آیت مبارکہ ملاحظہ کریں:

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَى (سورہ طٰہٰ۔آیت 118)

اس معاشرہ میں نہ تمہیں بھوک کا خوف ہوگا،نہ کپڑوں کی فکر،نہ پیاس کی تکلیف ہوگی نہ مکان کی تنگی

دوسری جگہ اس جنتی معاشرہ جو دنیا میں بھی دین پر عمل سے قائم ہوتا ہے،کی کیفیت یوں بیان کی کہ:

وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا (سورہ البقرہ۔آیت 35)

انسان جہاں سے چاہے،نہایت فراوانی سے کھاپی سکے گا۔

قارئین غور کیجیے کہ اقامتِ دین کے نتیجہ میں قائم ہونے والے جنتی معاشرہ کی کیفیات کیا بیان کررہا ہے رب۔نہ اس میں کسی

انسان کو بھوک کا خوف ہوگا نہ کپڑوں کی فکر، نہ خوراک کی فکر ہوگی نہ رہائش کی۔اور آیت زیریں میں اس حقیقت کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ بے خوفی و بے فکری انہی کے لیے ہوگی جو ہدایت کی پیروی کرتے ہوئے دین کو قائم کر چکے ہونگے۔ فرمایا کہ:

فَمَن تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُون (سورہ البقرہ۔آیت 38)

ان لوگوں کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ پریشانی

لیکن حنیف صاحب کہہ رہے ہیں کہ خدا نے معاشی مساوات کی بات ہی نہیں کی، ۔نہ وہ ایسا چاہتا ہے (معاذ اللہ)۔سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے دین پر عمل کے نتیجے میں یہ جن آیات کا تذکرہ میں نے کیا ہے، ان کا کیا مفہوم ہے؟ کیا آخری آیت سے یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ جنتی معاشرہ میں انسان کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔نہ خوراک کی، نہ معاش کی نہ رہائش کی، اس کا صاف یہی مطلب ہے کہ یہ جو علامات غربت کے تحت انسان میں رونما ہونے کی بتائی جا رہی ہیں، ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہ جائیگا، جب دین کے قیام کے تحت قرآنی ریاست کا قیام عمل میں آجائیگا۔

پھر یہ جو حنیف صاحب کا کہنا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ ہر انسان بریانی، تکے کباب کھائے، ہزار گز کے بنگلے میں رہے تو حنیف صاحب کی یہ غلط فہمی بھی دور کیے دیتے ہیں:

''پہلے انسانوں کی بنیادی ضروریات (خوراک، لباس رہائش) کے جنتی معاشرہ کے قیام کے بعد پورا ہونے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔اب آگے آسائش و زیبائش (Luxuries) کا بھی اسی جنتی معاشرہ میں میسر ہونے کا اشارہ دیا گیا ہے۔

''سونے کے کنگن، جواہرات سے بھرے، ریشمی لباس (سورہ الحج۔آیت 23) کھانے کی میز پر سونے کی پلیٹیں، اشیائے خوردونوش سے بھرے خوبصورت پیالے اپنے کھانے والوں کے گرد گردش کرتے ہوئے، اس کے بعد مختلف انواع کے کھانے کی اشیاء کے ڈھیر (سورہ زخرف۔آیت 71)، بیٹھنے کے لیے صوفے، چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالوں کو لے کر گھومنے والے، باریک ریشمی ملبوسات، ریشم کے پردے، (سورہ الدھر۔آیات 21-17)، پسندیدہ پرندوں کا گوشت (سورہ الواقعہ۔آیت 21)، تہہ بہ تہہ کیلے، گھنے سائے، آبشاریں (سورہ واقعہ۔آیات 33-28)

قارئین ذرا ان قرآنی تفاصیل پر غور کیجیے اور سوچیے کہ کیا اتنی واضح آیات کے بعد اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن معاشی مساوات کا قائل نہیں؟ رب امیر غریب کا فرق مٹانا نہیں چاہتا؟ یہ آسائشیں اس وقت بھی ایران و روم کی فتح سے مسلمانوں کو

میسر آئی تھیں جب حضرت عمرؓ کے دور میں انہوں نے یہ جنتی معاشرہ قائم کیا تھا۔ جہاں کوئی محروم نہیں تھا، کوئی مسکین، لاچار، بے سہارا یا غریب باقی نہیں رہا تھا۔ ریاست کی آمدن اس قدر بڑھ چکی تھی کہ لوگوں کے گھر بیٹھے وظائف تک لگا دیئے گئے تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت حسین، حضرت حسن اور دیگر صحابہ کرام اور ان کی اولادیں گھر بیٹھے وظائف حاصل کر رہی تھیں۔ یہ تھی وہ جنت جو آدم کی جانب سے گم کر دیے جانے والی جنت کے بعد ایک بار پھر انسانوں کو میسر آ چکی تھی۔ اور یہ سلسلہ پوری دنیا تک پھیل جانا تھا اگر یہودی و مجوسی سازشوں کے ذریعے فاروق اعظمؓ کو شہید نہ کر دیا جاتا۔

دراصل ہماری اپنی سوچ بیمار ہے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ جو امیر غریب کا فرق شروع دن سے چلا آ رہا ہے، اسے ہم اللہ کی جانب منسوب کر ڈالتے ہیں۔ لیکن کائنات کی دیگر مخلوقات پر نگاہ ڈالنے کی زحمت نہیں کرتے کہ کیا ان میں بھی ایسے طبقات موجود ہیں؟ وہ جو نظامِ فطرت کے تحت اللہ کے دیئے ہوئے قوانین پر عمل پہ مجبور ہیں۔ انسان کو اختیار دیا گیا، پس اسی نے یہ عدم مساوات قائم کی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے صرف تقسیمِ کار کے اصول کے تحت انسانی صلاحیتوں میں ہی فرق رکھا ہے، معاشی فرق اس نے ہرگز نہیں رکھا۔ یہ انسانوں کی اپنی اختراع ہے۔ جب زیادہ صلاحیتوں والے بھی اسی رب کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور کم صلاحیتوں والے بھی اسی رب کی تخلیق ہیں تو پھر ان دونوں کی معاش کا فیصلہ بھی اسی رب کی مرضی سے ہی ہوگا۔

پھر حنیف صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ نہیں چاہتا کہ انسان روٹی کے لیے انسان کا محتاج ہو، لیکن ساتھ ہی اس کی تشریح یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اللہ روٹی کے لیے حکومتی بیت المال کا محتاج نہیں رکھنا چاہتا۔ اس لیے سرمایہ دار ہی انسانوں کی روٹی کا انتظام کریں۔

یعنی حکومت سے مانگنا محتاجی ہے، لیکن سرمایہ دار کی غلامی اور اس کی ملازمت اختیار کرنا محتاجی و محکومی نہیں۔ قرآن واقعی کسی انسان کو روٹی کے لیے انسان کا محتاج نہیں ہونے دینا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انفرادی زندگی گزارنے کی بجائے ایک ریاست قائم کرنے کا حکم دیا ہے جہاں تمام انسان ایک ریاست کی جانب سے دی جانیوالی ذمہ داریوں کے تحت کام کرتے اور اس سے معاوضہ پاتے ہیں۔ ریاست ہی انسانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ انسان اپنی زائد کمائی دوسرے ضرورتمندوں کو دینے کا پابند ہے۔ لیکن اس امر کے لیے اللہ نے انسان کو انسانوں کا محتاج نہیں بنایا۔ وہ ان دینے والوں اور لینے والوں کے بیچ میں ریاست کو لاتا ہے۔ کہ ریاست زائد کمائی والوں سے لے کر کم کمائی والوں کو دے۔ تاکہ کوئی

کسی فرد واحد سے لینے میں ذلت وشرمندگی محسوس نہ کرے۔ نہ کوئی سرمایہ دار انفرادی طور پر کسی انسان کو اپنے استحصال کا نشانہ بنا سکے۔ ریاست کا کردار ایک 'تھرڈ پارٹی' یا ثالث کا ہے۔ جو امیروں سے لے کر غریبوں کو دے گی۔ یوں کوئی انسان کسی انسان سے رزق لینے کے لیے ذاتی طور پر اس کا محتاج نہیں ہوگا۔ کیونکہ روٹی کے لیے انسانوں کی غلامی انسان کی صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے۔ دوسری جانب سرمایہ داروں کو من مانا استحصالی رویہ اپنانے اور بلیک میل کرنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ انسان تو ایک طرف رہا، جانور تک بھی اگر رزق کے لیے کسی انسان کا محتاج ہو جاتا ہے تو وہ بھی انی فطری خصائل اور صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے۔ جنگل کے شیر اور سرکس کے شیر، جنگلی بھینسوں اور باڑے میں بندھی بھینسوں میں فرق آپ جانتے ہی ہونگے۔

اس لیے یہ جو قرآن نے اطیعو اللہ واطیعو الرسول کا عظیم الشان حکم دیا ہے، اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ کی کتاب کی اطاعت کرو، اور پھر اس کتاب پر چلانے والے مرکزِ ملت کی اطاعت کرو۔ مرکز ملت یا معاشرہ کچھ انسانوں کے ذمہ کچھ ذمہ داریاں لگاتا ہے۔ جو انہیں پوری کرنی ہوتی ہیں، اور انہیں ریاست کی جانب سے معاوضہ اور ضروریات زندگی پوری کرنے کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔

قرآنی معاشرہ میں سب افراد حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور وہ ان سب کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے اور ان کو سامانِ نشوونما دینے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کا فرق یوں سمجھ لیں کہ ایک مزدور اور انجینئر ایک مکان تعمیر کر رہے ہیں، مزدور کچھ معاوضہ لے رہا ہے، جبکہ انجینئر اس سے کئی گنا زیادہ کما رہا ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ یہ دونوں آپس میں بھائی ہیں اور انہیں اپنے گھر کی تعمیر کرنی ہے۔ اب دیکھیے کہ یہاں صورتحال کیسے تبدیل ہو جائے گی۔ معاوضہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے ذمہ ایک کام ہے جسے انہوں نے پورا کرنا ہے۔

یہی صورتحال قرآنی ریاست کی ہے کہ وہ تمام افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے ہی گھر کا کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسے وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ادا کرتے ہیں (یہی ان کی صلوٰۃ ہے)۔ انجینئر، مزدور، بڑھئی، لوہار، سنار، تاجر، معمار، حجام وغیرہ سب ریاستی ملازم ہیں۔ یہ سب اپنے کنبہ کی معاش چلانے کے لیے ہی کمائی کرتے ہیں۔ تو اگر ان کی معاش کی ذمہ داری ریاست اپنے ذمہ لے گی تو پھر معاوضہ لینے یا زائد کمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ سب اپنا اپنا کام کر رہے ہونگے اور سب کی ضروریات زندگی ریاست پوری کر رہی ہوگی۔ بہت آسان نکتہ ہے۔ اس میں کسی قسم کا الجھاؤ

یا پیچیدگی نہیں۔

اس لیے حنیف صاحب کا یہ فرمانا بہت ہی غلط ہے کہ روٹی کے لیے بیت المال یا ریاست کی محکومی عام آدمی کے لیے ہتک آمیز ہوگی۔ یہ سوچ غلط نگہی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ایسا تصور قائم کرتے وقت آپ کے ذہن میں ریاست بھی اپنے جیسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ لیکن آپ کی فکر کی ریاست اور قرآنی ریاست میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کی کوشش مت کریں۔ یہ ریاست زرداروں، شریفوں، جاگیرداروں، دولتانوں، ٹوانوں، کھروں اور بھٹوؤں سے تشکیل نہیں پاتی۔ یہ ریاست جماعتِ مومنین قائم کرتی ہے جن کی خصوصیات قرآن نے یوں بتائی ہیں کہ ''وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔''

قرآنی ریاست سے لینے والا ہرگز محتاجی محسوس نہیں کرتا۔ البتہ ایک سرمایہ دار، محلّہ دار، انسان، تاجر یا اپنے افسر بابو سے لینے والا ہی محتاجی، ذلت محسوس کرتا ہے جو اسے دیتا بھی ہے تو احسان جتا کر۔ کام کروا کر، یا ذلیل کر کے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری و ساری ہے۔

Mohammad Hanif ـــــ دوسری بات میرے بھائی

ذھن سے اس باطل تصور کو نکال دیں کہ مال سے کوئی آمدنی ھوتی ھے ـــــ

کاروبار میں انسان کی صلاحیتں ھی کامیابی کا تعین کرتی ھیں ـــ

ھم نے سینکڑوں ایسے لوگ دیکھے ھیں جو دیار غیر سے کڑوڑوں کما کر لائے ، اپنا کاروبار کیا ـــ ناکام رھے ـ کمانا تو دور کی بات ھے ـــ اپنا اصل زر بھی ضائع کر بیٹھے ـــ

مال پر آمدنی صرف ایک طریقہ سے ھوتی ھے ـ وہ سود ھے ـــ جسے اللہ نے حرام قرار دیا ھے ـــــــ

ورنہ مال کسی طرح کی کوئی آمدنی نہیں دے سکتا ـ اگر اس مال کے ذریعے کاربار کرنے والا اچھی صلاحیت کا مالک نہ ھو ـــ

کمائی انسان کی صلاحیت ھی سے ھوتی ھے ـــ اس کی محنت سے ھوتی ھے ـــ

اور ھاں یہاں یاد آیا ـــــ ھمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت خدیجہ رض کے مال سے تجارت کیا کرتے تھے ـــــ اور حضرت خدیجہ رض کو گھر بیٹھے منافع دیا کرتے تھے ـــــ آپ کے خیال میں وہ کیا تھا ؟؟؟؟؟؟؟

Comment NO : 178

فرماتے ہیں کہ صرف مال سے آمدنی نہیں ہوتی ،کاروبار میں انسان کی صلاحیتیں ہی کامیابی کا تعین کرتی ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہم نے دیکھے ہیں جو کروڑوں روپیہ لگا کر بھی کاروبار میں نقصان اٹھا بیٹھے۔اصل زر بھی ضائع ہوگیا۔

حنیف صاحب سے سوال ہے کہ کیا سرمایہ دار ہر جگہ صرف صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہی کما رہا ہے؟ وہ اپنی محنت سے ایک فیکٹری لگاتا ہے، پھر اس سے حاصل ہونے والے منافع سے دوسری فیکٹریاں لگاتا چلا جاتا ہے، اور خود گھر بیٹھے وہاں سے بھی لوگوں کی محنت کی کمائی سے منافع وصول کرتا ہے۔وہاں اس کی کونسی صلاحیت کمارہی ہوتی ہے؟

یہ مکانات اور پلازے دکانیں تعمیر کروا کر کرائے پر دیتا جاتا ہے۔اور خود گھر بیٹھا اپنے بینک اکاؤنٹ میں کرایہ جات ٹرانسفر کرواتا رہتا ہے۔وہاں اس کی کونسی صلاحیت کمارہی ہوتی ہے؟

سینکڑوں ایکڑ زرعی اراضی خرید کر غریب لوگوں کو مزارعت یا بٹائی پر دیتا ہے۔وہ سارا دن سخت دھوپ میں وہاں خون پسینہ ایک کر کے فصل کی کاشت سے پیداوار حاصل کرتے ہیں اور سال بعد زمین دار صاحب ان کی محنت کی کمائی سے حصہ دار بن جاتے ہیں۔وہاں سرمایہ دار اور جاگیردار کی کونسی صلاحیت کمارہی ہوتی ہے؟

حیرت ہے کس قدر غلط نکتہ نظر پیش کیا گیا ہے ان کی جانب سے۔سرمایہ دار ہر جگہ صرف سرمایہ کے بل بوتے پر ہی کماتا ہے۔بے شک کچھ انسانوں میں صلاحیتیں بھی موجود ہوتی ہیں، لیکن سرمایہ دار ہر جگہ اپنی صلاحیتیں ہی استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کا صرف روپیہ روپے کو کماتا ہے۔اس لیے یہ کہنا بھی درست نہیں کہ کاروبار میں کامیابی کا تعین صرف صلاحیتیں ہی کرتی ہیں۔

آپ کے پاس صلاحیتیں نہیں، چٹے ان پڑھ اور گنوار ہیں، لیکن آپ کو باپ دادا کی طرف سے سینکڑوں ایکڑ زمین وراثت میں ملی ہے تو آپ اسی سے دولت کما رہے ہیں۔ادھر صلاحیتوں کی تو ضرورت ہی نہیں پڑی۔

اس کے برعکس آپ بے شمار خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں، آئی ٹی سکلز میں آپ کو مہارت حاصل ہے، انگریزی آپ فرفر بولتے اور سمجھتے ہیں، بزنس ٹیکٹکس میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، لیکن آپ کے پاس صرف سرمایہ نہیں ہے تو کیا آپ اپنا کاروبار کر سکتے ہیں؟؟؟

نظامِ سرمایہ داری: بے وقوفوں اور نا اہلوں کی ہونہار اور ذہین لوگوں پر حکومت کا دوسرا نام

نظامِ سرمایہ داری میں بنیادی ایمان یہ ہوتا ہے کہ کسی کی ملکیت میں کوئی دوسرا مداخلت (Interfere) نہیں کر سکتا۔ یہ نظام سرمایہ داری کا نظریہ ہے جسے وہ بطور آئیڈیالوجی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ جبکہ قرآن کے نزدیک یہ دو قسم کے نظریات ہیں جن کے اندر آپس میں ہی ٹکراؤ کا عمل جاری رہتا ہے۔ ان میں ایک نظریہ یہ ہے کہ ''پہلے مال یا روپے کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرنا اور پھر سرمایہ کاری یا روپے کی بناء پر دوسروں سے روپیہ کا معاوضہ یا روپے کی پیداوار وصول کرتے چلے جانا۔ یہ ہے کیپٹلزم۔ ساتھیو اس میں صرف سرمایہ ہی کماتا ہے۔ صلاحیتوں وغیرہ کا کردار ہی ختم ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار چاہے کتنا ہی بدھو اور گنوار ہو، چٹا ان پڑھ ہو، وہ کسی جگہ Invest کر کے کتنے ہی قابل لوگوں کو اپنے تابع ملازم رکھ کر ان کی محنت کا حاصل صرف سرمایہ کے بل بوتے پر گھر بیٹھا مقناطیس کی طرح کھینچتا چلا جائے گا۔ یہی نظام جس میں صرف سرمایہ ہی زیادہ روپیہ لے کر آتا ہے نظامِ رباء کہلاتا ہے جسے اللہ و رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف کہا گیا ہے۔

ہمارے ہاں غلطی یہ ہوئی کہ ہمارے دورِ ملوکیت میں اس رباء کا ترجمہ سود کر دیا گیا اور اسے ایک خاص نہج کے سود تک محدود کر دیا گیا، اور اسے تو حرام قرار دے دیا گیا، جبکہ اس کے سوا کیپٹلزم کی ہر شکل جس میں محض روپیہ لگا کر روپیہ کمایا جاتا ہے، حلال قرار دے دی گئی اور اس کے دفاع کے لیے پھر مذہبی پیشوائیت کو بیچ میں لایا گیا جس نے ''شرعی'' بہانے سازیاں کر کر کے صرف قرضہ پر لیا جانیوالا سود تو حرام کہا، مگر رباء پر مبنی منافع خوری کو شیرِ مادر کی طرح حلال قرار دے لیا۔ جسے قرآن نے اللہ و رسول کے خلاف جنگ قرار دیا تھا۔ آج جائز سمجھا جاتا ہے۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ صرف صلاحیتیں کمائی کی ضامن نہیں ہوتیں۔ مائیکروسافٹ کا بل گیٹس کیا کر رہا ہے؟ کتنی صلاحیتوں کا مالک ہے؟ وہ تو صرف سرمایہ دار ہے۔ سرمایہ کے بل بوتے پر کمپنی چلائی جا رہی ہے۔ صلاحیتوں کے مالک تو دراصل اس کے وہ تنخواہ دار ملازم ہیں جن کے متعلق وہ فخر سے کہتا ہے کہ ''میں نے زندگی میں کبھی بھی اول پوزیشن حاصل نہیں کی، لیکن آج بڑے بڑے اول پوزیشنز حاصل کرنے والے (Toppers) میرے ملازم ہیں''۔

وہ لوگ اپنی صلاحیتوں سے کام کرتے ہوئے بل گیٹس سے صرف تنخواہ پاتے ہیں، جبکہ بل گیٹس ان کی محنت کی کمائی میں اتنا کچھ لے جاتا ہے کہ اگر اس کا سو ڈالرز کا نوٹ زمین پر گر پڑے تو وہ اسے اٹھاتا نہیں، کیونکہ جتنا وقت اسے وہ نوٹ اٹھانے میں لگے گا، اس میں وہ دو تین سو ڈالرز مزید کما چکا ہوگا۔

باقی رہی روپیہ ڈوب جانے کی بات تو یہ جو لوگوں کے کروڑوں روپیہ سرمایہ کاری میں ڈبو دینے کی بات آپ کر رہے ہیں، یہ چند استثنائی کیس ہوتے ہیں جنہیں عمومی منظر نامہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ عمومی منظر نامہ وہی ہے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں جس سے آپ نے بھی یہ کہہ کر بالواسطہ اعتراف کیا ہے کہ "مال پر آمدنی صرف ایک ذریعہ سے ہوتی ہے۔ سود۔ یعنی الرباء۔ اور یہ الرباء وہی ہے جو ایک شخص کو سرمایہ دار بناتا ہے۔

اگر کسی جگہ صرف صلاحیتوں کے بل بوتے پر کوئی کما بھی رہا ہے تو پھر سوال یہ بھی تو پیدا ہوگا کہ کیا یہ صلاحیتیں خود اس کی پیدا کردہ تھیں یا اسے اللہ نے دی تھیں؟ پھر وہ اپنے رزق کو اس رب کی مرضی کے مطابق دوسرے ضرورتمندوں کو بھی کیوں نہیں دیتا جس نے اسے یہ صلاحیتیں دیں اور زیادہ کمانے کے قابل بنایا۔؟؟؟ ساتھیو بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی ہے کہ انسان جس پہ اتنا اکڑتا ہے، وہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اس کے اپنے پلے کچھ بھی نہیں۔

Mohammad Hanif اس لیے میری آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ کا وہ نوٹ نامکمل ہوگا جب تک آپ اس میں دنیا سے غربت ختم کرنے کا قرانی فارمولہ نہ پیش کریں۔ جو موثر ترین اور قابل عمل بھی ہو۔۔۔ آپ کو ایسا فارمولا پیش کرنا پڑے گا۔ اگر آپ ایسا نہ کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر آ کے خیال میں دین اسلام تو پھر کوئی انسانی فلاحی منصوبہ پیش نہیں کر سکتا۔

دنیا سے غربت کا خاتمہ تو وہ پہلی اسلامی حکومت بھی نہ کر سکی تھی جس کی قیادت وقت کا نبی کر رہا تھا ——
علامہ اقبال رح کا ایک شعر ہے —— فرمایا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

یہ کشمکش تو ہمیشہ چلتی رہے گی ۔ نہ جانے آپ کسی سے اس کے ہتھیار چھین کر فتح کیوں چاہتے ہیں ۔ آپ کا انداز فکر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی نے چھری سے قتل کر دیا ، تو چھری پر ہی پابندی لگا دی جائے ۔ نہ چھری ہوگی اور نہ قتل ہوگا ——

ارے میرے بھائی —— چھری بھی قائم رہے ۔ اور لوگوں کی اصلاح بھی ہو جائے ، کہ وہ اس سے پھل کاٹ لیا کریں ۔ قتل نہ کریں ۔

ارشاد باری تعالٰی ہے ——

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (١٥٥) الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (١٥٦) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔
2/155

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے (155) اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ: "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے" (156) انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں ۔
ترجمہ جناب مودودی صاحب

یہ سب گردشیں ھیں ۔ کسی کو مال کی فراوانی دے دی ۔ کسی کو علم کی ۔ کسی کو ھنر کی ۔ اور پھر وہ کاریگر بڑی نفاست سے گردشیں دئے جا رھا ھے ۔ بلکل اس طرح جیسے ، دودھ کی گڑوی میں ھم مدانی چلاتے ھیں ۔ تاکہ دودھ کا اصل ست ، یعنی مکھن اوپر آ جائے ۔ بلکل اس ھی طرح ، وہ سعید روحیں اپنی نشوونما کر کے ، زندگی کی آگے کی منازل طے کرنے کے قابل ھو جائیں گی ۔

فرماتے ہیں کہ دنیا سے غربت کا خاتمہ تو انبیاء بھی ختم نہ کر پائے ۔وہ قارئین جو یہ پوری کتاب پڑھ چکے ہیں،اب فیصلہ کریں کہ قرآن کی رو سے دنیا سے غربت وافلاس کا خاتمہ ممکن ہے یا نہیں؟ کس قدر بہترین حل پیش کیے ہیں اللہ نے انسانوں کی معاشی مساوات کے لیے۔

اب جہاں تک حنیف صاحب کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ نبی بھی غربت ختم نہ کر پائے تو میں ان سے ایک سوال کرنا چاہوں گا کہ اگر ایک مریض کو اگر دورانِ مرض ڈاکٹر ایک دوائی تجویز کرے،اور وہ چند روز یا ایک ہفتہ تک وہ دوائی استعمال کرتا رہے اور یوں صحت یاب ہو جائے ۔لیکن صحت یاب ہو جانے کے بعد وہ دوائی کا استعمال ترک کر دے جو اسے ڈاکٹر نے ایک ماہ تک استعمال کرنے کا کہا تھا تو اسکے ساتھ کیا ہوگا؟ بیماری پھر واپس لوٹ آئے گی نا؟

اسی طرح ذیابیطس کا ایک مریض ڈاکٹر کی تجویز پر انسولین کا انجکشن لگواتا ہے جس سے اسکا شوگر لیول ان کنٹرول رہتا ہے ۔اب ایک دو ماہ بعد وہ انسولین کے استعمال کو ترک کر دیتا ہے تو اس کے جسم میں شکر کی مقدار پھر سے بڑھ جاتی ہے اور مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں ۔تو بات یہ ہے کہ مریض نے جب خود ہی دوا کا استعمال ترک کر دیا تو اب وہ ڈاکٹر سے یہ شکوہ تو نہیں کر سکتا نا کہ اسے اس دوائی سے شفا نہیں مل پائی ۔؟

اسی طرح قرآن کے معاشی نظام کی مثال ہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں قوانینِ خداوندی پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس نظام کو قائم رکھا گیا،غربت کی سطح کم سے کم تر ہوتی گئی ۔اگرچہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے دور میں ناگہانی قحط کی وجہ سے معاشی مسائل میں بہت اضافہ ہو گیا تھا،لیکن یہ ایک قدرتی آفت ہے جو استثنائی کیفیت ہے ۔اس میں

بھی مومنین ایک دوسرے کی بھرپور مدد کرتے ہوئے ایثار و قربانی کی مثالیں قائم کرتے ہیں۔ایسی ناگہانی آفات کے علاوہ آپ عہد فاروقی تک پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔کہیں بھی آپ کو معاشی ناہمواریاں نظر نہیں آئیں گی۔ بلکہ فاروق اعظمؓ کے عہد میں تو ریاست کی آمدن اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے کئی صحابہ کرامؓ کے وظائف تک مقرر کر دئے تھے۔یہ نعمائے خداوندی کے درست استعمال کا ہی نتیجہ تھا کہ اللہ نے رزق کی فراوانی پیدا کر دی اور روم و فارس جیسی عظیم سلطنتوں کے خزانے مومنین کے قدموں میں آ گرے۔یہی وہ چیز ہے جس کی جانب اللہ قرآن میں بھی اشارہ کرتا ہے کہ:

لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (سورہ ابراہیم۔آیت 7)

اگر تم رب کا شکر (نعمتوں کا درست استعمال) کرو گے تو وہ تمہیں اور زیادہ دیتا چلا جائیگا۔

لیکن جب مسلمانوں نے اس ''دوائی'' کا استعمال ترک کر دیا اور فاروق اعظمؓ کی سوچی سمجھی سکیم کے تحت شہادت کے بعد اس نظام میں دراڑیں آنے لگ پڑیں اور عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ مسمار ہونے لگ پڑا تو پھر ظاہر ہے انسانیت غربت و افلاس جیسے مسئلہ سے پھر سے دوچار ہو گئی۔اگر یہ نظام آگے چلتا رہتا تو شاید یہ کرہ ارض آج کیا بن چکا ہوتا۔اب پھر سے اگر وہی نظام قائم کیا جائے تو یہی انسانیت کے اس سب سے بڑے مسئلہ کو بہت خوبی سے حل کر سکتا ہے۔

حنیف صاحب کہتے ہیں کہ یہ کشمکش تو ہمیشہ چلتی رہے گی۔حالانکہ اسی کتاب میں ایک مقام پر میں نے قرآنی دلائل سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اللہ کا دین ایک روز قائم ہو کر رہنا ہے، اور اس نے اس بات کا عہد کیا ہے کہ انسانوں کی دنیا میں بھی اسی کے قانون کا راج ہو گا۔اسی امر کو قیامتِ دین کہا جاتا ہے۔اگر حنیف صاحب یہ کشمکش ہمیشہ سے چلتی رہنے پر یقین رکھتے ہیں تو اس امر کو قرآن سے بھی ثابت کریں، نیز یہ بھی بتائیں کہ پھر ''قیامتِ دین'' کا کیا مطلب ہو گا اور قرآن کی ابدی حفاظت کے اللہ کی جانب سے ذمہ لینے کا کیا جواز باقی بچتا ہے؟ کیونکہ اگر یہ کشمکش چلتی رہنی ہے، اسے ایک روز ختم نہیں ہونا تو پھر قرآن کے محفوظ رکھنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔اس لیے حنیف صاحب کا یہ نکتہ بھی قرآن کی رو سے بنیادی طور پر غلط ہے۔یہ روایتی نظریہ ہے کہ ہر آنے والا دور بد سے بدترین ہو گا۔قرآن اس بات کا قائل نہیں۔قرآن کا نظام ربوبیت ایک روز قائم ہو کر رہے گا، جس پہ قرآن کی بیشتر آیات گواہ ہیں۔

لیکن انفاق ایک مسلسل عمل ھے ۔ اس کی ابتداء اپنے گھر سے ھی ھو جاتی ھے ۔

کیا کرتا ھے ایک باپ اپنے گھر میں ۔۔۔۔

وہ اپنے سارے وسائل ، اپنے بچوں کے لیے کھلے رکھتا ھے ۔

وہ دیکھتا ھے کہ کس بچے کی کیا ضرورت ھے ۔ وہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ھے اگر کسی کی ضرورت زیادہ ھے تو اسے زیادہ دیتا ھے ۔ اور جس کی ضرورت کم ہوتی ھے اسے کم دیتا ھے ۔۔۔۔

لیکن کیا ایسا کرتے ھوئے ، وہ اپنے مال ، یا دیگر نعمائے زندگی سے ، جو اس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے حاصل کیے ہوتے ھیں ، خارج ھو جاتا ھے ؟؟؟

ھرگز نہیں ۔۔۔۔

بلکہ اسے تو یہ حق حاصل رھتا ھے کہ اپنی زندگی میں لازمی وصیت کرے ۔ وہ جس کو چاہے ، جتنا چاہے ، دے دے ۔۔۔۔۔۔۔

اور اگر وہ ، وصیت کئے بغیر ھی مر جاتا ھے ، تب بھی اس کا مال ، اسکی جائیداد ، اس کی ھر شئے ، صرف اور صرف اس ھی کے بیوی ، بچوں ، ماں باپ ، بہن بھائیوں میں تقسیم کرنے کا حکم ھے ۔

قرآن کریم کی کسی آیت کی کوئی ایسی تشریح ، جو اس کی بنیادی تعلیم سے ٹکراتی ھو ، وہ درست نہیں ہو سکتی ۔

Comment No:144b حنیف صاحب کی جانب سے ''کماؤ صلاحیت کے مطابق اور دو ضروریات کے مطابق'' کا خود اعتراف۔

لکھتے ہیں کہ ایک باپ اپنے بچوں کے لیے اپنے وسائل کھلے رکھتا ہے۔آگے پوری عبارت پڑھیے۔جس کی ضروریات زیادہ ہوں،اسے زیادہ دیتا ہے،جس کی ضروریات کم ہوں،اسے کم دیتا ہے۔اب یہ ایک گھر کی صورتحال ہے۔جبکہ پیچھے باب دوم میں قرآنی آیات کی روشنی میں بتایا کہ ہماری نظر میں تو صرف اپنا گھر ہوتا ہے،لیکن اللہ کے لیے یہ تمام کائنات اس کا گھر ہے جس کا وہ پالنے والا ہے۔اس زمین پر ہمیں اللہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے تمام کرہ ارض کو اپنا گھر سمجھنا ہوگا۔اور یہ اصول ہر جگہ کارفرما ہوگا کہ انسان پوری طرح جان مار کر کمائے اور صرف اپنی ضرورت کے بقدر رکھ کر باقی نوع انسانی کے لیے چھوڑ دے۔

اب جس اصول کے خلاف حنیف صاحب ہر کسی پر ''کمیونسٹ'' ہونے کے فتوے لگاتے رہتے ہیں،خود ہی اس اصول کا اعتراف کررہے ہیں کہ گھر میں یہ کچھ ہوتا ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ کیا ایسا کرتے ہوئے باپ اپنی ملکیت سے محروم ہوجاتا ہے؟ بلکہ وہ تو اپنے مرنے کے بعد وہ جسے چاہے اپنی مرضی سے وصیت کے ذریعہ دے سکتا ہے۔

قارئین میں نے پہلے ہی اسی باب میں ہر طرح کے مال پر صرف خدا اور اس کے نظام کے قیام کے لیے بنائی جانیوالی قرآنی ریاست کی ہی ملکیت ہوتی ہے۔انسان کا حق ملکیت صرف نیابتی اور وکالتی ہے،نہ کہ عینی۔اور قرآن کہتا ہے کہ انسان کو ہر طرح کے مال پر صرف ''خلیفہ'' ہی بنایا گیا ہے،مالک نہیں۔(ملاحظہ کیجیے اسی باب میں عنوان: ملکیت کا قرآنی تصور)۔

اب گزارش یہ ہے کہ چھوٹے سے گھرانے کی طرح یہ کرہ ارض بھی ہمارا ایک گھرانہ ہے۔اور خدا ہمارا باپ ہے،وہی پالتا ہے ،رزق دیتا ہے۔سب ملکیت اسی کی ہے۔ہم اس کی مخلوق ہیں۔تو پھر اب حنیف صاحب کے اصول وراثت کے تحت پھر پہلے اللہ کے مرنے کا انتظار کیا جائے (معاذ اللہ) تاکہ اسکی تمام ملکیت وراثتی انتقال کے تحت انسانوں کو منتقل ہوجائے۔اس کے سوا انسان کو یہ ملکیتی حقوق ملنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔کیونکہ جب تک اللہ تعالیٰ زندہ ہے،کوئی اس کی ملکیت کو اپنی عینی ملکیت نہیں بنا سکتا۔وہ جسے ملکیت دیتا ہے،اسے نائب کے طور پر صرف وکالتی ملکیت دیتا ہے۔کہ وہ اس کے اصولوں کے

مطابق اس ملکیت کا استعمال کرے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو اس شخص کی ملکیت منسوخ ہوکر وہ مال قرآنی ریاست کی تحویل میں چلا جائیگا اور پھر وہ درست استعمال کرنے والوں کو دیا جائیگا۔

یہ ایک جگہ آیتِ قرآنی کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اللہ اپنے صالح بندوں کو زمین کا وارث بنا دیتا ہے''۔ پس اس سے انسان کا اللہ کی ملکیت کا وارث بننا ثابت ہوتا ہے۔

حیرت ہے کہ اس آیت (جس کا وہاں کمنٹ میں انہوں نے کوئی حوالہ بھی نہیں دیا) سے انسان کے زمین کے مالک ہونے کی دلیل کیسے اخذ کر لی گئی؟ یہاں تو جماعتِ مومنین کے قرآنی نظام پر عمل کے نتیجہ میں تمکن فی الارض کا ذکر ہو رہا ہے، دنیا میں اقتدار و غلبہ کی بات ہو رہی ہے، اور حنیف صاحب اس سے یہ غلط استدلال فرما رہے ہیں کہ اللہ میاں اپنے صالح بندوں کو زمینوں کے مالکانہ حقوق ''الاٹ'' کر دیتا ہے۔ ان کے نام اسٹامپ پیپر لکھ دیتا ہے کہ جاؤ اپنے اپنے قطائع سنبھال لو۔ آج سے یہ پلاٹ تمہارے ہوئے۔ کس قدر احمقانہ تشریح کی گئی ہے اس عظیم الشان آیت مبارکہ کی۔

پھر ایک اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ یہاں زمین کا وارث ہونے کے لیے صالح ہونا شرط قرار دیا گیا ہے۔ جس سے یہ نکتہ با آسانی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کیا فرمانا چاہ رہا ہے۔ کہ جو نیک عمل کرتے ہوئے اس زمین پر اللہ کا نظام قائم کریں گے، انہیں اس کرہ ارض پر اقتدار و غلبہ (تمکن فی الارض) عطا کیا جائیگا۔ یہی ہے بندوں کے وارثِ زمین ہونے کا مطلب۔

اگر یہاں اللہ کی جانب سے زمین کا وارث بنانے سے حنیف صاحب والا غلط مفہوم (زمینوں کی الاٹمنٹ) مراد لیں تو پھر اس کے لیے تو صالح اور فرمانبردار ہونے کی شرط ہی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زمینوں کے وارث تو ہمیشہ سے غیر صالح یہود و نصاریٰ، ہنود اور دیگر غیر مسلم بھی رہے ہیں۔ آج بھی وہ آپ مسلمانوں سے زیادہ ''زمینوں'' کے وارث ہیں۔ تو کیا پھر حنیف صاحب انہیں اس ''عظیم الشان'' اصول کی بناء پر صالح ہونے کا سرٹیفکیٹ دے سکتے ہیں؟ کیونکہ آیت تو یہی بتا رہی ہے کہ صرف صالح بندوں کو زمین کا وارث بنایا جائیگا''۔

میں نے ایک بات کتاب کے پہلے باب کے پہلے ہی صفحہ پر واضح کی ہے کہ اللہ ہی زمین کا وارث ہے اور اس نے انسان کو اس پہ حق تصرف مشروط طور پر دیا ہوا کہ وہ اس کا درست استعمال کرے۔ یعنی پوری نوع انسانی کو یکساں طور پر اس زمین کا رزق تقسیم کرے۔ تاکہ اللہ کی ذمہ داری ''رب العالمین'' اس کرہ ارض پہ پوری کی جا سکے۔ یہی وہ صفت ہے جو اللہ انسان میں دیکھنا چاہتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُم مَّا فِیْ الأَرْضِ جَمِیْعا (سورہ البقرہ۔آیت 29)

اللہ وہ ہے جس نے اس زمین کی تمام پیداوار و وسائل کو تم سب انسانوں کے لیے مشترکہ طور پہ پیدا کیا

اگر لفظ ''وارث'' سے حنیف صاحب کا مفہوم مراد لیا جائے تو پھر میری تو یہی عرض ہوگی کہ ''بھائی انتظار کرو۔ اللہ میاں ابھی مرا نہیں (معاذ اللہ)۔ جب مر جائیگا، تب اسکے ترکہ کے وارث بن جانا''۔ کیونکہ اپنے جیتے جی تو اس نے یہ ترکہ تمہارے نام لگانے کا کہیں اشارہ تک نہیں دیا۔

قرآن کہتا ہے کہ:

وَکَمْ أَهْلَکْنَا مِن قَرْیَةٍ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا فَتِلْکَ مَسَاکِنُهُمْ لَمْ تُسْکَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِیْلاً وَکُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِیْنَ (سورہ القصص۔آیت 58)

اور کتنی ہی بستیاں (قومیں) ہم نے ہلاک کر دیں جو اپنے معاشی نظام پر نازاں تھیں۔ یہ ہیں ان کے مکانات جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے اور ان کے ترکہ کا وارث ہمارے سوا کوئی نہ ہو سکا۔

دیکھئے اس آیت میں زمین کا وارثِ حقیقی کسے کہا جا رہا ہے۔

Mohammad Hanif

اللہ کریم نے انسان کو پیدا فرمایا ـــــ اسے کئی صلاحیتوں سے نوازہ ـ

اس نے انسانوں میں کسب معاش کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ـــــ

کیونکہ معاشرے کے نظام کو چلانے کے لیے ، یہ تفرقہ لازم ھے ـ

اس کا لا محالہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ معاشرے میں کچھ لوگ ، زیادہ نعمائے خداوندی کے مالک ھوں گے ـ اور کچھ کم کے مالک ھوں گے ـــــ

اب اللہ کریم ان لوگوں سے کہ جن کے پاس سامان رزق کی فراوانی ھے ، یہ ھدایت دیتا ھے کہ تم ان نعمتوں کو اس طرح استعمال کرو ، کہ اس کے نتیجہ میں ، معاشرہ ترقی کرتا چلا جائے ـ جس کا لازمی نتیجہ فرد کی ترقی و خوشحالی ھے ـــــ

وہ کہتا ھے کہ تم ان نعمتوں کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک ھی محدود نہ کر لو ـ بلکہ اسے کھلا رکھو ـــــ

یعنی یہ سب کو فائدہ پہنچانے کا باعث بن جائے ـــــ

لیکن اس ضمن میں وہ کہیں بھی اس انسان سے اس کے مال کی ملکیت نہیں چھیننا چاھتا ـــــ

اب اس لفظ " کھلا رکھنے " کو سمجھنے کی ضرورت ھے ـــــ

کیا اس کا مطلب میں یہ لے لوں کہ ، جو کچھ بھی میرے پاس ھے اسے کسی چوک میں رکھ دوں ـــــ

تو اس کا کیا نتیجہ ھوگا ـ اس پر تو سوچنے کی ضرورت ھی نہیں ھے ـــــــ

کھلا رکھنے سے مراد یہ ھی ھے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ ترقی کرے

اب معاشرے کی ترقی کے لیے کیا کرنا ھوتا ھے

لوگوں کی بھوک انہیں مخصوص اوقات میں کھانا کھلانے سے نہیں ختم ھو سکتی ـــ اس کے لیے ان کے مستقل روزگار کا بندوبست کرنا ھوگا ـــــ

کچھ ایسا کرنا ھوگا کہ ھر آدمی اپنے حصے کا رزق خود پیدا کرے ـــــ

اور اس کا طریقہ یہ ھے کہ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ھوں ـــ

جن کے پاس مال کی فراوانی ھے وہ اپنا مال ایسے منصوبوں میں لگاتے چلے جائیں جس سے افرادی قوت کی مانگ بڑھتی چلی جائے ـــــ

جو تعلیم یافتہ ھوں ، وہ اپنا علم دوسروں تک اس طرح پہنچائیں کہ معاشرہ جہالت کے اندھیروں سے باھر نکل آئے ـــــــ

ایک طاقتور اپنی طاقت سے کمزوروں کی حفاظت کرے ـ

ایک صاحب علم دوسروں کو علم منتقل کرے ـ

ایک سائنسدان اپنی تحقیق کے ثمرات دوسروں تک پہنچائے ـــــ

یہ سب انفاق ھے میرے بھائی ـــــ

نہ جانے کیوں یہ لوگ انفاق کو صرف روپے پیسے تک ھی محدود کیوں سمجھتے ھیں ـــــ

شاید اس لیے کہ سوشلزم یہ ھی کہتا ھے ـــــــ

ایک طرفہ تماشہ یہ بھی ھے کہ جناب آپ زمین کے مالک نہیں ھو سکتے ـــــ کیونکہ یہ ارض اللہ ھے ـــــ

کیا منطق ھے ـــــ

قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ھے کہ ساری کائنات ، اللہ کی ھے ـــ

لیکن ھمارے یہ دوست باقی سب کو چھوڑ کر صرف زمین پر کھڑے ھو گئے ـــ

کیونکہ یہ سوشلزم کا نعرہ ھے ـــ

بہت توجہ کی ضرورت ھے ـــــــ قرآن کہتا ھے ، ھم اپنے صالح بندوں کو زمین کا وارث بنا دیتے ھیں ـــ ھم کہتے کہ بات ھی نہ کرو ـــ

علامہ پرویز علیہ رحمہ کا ایک پمفلٹ ھے ـــ عالمگیر افسانے ـ

کبھی اس کا مطالعہ کیجئے گا ـــ

جس طرح آج ھمارے لوگ اس بات کو ھی حقیقت سمجھتے ھیں کہ کبھی آسمانوں میں ایک مٹی کے پتلے سے آدم کو تخلیق کیا گیا ـ
کیونکہ یہ بات ان کے علماء نے کہی ھے ـــ

بلکل اس ھی طرح ، ھمارے دوست بھی یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ حقیقت کیا ھے ـــ

بس ان کے لیے یہ ھی کافی ھے کہ پرویز صاحب نے کیا کہا ھے ـــــ
سلامت رھیں

Comment 17a,b,17C

کہتے ہیں کہ قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ ساری کائنات اللہ کی ہے۔لیکن ہمارے یہ دوست ساری کائنات کو چھوڑ کر صرف زمین پر کھڑے ہو گئے کہ ''الارض للہ''۔کہ یہ سوشلزم کا نعرہ ہے۔

حیرت ہے کہ ہم نے کبھی بھی سوشلزم کے نام سے نہ کوئی نظریہ پیش کیا، نہ ہی اس کے فلسفہ حیات کی تائید کی۔لیکن یہ کیسے اندھا دھند ہم اور ہمارے ساتھیوں پر سوشلزم سے منسلک ہونے کے الزام لگاتے رہتے ہیں۔اور خود اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ یہ خود مغربی یہودی سرمایہ داری نظام اور ایڈم سمتھ کے نظریات وتصورات کو قرآن کی رو سے ثابت کرنے کی دانستہ کوشش کر رہے ہیں (یہ انکشاف بمعہ اثبات میں اسی باب میں شامل کروں گا)۔ہم اگر قرآن کی بات کریں تو ''پرویزی، مقلد، سوشلسٹ، مارکس و ہیگل کے تائید کنندہ'' لیکن موصوف اگر تصورات پیش کریں تو وہ ''عین قرآنی''، چاہے ان میں چھپی ہوئی یہودی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور جدید سرمایہ داریت کے بانی ایڈم سمتھ کے فلسفے صاف نمایاں ہوں۔

بات صرف اتنی ہے کہ انسان پوری کائنات میں اپنا تسلط قائم نہیں کر پایا۔اس کی پہنچ میں صرف زمین تھی، پس اس نے زمین پر ہی ظلم واستبداد کا بازار گرم رکھا۔ملائکہ نے بھی اللہ سے یہی شکوہ کیا تھا کہ کیا تو ایک ایسی مخلوق کو بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد پیدا کرے گی؟

دیکھیے زمین کی پیداوار کے علاوہ دیگر نعمائے خداوندی مثلاً ہوا، پانی، آگ، حرارت، روشنی وغیرہ پر کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔خود ہی دیکھ لیجیے کہ یہ کیسے سب انسانوں اور حیوانوں کے لیے یکساں طور پر کھلی ہیں۔کوئی ان پر حد بندی نہیں کر سکتا۔اگر ایسا ممکن ہوتا تو یہ سرمایہ دار تو لوگوں کے سانس لینے پر بھی ٹیکس لاگو کر دیتے۔سورج کی روشنی اور حرارت پر روک لگا کر بیٹھ جاتے اور مخلوق خدا دم گھٹ کر مر جاتی۔

بے شک زمین کے علاوہ بھی تمام کائنات اللہ کی ہے۔لیکن ان نعمتوں پر ان کا بس نہیں چلتا، نہ ان کا تسلط ہے، اس لیے ہم ان کی بات کیسے کریں؟ وہ تو کائنات میں سب کے لیے کھلی ہیں۔لیکن زمین اور اس کی پیداوار پر انسان کا بس چلتا ہے اور یہ یہاں ''تیری۔میری'' کی حد بندیاں کرتا نظر آتا ہے۔دوسرے انسانوں کو اس کی پیداوار سے محروم کرتا اور رزق کے سرچشموں پر بند باندھتا ہے۔اس لیے اسے اس استبداد سے روکنا ایک صاحبِ فکر قرآنی کا فرض ہے۔اسے یہ بتانا ہے کہ یہ زمین کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں، اسکی پیداوار پر تمام انسانوں کا مشترکہ حق ہے۔اسی لیے جب بھی قرآن کی آیت ''الارض

للہ'' کی بات کی جائے ،اسے سوشلزم کا نعرہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ ہو بہو مودودی صاحب کی زبان بول رہے ہیں جنہوں نے اپنی ایک کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں یوں اس حکم خداوندی کا مذاق اڑایا تھا:

''آجکل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک فقرہ یوں نکالا ہے کہ ''الارض للہ''۔اور اس پر پھر قیاسات کا پورا ایک کریملن تعمیر کر ڈالا ہے''۔ (مسئلہِ ملکیتِ زمین از مودودی)

اور جب ان کی توجہ دلانے پر ہم نے علامہ پرویز کی کتاب ''عالمگیر افسانے'' پڑھی تو اس میں ان کے موقف کی تائید میں تو کوئی مواد نظر نہیں آیا۔ البتہ اس کتاب کے صفحہ نمبر 38 پر مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے سرمایہ داری نظام کی خوب خبر لی ہے۔ نہ جانے حنیف صاحب نے یہاں کس بات کی نشاندہی کرنا چاہی ہے۔

Mohammad Hanif .....

برادر محترم ـــــــــ سلام و رحمت

آپ کے سوال یقیناً اھمیت کے حامل ھیں ـــ ان کے جوابات بھی دئے جائیں گے ـــ

اور میرا خیال ھے کہ برادر پاور صاحب بھی ان نکات پر جرح کریں گے ـ

لیکن اگر اس وقت میں نے ان سوالوں کا جواب دیا ، تو بات اصل موضوع سے ھٹ جائے گی ـــ

صرف ایک مثال دیتا ھوں ـ

میری کلاس میں ، 56 لڑکے پڑھتے تھے ـــ

ھم سب پری میڈیکل کے طالب علم تھے ـــ

ان لڑکوں میں بہت سارے امراء کے بچے بھی تھے ـ

آج کے وفاقی وزیر ، سید خورشید شاہ ، اور سابقہ چیف سیکریٹری سندھ اسلم سنجرانی ، میرے کالج میٹ تھے ـ یہ لوگ ، آرٹس میں تھے ـ جبکہ میں سائنس میں تھا ـــ

پری میڈیکل کا مطلب ، یعنی ڈاکٹر بننا تھا ـــ

آپ یقین کریں ،،،

56 لڑکوں میں سے صرف 11 لڑکے ، ڈاکٹر بن کر باھر نکلے ـــ

اور ان میں صرف ایک لڑکا ، شھر کے ایک جج صاحب کا بیٹا تھا ـــــــ

باقی سب کے سب مجھ جیسے نادار تھے ـــ

میں تو چلیں ، معاشی مشکلات کی وجہ سے ڈاکٹر نہ بن سکا ـ

لیکن ان امراء اور روساء کے بچے کیوں پیچھے رہ گئے ـــ

لیکن ان امراء اور روساء کے بچے کیوں پیچھے رہ گئے ــ

انہیں تو سب سے زیادہ موقع ، اور سہولیات میسر تھیں ــ پھر وہ کیوں ڈاکٹر نہ بن سکے ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

آپ کے سوال میں سب سے زیادہ وضاحت طلب بات " معاشی مساوات " کی درست تعریف ھے ــ

آپ کے خیال میں معاشی مساوات کسے کہتے ھیں ؟؟؟

لیکن میری آپ سے التماس ھے کہ ، اپنے ان سوالات کو کچھ وقت کے لیے مؤخر کر دیں ــــــــــ

Mohammad Hanif ــــــ آپ نے فرمایا

مواقع دونوں بچوں کو یکساں طور پر ملے ــــ لیکن بعد میں کیا ہوا؟ انجینیر کا بیٹا کند ذہن واقع ہوا، نہیں پڑھ سکا۔ تو وہ جسمانی کام کے لیے منتخب ہوگیا ــــــ اور ایک غریب جولاہے کا بیٹا پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا تھا، وہ پڑھ کر انجینئر بن گیا تو وہ فکری کام کے لیے منتخب ہوگیا ــ فرق دونوں میں کوئی نہیں۔ دونوں کا معاوضہ یکساں ہوگا۔

کیا آپ بتا سکتے ھیں کہ اس فرضی انجنیئر کا بیٹا ، کند زھن کیوں واقع ھوا ۔ اسے کند ذھن کس نے بنایا ــــــــــ

سلامت رھیں

Mohammad Hanif شاہ بابا ــــــ کیا یہ بہتر نہیں کہ ھم دونوں بھائی شبیر صاحب اور میں اس پر بات کریں ــــ اور اگر آپ کوئی مشورہ برادر شبیر صاحب کو دینا چاھیں تو بذریعہ میسج دے دیں ــــــ کیونکہ جس تصور کو آپ پیش کر رھے ھیں ، نہ وہ اس وقت نافذ ھوا جب نبی تھے اور نہ ھی خلفائے راشدین کے زمانے میں

کبھی غور فرمایا کہ حضور ص ع کے بعد جو بھی خلیفہ بنا ، وہ معاشرے کا صاحب حیثیت آدمی ھی کیوں تھا ــــــ کیوں نہیں بلال رض کو خلیفہ بنا دیا ۔

Mohammad Hanif اب جب کسی میں استعداد نہیں ھوتی ۔ تو پھر آپ کیسے کسی ڈاکٹر کو کسی مزدور کے برابر کر دیں گے

Mohammad Hanif بلال میں کم استعداد ، اور عمر میں زیادہ ـــــ یہ کس نے کیا

August 6 at 12:18am · Like

Mohammad Hanif کیا یہ معاذ اللہ نا انصافی نہیں

August 6 at 12:18am · Like

Mohammad Hanif بلال رض غلام اور عمر رض خلیفہ ـــــ یہ ٹھیک اور اگر کوئی مل اونر بنگلے کا مالک اور مزدور جھونپڑی کا ـــــ تو یہ قارون اور سرمایہ داری ـــــ اسے کہتے ھیں میٹھا میٹھا ھپ ھپ ۔ کھارا کھارا تھو تھو

Mohammad Hanif جی میں نے تو کسی بھی محنت کے کام کو حقیر نہیں کہا ـــــ یہ آپ الزام لگا رھے ھیں ـــــ البتہ میں نے آپ کے ایک تبصرے کے جواب میں پوچھا تھا اور اب پوچھ رھا ھوں ـــــ اپنے رب کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ بتائیں ۔ کبھی اپنے چھوٹے بھائی یا اولاد کے لیے سوچا کہ میں اسے بھنگی بناوں گا ـــــــــ کیوں نہیں پلاننگ کرتے انہیں حجام بنانے کی ؟؟

Mohammad Hanif بھائی کس نے دی یہ استعداد ـــــ کیوں جو پیچھے رہ گئے ان کا کیا قصور تھا ـــــ

August 6 at 12:42am · Like · 2

Mohammad Hanif کیوں اللہ نے سب کو آپ جیسا خوش نصیب نہیں بنا دیا ـ

August 6 at 12:42am · Like · 2

Mohammad Hanif کیوں نہیں دی بلال کو عمر جیسی استعداد

August 6 at 12:42am · Like · 2

Mohammad Hanif تو یہ سارے زھنی استعداد کے مالک آپ کے ھاں ھی کیوں پیدا ھوئے ؟؟؟؟

August 6 at 12:28am · Like

Mohammad Hanif کیوں کوئی بھی بھنگی یا حجام نہیں ـــــ کیا آپ کی اللہ میاں سے زیادہ دوستی ھے

August 6 at 12:28am · Like

Comment.no:161a,161b,anfal zikr,47,48,49,50,51

انسانی صلاحیتوں میں فرق کے معاملہ پر حنیف صاحب کی معروضات

پہلے باب میں یہ بات قرآنی دلائل کی روشنی میں واضح کی گئی تھی کہ صلاحیتوں کا فرق اللہ کی جانب سے ہے، انسانوں کا پیدا کردہ نہیں۔ اور اسے معاشی تقسیم سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ صرف دنیا میں ہمہ قسم امور کو سرانجام دینے کے لیے تقسیم کار کے اصول کے تحت اللہ کی جانب سے رکھا گیا ہے۔ اور یہ اس ذات باری تعالیٰ کے عالمِ امر میں انجام پانے والے فیصلے ہیں جن کی غرض کا ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ادراک نہیں کر سکتے۔

یہ صلاحیتوں میں فرق ضروری تھا۔ ورنہ معاشرہ کا نظام ایک دن بھی نہ چل پاتا۔ معاملہ صرف یہ ہے کہ اس فرق کو تقسیم کار کی خدائی حدود سے نکال کر ہم نے معاشی تقسیم سے منسلک کر دیا ہے۔ یہی اصل فساد کی جڑ ہے۔

یہاں انہوں نے جو مثال پیش کی ہے، جس میں ان کے 56 ہم جماعتوں میں صرف 11 لڑکے ڈاکٹر بن پائے جن میں زیادہ تر غرباء کے لڑکے تھے۔ تو یہی چیز ہم پیچھے سے ڈسکس کرتے چلے آ رہے ہیں کہ صلاحیتوں سے ہٹ کر اس معاملہ میں انسان کی محنت کا بھی بہت عمل دخل ہے، صلاحیتوں کا فرق تو چلو خدا کا عطا کردہ تھا۔ لیکن یہاں دیکھنا یہ بھی ہے کہ ان 56 لڑکوں میں سے محنت کس کس نے کی؟ کیا یہ وفاقی وزراء کے دولت وقوت کے نشے میں مخمور لڑکے بھی محنت کرتے ہیں؟ عام مشاہدہ ہے کہ تعلیم میں زیادہ تر محنتی لڑکے غرباء کے ہوتے ہیں، جنہیں باپ دادا کی جائیداد نظر نہیں آ رہی ہوتی اور انہیں اپنی کیریئر بلڈنگ کا صرف ایک ہی راستہ (تعلیم حاصل کرنا) نظر آتا ہے۔ حنیف صاحب یہ واقعہ آپ ہی کے ساتھ نہیں پیش آیا بلکہ ہر جگہ ایسا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ خود میرے ساتھ کالج میں بہت امیر کبیر لڑکے ہم جماعت تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ انہوں نے کبھی کتاب کھول کر بھی نہیں دیکھی تھی نہ کبھی پروفیسر صاحب کی جواب طلبی پر کسی سوال کا جواب دیا تھا۔ ان میں اس قدر غرور دیکھنے میں آیا تھا کہ وہ پروفیسر کی جانب سے سوال کرنے پر خاموشی سے اکڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن جواب نہیں دیتے تھے، نہ اس پر کوئی شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ لیکن بعد میں کیا ہوا؟ کچھ فیل ہو گئے۔ کچھ نے پہلے ہی کالج کو الوداع کہہ دیا۔ لیکن انکی صحت پر اس ناکامی سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ آج بھی میں اکثر انہیں اپنے سامنے بڑی بڑی گاڑیوں میں گزرتا دیکھتا ہوں۔ انہیں بھلا کیا ضرورت تھی تعلیم حاصل کرنے کی؟ تعلیم تو ہم جیسے غریبوں کے لیے ہے جنہیں اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اور اگر وہ ناکام رہ جائیں تو ان کے لیے زندگی میں اس سے بڑا جھٹکا اور کوئی نہیں

ہوتا۔بے شک امراء کے بچوں میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہےاور پیسے کے بل بوتے پر وہ اعلیٰ اور مہنگی ترین تعلیم حاصل کرتے چلے جاتے ہیں،لیکن جس صورتحال کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے،وہ بھی ہماری عملی معاشرتی زندگی کا ایک عام مشاہدہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

اگلے کمنٹ میں محترم پھر اس بات پر اعتراض کرتے نظر آتے ہیں کہ ''عمرؓ اور بلالؓ میں استعداد کا فرق کس نے پیدا کیا اور کیوں؟ دونوں کو ایک جیسی استعداد کیوں نہ دے دی؟اور رسول اللہ ﷺ کے بعد جو بھی خلیفہ بنا وہ معاشرہ کا صاحب حیثیت آدمی کیوں تھا؟بلالؓ کو کیوں خلیفہ نہیں بنایا؟

قارئین غور کیجیے کیسے حقائق سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ جیسے نفوس مقدسہ کی حیات کو ہمارے جیسے عام سرمایہ داروں اور مزدوروں کی زندگی کی سطح پر لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔میں پیچھے کئی مقامات پر ایک سیر حاصل گفتگو کے ذریعے واضح طور پر ثابت کر چکا ہوں کہ صلاحیتوں میں یہ فرق صرف اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔یہ اس کے عالم امر کا فیصلہ ہے جس پر ہم قطعاً سوال نہیں اٹھا سکتے۔مزید یہ کہ معاشرہ کے نظام کو چلانے کے لیے استعداد کا فرق بہت ضروری ہے۔لیکن اس کا معاشی تقسیم سے کوئی واسطہ نہیں۔

قطع نظر اس کے کہ گزشتہ سطور میں قرآن میں وہ آیات بھی دکھائی گئی ہیں جو انسانوں سے غربت اور محرومی کے خاتمہ اور تمام انسانوں کے یکساں معاشی حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں،میں حنیف صاحب سے پوچھنا یہ چاہتا ہوں اور حنیف صاحب خود بھی آج تک کسی ایک فورم پر بھی یہ ثابت نہیں کر پائے کہ عمر فاروقؓ اور بلالؓ میں کسی قسم کا معاشی فرق بھی موجود تھا۔بھئی آپ کا اعتراض تو تب ہی درست ثابت ہوتا ہے جب عمر کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہو،عمر فاروقؓ نے ایک بہت بڑی سرکاری اراضی ذاتی طور پر بٹائی پر دے رہی ہو جس میں سے وہ آپ کے یہودی انفاق کے فارمولے کے تحت سرمایہ کاری کے ذریعہ کمائی کر رہا ہو۔لمبی لمبی مرسیڈیز کاروں میں مسجد نبوی آتا جاتا ہو۔اس کے آگے پیچھے خدام پھر رہے ہوں (بلالؓ جیسے۔معاذ اللہ)۔اس کے کھانے میں دنیا جہان کے مرغن فاسٹ فوڈز شامل ہوں۔اور دوسری جانب بلالؓ سمیت دیگر رعایا کے گھر دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے پکتی ہو،اس کے بچے بھوکے مرتے حسرت سے ''صدر مملکت'' عمر فاروقؓ کی جاہ وحشمت کو دیکھتے ہوں،لوگ بھوک سے خودکشیاں کر رہے ہوں،گھر کے سب ممبران بھی مل کر کمائی کرتے ہوں اور پوری پھر بھی نہ پڑتی ہو۔

کیا حنیف صاحب اس دور میں ایسا کوئی ماحول ثابت کر سکتے ہیں؟؟؟اگر یہ اپنے اعتراض پر قائم ہیں تو میں انہیں یہاں کھلا چیلنج کرتا ہوں کہ فاروق اعظمؓ کے دور میں کسی کے ساتھ کسی قسم کی معاشی نا انصافی ثابت کی جائے۔پھر ہم بھی اپنے موقف سے رجوع کرلیں گے،اپنے نظریات کو ترک کر کے ان کے تصور سے اتفاق کرلیں گے۔لیکن اگر یہ کسی قسم کی معاشی نا انصافی ثابت نہیں کر سکتے ،تو پھر ایسا گھٹیا اعتراض کرنے کا مقصد کیا ہے؟

عمر فاروقؓ تو وہ ہستی ہے جس نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاس سے مر گیا تو عمر اس کا روز قیامت ذمہ دار ہوگا۔

عمر فاروقؓ تو وہ انسان ہے جو بیت المقدس کی فتح کے بعد ایک فاتح خلیفہ کے طور پر وہاں کے دورے پر جاتا ہے تو راستے میں ایک ہی اونٹ کی وجہ سے ایک بار اپنے خادم کو اس پر سوار کرتا ہے،اور ایک بار خود سوار ہوتا ہے۔اور جب یروشلم کے دروازے پر پہنچتا ہے تو استقبال کے لیے کھڑے لوگ دیکھتے ہیں کہ خادم اونٹ پر سوار ہے جبکہ خلیفہ مہار پکڑے ہوئے ہے۔

عمر فاروقؓ تو وہ ہستی ہے کہ ایک بار مصر کے گورنر نے انہیں جو کی روٹی کھاتے دیکھا تو پوچھا کہ اے امیر المومنین اب تو مصر سے کافی گیہوں آ رہا ہے،آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟تو جواب میں اس عظیم ہستی نے فرمایا کہ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ میری تمام رعایا کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے تو پھر اس روز میں بھی کھانے لگ جاؤں گا۔اللہ اکبر۔

یہ فاروق اعظم وہ ہستی ہے جو ایک بار بیمار ہو گئے تو طبیب نے شہد تجویز کیا۔گھر میں شہد موجود نہیں تھا۔بیت المال سے البتہ میسر آ سکتا تھا۔تب آپ مسجد نبوی گئے اور لوگوں کو بلا کر ان سے پوچھا کہ عمر بیمار ہے اور اسے شہد کی ضرورت ہے۔گھر میں شہد دستیاب نہیں۔کیا میں بیت المال سے شہد لے سکتا ہوں؟لوگوں نے فوراً جواب دیا کہ کیوں نہیں؟آپ لے لیجیے۔تب آپ نے بیت المال کا شہد استعمال کیا۔

پھر خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ کو ہی دیکھ لیجیے۔مسند خلافت پر بیٹھتے وقت ان سے سوال ہوا کہ آپ کا معاوضہ کتنا ہوگا؟تو جواب میں صدیق اکبرؓ نے سوال کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی تنخواہ کتنی ہے؟جواب ملا ایک درہم۔تو آپؓ نے فرمایا کہ بس میرا معاوضہ بھی اتنا ہی ہوگا۔ہاں اگر کبھی میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک درہم میری ضروریات کے لیے کم ہے تو پھر میں پہلے مزدور کی تنخواہ میں اضافہ کروں گا۔تا کہ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو جائے۔

یہ اور بیسیوں اور مثالیں ہماری کتبِ روایات میں موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ فاروقِ اعظم سمیت خلفا

راشدہ اوران کے عوام میں کسی قسم کا بھی معاشی فرق موجود نہیں تھا۔ معاشی فرق موجود ہونا تو درکنار، ان کی تو زندگیاں ہی عام مزدوروں جیسی ہوتی تھیں۔ بائیس لاکھ مربع میل کی سلطنت کا مالک فاروق اعظمؓ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹا سو رہا ہے۔ ساتھ کوئی سیکیورٹی پروٹوکول نہیں، کوئی محافظ نہیں، نہ نیچے کوئی مخملیں بستر۔ اسی اثناء میں کسی دوسرے ملک کا کوئی وزیر یہاں دورے پر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ آپ کے امیر المومنین کہاں ہیں؟ تو سامنے درخت کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اتنی وسیع سلطنت کا مالک اور یوں زمین پر لیٹا سو رہا ہے؟ یہ کیا معاملہ ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ ''عمرؓ اپنی رعایا سے انصاف کرتا ہے۔ اسی لیے بے فکر ہو کر کھلے عام سو رہا ہے''۔ سبحان اللہ۔

تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی مثالیں کبھی حنیف صاحب نے نہ پڑھی ہونگی اور وہ لاعلم ہونگے۔ ہرگز نہیں۔ یہ سب جانتے سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر ان مقدس ہستیوں کی زندگیوں کو اپنے ہاں کے زرداریوں، شریفوں، دولتانوں، کھروں اور ان کے کمی کمین مزارعوں کی سطح پر لا کر ایسے فضول سوالات کرتے نظر آتے ہیں۔

اب ان کا ایک سوال یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صاحبِ حیثیت لوگوں کو ہی خلافت کیوں نہ ملی؟ بلالؓ کو کیوں نہ قائد بنایا گیا؟

اول تو یہ جملہ ہی سخت قابلِ اعتراض اور ان صحابہؓ کی توہین کے مترادف ہے کہ ''صاحبِ حیثیت''۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ان میں کوئی خود کو اعلیٰ نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے کیوں حنیف صاحب ہر دم ان صحابہؓ کے کردار کو اپنے سرمایہ دارانہ الفاظ سے داغدار کرنے کی کوشش میں لگے نظر آتے ہیں۔ کیوں ان کو خلفاء راشدین میں نواز شریف، بے نظیر، گیلانی اور زرداری جبکہ بلال اور دیگر رعایا میں پاکستانی مزدور، ٹھیلے والے، دیہاڑی دار پسے ہوئے لوگوں کا عکس نظر آتا ہے؟ مثل مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو سب کچھ ہرا ہی نظر آتا ہے اس لیے ان کی سوچ ہی سرمایہ دارانہ ذہنیت تک محدود ہے۔ اسی سے یہ ساری دنیا کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ یہ مودودی، بانی جدید کیپیٹلزم ایڈم سمتھ اور جوزف شمپیٹر کے نظریات سے خطرناک حد تک متاثر ہیں۔

رہ گیا یہ سوال کہ بلالؓ کو خلافت کیوں نہ ملی؟ تو اول تو خلیفہ وقت کا تعین ہمیشہ رائے عامہ کے تحت ہی کیا جاتا رہا ہے (ماسوائے حضرت عثمانؓ کے، جنہیں اپنے جانشین سے متعلق فیصلہ کروانے کا موقع ہی نہ ملا)۔ اور سب لوگ پہلے تین خلفاء اور پھر امیر معاویہؓ و یزیدؒ کے انتخاب پر مکمل طور پر راضی تھے۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اگر یہ تعین غلط ہوتا تو کوئی اعتراض کرتا کہ بھئی عمر

،ابوبکر یا عثمان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ خلافت کی ذمہ داریوں کو نبھا سکے، میں اس کا تقرر نہیں ہونے دوں گا۔چلو بلالؓ ہی اٹھ کر ان کی بیعت سے انکار کر دیتے۔کیوں نہ کیا ایسا؟بات صرف اتنی ہے کہ جس میں جتنی قابلیت ہوگی، اسے اسی مقام پر فائز کیا جائیگا۔لیکن صرف تقسیم کار کی رو سے۔یہ نہیں کہ اسے معاشی تقسیم سے منسلک کر دیا جائے۔عمر کا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے اور بلال کا پیدا کرنے والا بھی اللہ۔اور پھر تاریخ اسلامی میں ہم ایک غلط انتخاب کا انجام بھی دیکھ ہی چکے ہیں جب حضرت عثمانؓ کے قاتلوں نے خود ہی حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا دیا جن میں نہ کوئی انتظامی صلاحیت تھی، نہ قائدانہ خوبیاں۔نہ مشکلات سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ دوست دشمن کی پہچان۔ان کی خلافت اسلام کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے جس میں ان سے کئی بہت غلط فیصلے سرزد ہوئے۔مدینہ چھوڑنا، عثمانؓ کے قتل کے قصاص سے چشم پوشی، بلکہ قاتلانِ عثمانؓ کو اپنے پاس اہم عہدوں پر تعینات کرنا، ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر اپنے ہی بھائی معاویہؓ سے جنگ وجدل سے وحدتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کر کے ان میں فرقہ بندی کی وجہ بننا۔پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسینؓ سے بھی اسی قسم کی خطائیں سرزد ہونا اور تین سو صحابہ کے متفقہ طور پر منتخب یزید بن معاویہ کے خلاف خروج۔

اس کا مطلب ان مقدس ہستیوں پر الزام تراشی نہیں۔دراصل ان کے اندر وہ صلاحیتیں ہی موجود نہیں تھیں جو حضرت صدیقِ اکبرؓ، فاروقِ اعظمؓ اور عثمان غنیؓ میں پائی جاتی تھیں۔اور جنہوں نے خلافت کو کامیابی سے چلا کر دکھایا۔بات صرف صلاحیتوں کی ہے جو خدا کی دین ہیں۔لیکن جس میں یہ صلاحیتیں موجود نہیں، وہ بھی خدا کا پیدا کردہ ہے۔پھر آپ کون ہوتے ہیں یہ اعتراض کرنے والے کہ ''ان دونوں کو برابر کیوں کیا جائے''۔؟

جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، حنیف صاحب عمر اور بلال میں معاشی فرق کا ثبوت تو شاید پوری زندگی نہ لا سکیں، نہ کہیں انہوں نے پیش کیا ہے۔البتہ ان کا سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ ''کیوں نہ دی بلال کو عمر جیسی استطاعت؟ تو اب اتنی لمبی چوڑی گفتگو کے بعد بھی اگر حنیف صاحب قرآن کا یہ موقف سمجھنے سے قاصر ہیں تو آیئے پھر ان سے بھی ایک عدد سوال پوچھتا ہوں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔قرآن میں جگہ جگہ 'وھو علی کل شئی قدیر' درج ہے۔یعنی وہ کسی بھی کام میں مجبور نہیں۔ہر امر، ہر فعل پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔تو سوال یہ ہے کہ یہ جو جنگل میں ہم دیکھتے ہیں کہ شیر، چیتے، بھیڑیے، تیندوے اور مگرمچھ اور دیگر شکاری جانور ہرنوں، زیبروں، بکریوں اور بھینسوں کا شکار کرتے اور انہیں

دردناک انداز میں مار کر ہڑپ کر جاتے ہیں،تو اللہ تعالیٰ نے ایسا ''ظالمانہ'' نظام کیوں قائم کیا کہ جس میں خوراک کی خاطر دوسرے جاندار کی ناحق جان لینا پڑے؟ ٹیلی وژن پر آپ نے بھی ضرور یہ مناظر دیکھے ہونگے ۔کتنا دردناک منظر ہوتا ہے نا؟ ہرن آگے آگے گھبرا کر بھاگ رہی ہوتی ہے، پیچھے شیر ہوتے ہیں،اچانک وہ اسے جا لیتے ہیں اوراس کی گردن سے اسے کاٹ کھاتے ہیں، پہلے سارا خون پیتے اور پھر سب مل کراس کے گوشت کی دعوت اڑاتے ہیں،کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مادہ ہرن اپنے معصوم بچے کوان شکاریوں کے ہاتھوں ذبح ہوتا دیکھ رہی ہوتی ہے۔ان مناظر کو دیکھ کر دل پگھل جاتا ہے کہ یہ کیا اصول ہے؟اس کی کیا منطق ہے؟

کیا قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ان درندوں کی خوراک کا کوئی پرامن انتظام نہیں کرسکتا تھا؟

اگر آپ کہتے ہیں کہ بھئی درندوں کا کام ہی گوشت کھانا ہے تو اگر گوشت ہی انہیں کھلانا تھا تو گوشت کا کوئی اور پرامن انتظام ممکن نہیں تھا؟ ظاہر ہے جب خالق کے متعلق یہ بات ہم تسلیم کرتے ہوں کہ وہ ''قادرِ مطلق'' ہے تو پھر کیا مجبوری تھی کہ ایسا خونی قانون بنایا گیا جس کے تحت ایک کو اپنی خوراک کے لیے لازمی طور پر دوسرے کی جان لینا پڑے؟؟؟ سوچیے؟ کیا مجبوری تھی؟اگر اسے مجبور کہیں گے تو وہ قادرِ مطلق نہیں رہتا۔جبکہ قران کہتا ہے کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔اوراگر اسے واقعی قادرِ مطلق تسلیم کرتے ہیں تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ ان کی خوراک کا کوئی پرامن ذریعہ کیوں نہ بنایا؟ ایک دوسرے کا قتل عام ہی کیوں لازمی قانونِ معاش ٹھہرا؟

یاسب جانور سبزی خور کیوں نہ بنادیے گئے؟عمرؓ اور بلال کی استعداد میں فرق پہ معترض حنیف صاحب کے لیے یہ مقامِ فکر ہے۔

آگے ایک مضحکہ خیز موازنہ پھر سے ان الفاظ میں دہرا رہے ہیں کہ:

''بلال غلام اورعمر خلیفہ۔۔۔۔یہ ٹھیک۔۔۔۔۔۔اگر کوئی مل اور بنگلے کا مالک اورغریب مزدور جھونپڑی میں تو وہ قارون اور سرمایہ داری۔۔۔۔۔۔۔۔اسے کہتے ہیں میٹھا میٹھا ہپ،کڑوا کڑوا تھو''۔

ساتھیو ایسی مثالوں اورموازنوں سے کسی جگہ بھی ایسا گمان ہورہا ہے کہ ہم کسی باشعوراور عالم شخص سے گفتگو کررہے ہیں؟ کیسے بچگانہ اعتراضات بار بار دہرائے جارہے ہیں۔گزشتہ تصریحات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ دار اورغریب مزدور کا موازنہ عمر فاروق اور بلال سے آخر کس بناء پر کر ڈالا؟ کیا عمر سرمایہ دار تھا اور بنگلے کوٹھی میں رہائش پذیر تھا؟ یا

بلال چھوٹی سی کٹیا میں رہ کر محنت مزدوری سے مشکل سے گزر اوقات کرتا تھا؟ جب عمر اور بلال میں ایسا کوئی معاشی فرق ہی موجود نہیں تھا تو کیا شرمناک گستاخی نہیں کہ ان دونوں کو آج کے سرمایہ دار اور مزدور کے فرق کے ساتھ ''تولنے'' کی کوشش کی جائے؟ اللہ ہی ہدایت دے۔ ہم تو صرف دلائل ہی پیش کر سکتے ہیں۔

حنیف صاحب کا ایک نظریہ ہے کہ مزدور کا بچہ مزدور ہی بنے گا، اور انجینئر کا بچہ انجینئر۔ بھنگی اپنے بچوں کو بھنگی ہی بنائے گا اور حجام اپنے بچوں کو دکان پر کٹنگ اور شیو پر لگائے گا۔ لوہار کے بچے لوہے کا کام کریں گے جبکہ بڑھئی کی اگلی نسلیں بھی فرنیچر بنائیں گی۔

دیکھیں گزشتہ سطور میں ایک جگہ اس بات کی وضاحت کی گئی کہ قرآن کریم ایک ریاست قائم کرنے کی بات کرتا ہے، اس ریاست کے تحت امورِ معاشرہ چلائے جاتے ہیں۔ ہر شخص کو ریاست تعلیم کی بہترین سہولتیں فراہم کرتی ہے تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ اسے موقع نہیں مل سکا۔ ذہین تھا مگر حالات کی تنگی نے آگے پڑھنے نہیں دیا اور مزدوری کرنا پڑی۔ ریاست جہاں افرادِ معاشرہ کی کفالت کی ذمہ دار ہے، وہاں انہیں اپنی فکری و علمی نشوونما کے بھرپور مواقع دینے کی بھی پابند ہے۔ ''ایتائے زکوٰۃ'' میں صرف روٹی کا انتظام کرنا شامل نہیں، بلکہ ہر فرد کی علمی، فکری، تخلیقی اور جسمانی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع دے کر اسے آگے بڑھنے میں مدد دینا بھی شامل ہے۔ سب کو مواقع یکساں طور پر ملیں گے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اپنی اپنی دماغی صلاحیتوں کے تحت کون کس قسم کا رجحان رکھتا ہے۔ کون ذہین ہے اور فکری و تخلیقی کام کے لیے موزوں ہے اور کون سا شخص اس کی بجائے جسمانی محنت کو ترجیح دیتا ہے؟ جو فکری امور کے لیے موزوں ہونگے، انہیں ان امور کی انجام دہی کے لیے چن لیا جائیگا، جو جسمانی کام کے لیے موزوں ہونگے۔ انہیں جسمانی ذمہ داریاں سونپی جائیں گی۔ ہونگے یہ سب ریاست ہی کے ملازم۔ قرآنی ریاست ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا ذمہ لے گی اور یہ اس کے بدلے میں اپنے اپنے فرائض منصبی انجام دینے کا ذمہ لیں گے۔ یہ بھی صلوٰۃ ہی کی ایک جہت ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض منصبی پوری دیانتداری سے انجام دے جو ریاست نے اس کے ذمہ لگائے ہیں۔

ایک حجام دوکان پر لوگوں کی شیو اور حجامت کیوں کرتا ہے؟ ایک لوہار لوہے کے گیٹ کھڑکیاں کیوں بناتا ہے؟ ایک بڑھئی فرنیچر کیوں بناتا ہے؟ اس لیے کہ وہ روپیہ کما سکے۔ روپیہ اس لیے کمانا چاہتا ہے کہ اس سے اپنے کنبہ کی ضروریات پوری کر سکے۔ تو جب یہ ضروریات ریاست خود پوری کر رہی ہوگی تو پھر کیوں نہ کوئی اپنے اپنے فرائض منصبی انجام دے گا؟ ریاست

ان کو ذمہ داری سونپے گی کہ بھئی آپ نے فلاں وقت سے فلاں وقت تک فلاں کام کرنا ہے،اس کا معاوضہ آپ کو ریاست کی جانب سے اتنا دیا جائیگا۔اب ریاست یہ کام مفت میں تو کروانہیں سکتی۔ظاہر ہے وہ معاوضہ بھی دے گی اور ساتھ اضافی (Bonus)وغیرہ بھی ہونگے۔جس سے وہ شخص اپنی ضروریات کے علاوہ اپنے شوق بھی جائز حد تک پورے کر سکے۔اور جب کبھی ریاست کی آمدن میں پیداوار بڑھنے کے سبب اضافہ ہوتو ممکن ہے ریاست اس کے بونسز وغیرہ میں مزید اضافہ کر دے۔اور یہ اپنے کئی اور شوق پورے کرنے کے قابل ہو جائے جو پہلے نہیں کر پاتا تھا۔

آجکل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری ملازمت کرنے والوں کو کیا کیا سہولیات میسر ہوتی ہیں۔حالانکہ ابھی نظام قرآنی نہیں،لیکن گورنمنٹ جاب کرنے والے تنخواہ کے علاوہ اکثر مختلف الاؤنسز،بونسز،ایندھن کا خرچ،میڈیکل

ایمرجنسی کی صورت میں اخراجات، ریٹائرمنٹ پر پنشن،زچگی کے دوران تعطیلات بمع تنخواہ،مختلف مراعات،بچوں کے وظائف اور گھر کے کسی فرد کی وفات پر تدفین کے اخراجات تک۔یہ سب ایک سرکاری ملازم کو حکومت کی جانب سے ملتا ہے۔پنشن تو تاحیات جاری رہتی ہے۔بلکہ فوت ہو جانے پر آپ کی اولاد کو بھی ملتی رہتی ہے،جب تک وہ شادی نہ کر لے۔تو یہ سب کیا ہے؟ یہ قرآنی نظام نہیں،لیکن پھر بھی یہاں ریاست آپ کو اتنے فوائد دیتی ہے تو اگر قرآنی نظام قائم ہو جائے تو اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کیجیے کہ تب تمام افرادِ معاشرہ کیسے ان سب سہولیات سے مستفید ہونگے۔

قرآنی معاشرہ میں ہر وہ شخص جو محنت کی صلاحیت رکھتا ہوگا،وہ محنت کرنے اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی پر مجبور ہوگا۔اور ریاست اس کے بدلے ان کی کفالت کرے گی۔قرآنی نظام میں مفت خوروں (سرمایہ پر پلنے والے اور مذہبی پیشواؤں) کی کوئی جگہ نہیں۔انہیں بھی ریاست کی جانب سے انکی صلاحیتوں کے مطابق فکری یا جسمانی محنت کرنا ہوگی،اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ان کی کفالت کی ریاست ذمہ دار نہیں ہوگی۔پھر وہ آپ کے خلاف کوئی بھی اقدام کرنے کی مجاز ہوگی۔چاہے آپ کو بزورِ طاقت کام پر مجبور کرے یا پھر ریاست چھوڑ کر کہیں اور ٹھکانہ کرنے کا حکم دے۔ہاں البتہ ان میں سے کوئی محنت سے جسمانی طور پر معذور ہے تو پھر اس کے ساتھ احسان والا وہی معاملہ کیا جائیگا جس کا ذکر پیچھے ایک باب میں میں نے کیا۔

قرآنی ریاست کا فرد اس لیے بھی کماتا ہے کہ وہ ریاست کا شہری بنتے وقت اس سے ایک معاہدہ کر چکا ہے۔''اللہ نے ان کے جان و مال ان سے خرید لیے،اور اس کے بدلہ میں انہیں جنت عطا کر دی''۔پس اس عہد کو نبھانا ریاست کے شہریوں کا فرض ٹھہرا۔وہ اپنے فرائض منصبی پوری دیانتداری سے انجام دیں گے اور قرآنی نظام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان تک کا

نذرانہ پیش کرنے سے بھی نہیں گھبرائیں گے۔صرف اپنی ضرورت کے بقدر لیں گے اور باقی سب منفعتِ عامہ کے لیے وقف کر دیں گے۔یعنی یہ لوگ پیداوار پوری پوری دے رہے ہونگے۔مگر ریاست سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر ہی لے رہے ہونگے اور ریاست اضافی پیداوار سے ان لوگوں کی کفالت کرے گی جو سائل ومحروم ہونگے۔یوں معاشی ناہمواریاں پیدا ہی نہیں ہونے دی جائیں گی۔

قرآنی ریاست کا فرد اس لیے بھی کماتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور پھر اس کی زائد پیداوار سے دوسرے ضرورتمندوں کو سامانِ نشوونما ملتا رہے جس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔یہ وہ عظیم مقصد ہے جس پر اسلام کی تعلیمات فوکس کرتی ہیں اور جس کے لیے انسان اس دنیا میں آیا ہے۔کہ اس میں صفاتِ خداوندی ظہور پذیر ہوتی چلی جائیں۔وہ دنیا میں رہ کر رب کے نقشِ قدم پر چل کر دکھائے۔جیسے رب ساری کائنات کو پالتا ہے،انسان بھی اپنی کمائی سے دوسروں کی زیادہ سے زیادہ پرورش وربوبیت کرے۔ہمارا حقیقی مقصدِ حیات اللہ کی عبادت اور اپنی ذات کی نشوونما ہے۔نہ کہ جانوروں کی طرح صرف اپنا پیٹ پالنا،افزائش نسل کرنا،اور مر جانا۔اللہ فرماتا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (سورہ الذریات۔آیت 56)

ہم نے جن وانس کو صرف اپنی بندگی (اطاعت) کے لیے پیدا کیا

دوسروں کے لیے جینا ہی اصل زندگی ہے۔اور جتنا آپ دوسروں کو دیتے ہیں،اسی قدر آپ کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے اور آپ میں صفاتِ خداوندی کی نمود بشریت کی حد تک ہونے لگتی ہے۔یہی وہ چیز ہے جو کوئی اپنے اندر جب پیدا کر لیتا ہے تو وہ موت کے بعد اگلی ارتقائی منازل کامیابی سے طے کرتا چلا جاتا ہے۔(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے باب :انسانی ذات کا تصور)

فرض کریں ـــــ میں ایک ڈاکٹر ہوں ـــــ میری ماہانہ آمدنی 10 لاکھ ہے میرا ماہانہ خرچ ، ایک لاکھ ہے ـــــ اب میں اپنی بچت سے ، گاڑیاں ، بنگلے ، وغیرہ وغیرہ خریدتا ہوں ـــــ
آپ کے تصور کے مطابق ، کیا میں سرمایہ دار ہوں ؟؟؟؟
اور 2/219 کے اس مفہوم کے مطابق ، جسے میں درست نہیں سمجھتا ، آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے ـــــ

مزید بات آپ کے جواب کے بعد کریں گے ۔ اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ سرمایہ از خود کس طرح ، مزید سرمایہ کما سکتا ہے ۔ سوائے ربوٰ کے ۔یا یہ بھی محض ایک تصوراتی بات ہے ـــــ کہ جناب کوئی اپنے سرمایے سے کما رہا ہے ۔ سلامت رہیں

Comment no : 43,45,55,62 ضروریات کا تعین اور اسراف کی ممانعت

حنیف صاحب ایک سوال کرتے ہوئے سرمایہ داری کا مفہوم جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے سوال کو ایک بار غور سے پڑھیے۔جو سوال پیش کیا جارہا ہے،وہ تو خود ہی یہ ثابت کررہا ہے کہ آپ سرمایہ دار ہیں۔دس لاکھ کماتے ہیں اور ضروریات آپ کی صرف ایک لاکھ کی ہیں۔باقی نو لاکھ آپ اللے تللوں پر وقف کررہے ہیں۔گاڑیاں بنگلے خرید رہے ہیں۔اور پوچھ رہے ہیں کہ ''کیا میں سرمایہ دار ہوں''؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ یہ گاڑیاں، بنگلے کیوں خرید فرمارہے ہیں؟ کیا یہ مال جو آپ نے کمایا تھا یہ آپ کا اپنا تھا؟اس مال کے کمانے میں آدھے سے زیادہ کریڈٹ تو اللہ کو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو دی جانیوالی صلاحیتیں، سمع و بصر، حافظہ وفکر، پھر اللہ کی دی ہوئی وہ زمین جس کے وسائل سے آپ نے کمایا، پھر وہ

زمینیں جو آپ نے خریدیں وہ بھی رب کی دی ہوئیں، آپ کا اس میں کیا ہے بھئی؟

جو مال آپکے پاس ایک امانت ہے، آپ کو فضول خرچی کی اجازت کس نے دے دی کہ آپ دھڑا دھڑ گاڑیاں بنگلے خریدتے چلے جارہے ہیں، اور ان بنگلوں کو آگے کرائے پر دے کر مزید مال کمانے لگ گئے ہیں۔پھر پوچھتے ہیں کہ ''سرمایہ سرمائے کو کیسے کمارہا ہے''۔۔۔۔؟؟؟

مکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھنگ نکالا ہے۔ہمی سے پوچھتا ہے تم کو کس نے مار ڈالا ہے؟

اللہ تعالیٰ اس مال میں جو اس نے دیا ہے اور جو انسان کے پاس امانت (درست استعمال سے مشروط) ہے، فضول خرچی اور اللے تللوں کی اجازت نہیں دیتا۔ضروریات کے تعین کے سلسلہ میں واضح فرمانِ الٰہی ہے کہ:

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (سورہ الاعراف۔آیت 31)

یہ مال تو اللہ کا ہے، اس میں آپ غلط تصرف نہیں کر سکتے۔جو اضافی آمدن ہے، وہ قرآنی نظام کے تحت ریاست کو لوٹانا پڑے گی تاکہ اس سے دوسرے ضرورتمندوں کی کفالت ہو سکے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔اگر یوں اثاثہ جات خرید کر فضول خرچی کا مظاہرہ کریں گے تو ریاست آپ کو قانون کے مطابق سزا دینے کی مجاز ہوگی۔اور اگر غیر قرآنی نظام ہے تو آپ پھر بھی اپنے سارے اضافی مال میں تصرف کا حق نہیں رکھتے۔کیونکہ یہ آپ کی اپنی ہنرمندی سے کمایا ہوا نہیں، اس میں زیادہ تر حصہ اللہ کا تھا۔اور وہ کہتا ہے کہ اسے اس کا حصہ لوٹاؤ۔اگر نہیں لوٹایا تو آپ ''تاکلون اموال الناس بالباطل'' کی وعید کی زد میں

آئیں گے۔ کیونکہ یوں آپ دوسروں کی محنت کی کمائی خود ہڑپ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

سواءً للسائلین، متاعاً للمقوین

اس نے اسے بھوکے اور ضرورتمندوں کے لیے وقف کررکھا ہے، یہ مال انہیں دے دو، تو سمجھو کہ مجھ تک میرا حصہ پہنچ گیا۔ پس آپ پر لازم ہے کہ آپ (غیر قرآنی نظام میں) ایسی فضول خرچی نہیں کرسکتے۔ آپ اگر نو لاکھ روپیہ زائد از ضرورت کمارہے ہو تو ٹھیک ہے اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے تین چار لاکھ روپیہ پس انداز کرتے جاؤ، (کیونکہ غیر قرآنی ریاست آپ کی کفالت کی ذمہ داری نہیں لیتی) لیکن اس میں سے اتنا ہی آپ دوسرے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دو۔ انفاق کرو۔ اپنا سرمایہ دارانہ انفاق نہیں، قرآنی انفاق، جو آپ کے ہاتھ سے یہ اضافی دولت نکال کر ضرورتمندوں کے پاس پہنچائے، نہ کہ یوٹرن لے کر واپس آپ کی ہی جیب میں آجائے۔ صدقات و خیرات کی شکل میں آپ یہ اضافی آمدن غرباء و مساکین کو دینے کے پابند ہیں۔

درج بالا صورتحال غیر قرآنی عبوری دور سے متعلق ہے، اس کے برعکس ایک قرآنی نظام ریاست میں آپ کی تمام زائد آمدن ریاست کی تحویل میں جائے گی جو پھر معاشرے کے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرے گی۔ آپ دولت جمع نہیں کرسکیں گے۔ کیونکہ ریاست نے جب آپ کی کفالت کا ذمہ لیا ہے، آپ کے بچوں کی کفالت کی ضامن ہے تو آپ کو کیوں ان کی فکر ہوگی؟ آپ اپنی پوری محنت اور دیانتداری سے فرائض مسیحائی انجام دیں گے اور ریاست سے معاوضہ پائیں گے۔

پوری صلاحیت سے کماؤ

انسان اپنی پوری صلاحیت سے کمائے اور صرف اپنے بقدر ضرورت رکھ کر باقی دوسرے ضرورتمند سائل و محروم افراد کی پرورش کے لیے وقف کردے:

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا

اللہ (کا نظام ریاست) کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اس کی استعداد کے مطابق۔

کیونکہ جن ذرائع سے اس نے کمایا ہے، وہ سب اللہ کے عطا کردہ تھے۔ اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر اس رب الاعلیٰ کا شکر بجا لانے کا واحد طریقہ ان نعمتوں کا درست استعمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ:

لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (سورہ ابراہیم۔ آیت 7)

اگر تم اپنے رب کا شکر (نعمائے خداوندی کا درست استعمال) ادا کرو گے تو وہ تمہیں اور زیادہ دے گا۔

نوٹ: شکر کرنے کا مطلب محض زبانی کلامی شکر اللہ، الحمدللہ کی گردان کرتے جانا نہیں ہوتا (ظاہر ہے کہ زبانی کلامی شکر سے تو کبھی بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ آپ ایک روٹی سامنے رکھ کر چاہے ایک کروڑ بار شکر الحمدللہ پڑھ لیں، لیکن وہ کبھی بھی ایک سے دو نہیں ہو سکتیں)۔ شکر کا مطلب ہے نعمائے خداوندی کا درست استعمال (احکاماتِ خداوندی کے مطابق)۔ یہ درست استعمال ہی ہے جو معاشرہ میں تعمیری نتائج اور خوشحالیاں پیدا کرتا ہے اور یوں اللہ کے وعدے کے مطابق خود بخود رزق میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے، اور اللہ اسے بڑھا کر کئی گنا کر دے۔ (سورہ الحدید۔ آیت 18)

اللہ کے نظام کی راہ میں دینے کے نتائج اجتماعی خوشحالی اور فلاح و بہبود اور جنتی معاشرہ کے قیام کی صورت میں سکون، امن اور خوشیوں کی نوید بن کر ہر انسان کی دہلیز پر دستک دیتے ہیں۔

اور صرف ضرورت کے مطابق لو۔

اس عظیم الشان قانونِ خداوندی کا اگلا حصہ جو کہ آیت مبارکہ ''جو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ اعتدال کے مطابق ہوتا ہے''۔ سے بھی واضح ہو رہا ہے، صرف بقدر ضروریات لینے کا حکم ہے۔

اللہ کی جانب سے عطا کردہ صلاحیتوں اور نعمتوں کے ماحصل کو اللہ کی جانب سے بتائے گئے مصارف کی بجائے اپنے اللوں تللوں پر خرچ کرنا اسراف ہے، تبذیر ہے جس کی ممانعت ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُورا (سورہ بنی اسرائیل۔ آیت 29)

اپنے ذاتی اخراجات کے سلسلہ میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھو۔ نہ تو تم اپنے ہاتھ کو اتنا تنگ کر لو کہ وہ تمہاری گردن کے ساتھ ہی بند کر رہ جائے، نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو۔ پہلی صورت (بخل) میں تم پر ہر طرف سے تنقید اور لعنت ملامت ہوگی، جبکہ دوسری صورت (فضول خرچی) میں تم خود دیوالیہ ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (سورہ بنی اسرائیل۔ آیت 24)

(اسی بنیادی اصول کو اب آگے بڑھاتے جاؤ) جو لوگ تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں، یا جن کی معاش کا پہیہ کسی حادثہ کی بناء پر چلتے چلتے رک گیا ہے، یا جو مسافر زادِ راہ کے بغیر

رہ گیا ہے، ان سب کا بھی تم پر پورا حق ہے۔ ان کے حقوق بھی ادا کرو۔

مال کو بے جا صرف مت کرو، عیاشی سے گریز کرو۔ اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھو کہ مال معاشرہ کی فصل کے لیے ایک بیج کی مانند ہے۔ اگر بیج درست جگہ اور درست وقت پر بویا جائے تو ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے پیدا ہونگے (یعنی نتیجہ معاشرہ کی اجتماعی خوشحالی اور تمہاری ذات کی نشوونما کی صورت میں زبردست انداز میں برآمد ہوگا)۔ لیکن اگر اسے بے تکے انداز میں غلط جگہ پر بکھیرا جائے تو فصل اگنا تو دور کی بات، بیج بھی ضائع ہوجائیگا۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (سورہ بنی اسرائیل۔ آیت 27)

بیشک مال کو فضول خرچی میں ضائع کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔

یہ آیات واضح نشاندہی کررہی ہیں کہ آپ دوسروں کی محنت کی کمائی اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر کسی صورت اپنے تصرف میں نہیں لا سکتے۔ بلکہ جو بھی مال آپ کے پاس موجود ہے، وہ اللہ کی امانت ہے، آپ کو اس پر عینی ملکیت حاصل نہیں۔ اس لیے آپ اس میں سے صرف بقدر ضرورت ہی چن سکتے ہیں جو کل کائنات کی مخلوقات کا اصولِ معاش بھی ہے۔ باقی کا رزق نوع انسانی کی اجتماعی منفعت کے لیے چھوڑ دینا ہوگا۔

(ویسے حنیف صاحب کا یہ دعویٰ (کہ کماؤ پوری صلاحیت سے، اور رکھو صرف بقدر ضرورت) اسی وقت غلط ثابت ہوگیا تھا جب میں نے قرآنی نظامِ معیشت کے ثبوت خارجی کائنات سے دیتے ہوئے شہد کی مکھی کی زندگی کا احوال بیان کیا تھا، جہاں اللہ تعالیٰ نے اسکی حیات کو غور وفکر کرنے والے اہل عقل کے لیے شفاء اور ہدایت قرار دیا ہے)۔ پس اس حصہ میں انکے تصورات پر جرح اضافی طور پر شامل کی گئی ہے۔

Mohammad Hanif چلیں اگر یہ بات ہے تو پھر خلیفہ ثانی فاروق اعظم
کے اس قول کا کیا مطلب تھا "اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی
پیاسا مر گیا تو روز قیامت عمر زمہ دار ہوگا۔"
یہ کیا حضرت عمر نے صرف ڈائیلاگ ہی مارا تھا یا اس کے پیچھے کوئی
عملی اقدام بھی موجود تھا؟؟؟ اور دور رسالت اور خلافت راشدہ میں
ایسی غربت نہیں تھی جیسے ہمارے اس معاشرہ میں پائی جاتی ہے۔
وہاں کوئی بھوکا نہیں مرتا تھا۔۔۔

اسے کہتے ھیں ۔ میٹھا میٹھا ھپ ھپ ۔۔ کھارا کھارا تھو تھو ۔۔
کہاں تو یہ رویہ کہ پوری بخاری ، مجوسی سازش ۔۔۔۔ اور کہاں یہ کہ وہ
بات جس کا ھمیں قرآن نے پابند ھی نہیں کیا ، اس کی تہمت سیدنا عمر
رض پر لگا رھے ھیں ۔۔۔۔۔
پہلے تو آپ اس قول کی سند پیش کریں ۔۔۔ یا پھر اتنا ھی کافی ھے کہ
جو آپ کو سوٹ کرے وہ ھی درست ھے ۔۔۔۔۔
پھر مجھے قرآن کریم کی کسی آیت مبارکہ سے یہ ثابت کریں کہ اسلامی
ریاست ، یا کوئی مومن ، کسی جانور کی روٹی کا بھی ذمہ دار ھے ۔۔

میرے بھائی ۔۔۔۔ اس ھی لیے تو بار بار عرض کر رھا ھوں کہ اپنی دانش
کو آواز دیں ۔۔ اپنی فہم پر بھروسہ کریں ۔ خود سوچیں کہ اس طرح کے
غیر مستند اقوال پیش کر کے آپ سوائے ایک عظیم المرتبت صحابی
رسول کی عزت بڑھا رھے ھیں یا گھٹا رھے ھیں ۔۔۔۔۔۔
اور پھر یہ قرآن کے طالب علموں کے لیے ، روایات یا اقوال سند کیسے بن
گئے ھیں ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

قرآن ھمیں انسانوں کی روٹی کے بندوبست کا حکم دیتا ھے ۔۔ کسی
جانور کی روٹی کے ھم ذمہ دار نہیں ھیں ۔۔ سوائے اس صورتحال کے ، کہ
وہ ھمارا پالتو ھو ۔۔ اور یہ بھی صرف اس لیے ھے کہ ھم اپنے پالتو
جانوروں کو آزادانہ کھانے پینے کےلیے آزاد نہیں چھوڑتے ۔۔۔۔۔

برائے مہربانی آپ حضرت عمر رض کو اس زمہ داری کا پابند نہ بنائیں جو ان
پر اللہ عائد ھی نہیں کرتا ۔۔۔۔۔

Comments 173 انسانوں کے ساتھ جانوروں کے رزق کی ذمہ داری کا معاملہ

حنیف صاحب کا موقف ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ ''اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی پیاسا مر گیا تو قیامت کے روز عمر اس کا ذمہ دار ہوگا''۔اور استدلال یوں کرتے ہیں کہ قرآن میں کہیں انسانوں پر جانوروں کے رزق کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔اس لیے یہ قول حضرت عمرؓ کی جانب غلط طور پر منسوب ہے۔

انہوں نے قرآن سے دلیل مانگی ہے۔چلیں ہم قرآن ہی سے دلیل پیش کرتے ہیں۔

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (سورہ ہود۔آیت 6)

روئے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

گزشتہ ابواب میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ انسانوں کی اس دنیا میں اللہ کی ذمہ داریاں انسانوں کی جانب سے قائم کردہ نظام کے تحت ہی پوری ہوتی ہیں۔انسان کو بااختیار اسی لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یہ حاکمیت اپنی اس زمین پر قائم کر کے دکھائے۔

نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں تک کے رزق کی ذمہ داری بھی یوں قرآنی مملکت پر عائد ہوتی ہے۔اور یہی وجہ تھی جو فاروق اعظمؓ نے اس قدر عظیم الشان اعلان کیا۔

قرآنی ریاست کا یہ فریضہ ہے کہ وہ تمام انسان اور جاندار جو اس کی حدود میں بستے ہیں،ان کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر لے۔جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لے گی،وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔اب ظاہر ہے مملکت اپنی یہ ذمہ داری تب ہی پوری کر پائے گی جب وہ وسائل پیداوار اور رزق کے سرچشمے اپنی تحویل میں لے اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دینے کے قابل ہو سکے۔ہر شخص اپنی پوری صلاحیت سے کام کر کے پیداوار میں اضافہ کرے اور صرف اپنی ضرورت کے بقدر ہی مرکز سے حاصل کرے۔

جو ریاست ایک کتے کے بھی بھوک سے مر جانے پر خود کو قصوروار سمجھتی ہو،وہ کسی انسان کا بھوک سے مرنا کیسے برداشت کر سکتی ہے؟؟؟ پھر اللہ کہتا ہے کہ:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْداً وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلاً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّن نَّبَاتٍ شَتَّى كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ

لِّأُولِي النُّهَىٰ (سورہ طٰہٰ۔آیات 53تا54)

وہی رب ہے جس نے اس وسیع وعریض کرہ ارض میں تمہارے لیے سامان رزق جمع کر دیا اور تمہاری نقل و حرکت کے لیے راستے بنا دئے۔وہ رب جو بادلوں سے بارش برساتا ہے،اور اس کے پانی سے آب پاشی کے ذریعہ قسم قسم کی نباتات پیدا کرتا ہے۔تا کہ تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔اس نظام فطرت میں عقل وفکر رکھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

دیکھئے آیت بالا میں بھی ہماری زمینی پیداوار میں انسان اور ہمارے مویشی دونوں کے لیے رزق موجود ہونے اور انہیں فراہم کرنے کی بات کی گئی ہے۔

صرف زمینی مخلوقات نہیں بلکہ مستقبل میں اس کائنات کی ہر نئی تسخیر شدہ دنیا اللہ کے نظام کی ذمہ داریوں میں شامل ہوسکتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور نکتہ بھی بیان کرتا چلوں۔قرآن کے معاشی نظام کا قیام چونکہ بذات خود مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود صرف رزق کی فکر سے آزاد ہوکر اپنی ذات کی نشو ونما کرنا اور صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہوئے اس دنیا کے حسن میں اضافہ کرنا ہے۔

قرآن انسانوں کی ضروریات پوری کر کے خاموش نہیں ہوجاتا۔وہ کہتا ہے کہ اس زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کے بعد تم اور آگے بڑھو گے۔اس کائنات کو تسخیر کرو گے۔دوسرے سیاروں تک پہنچو گے۔وہاں بھی مخلوقات موجود ہیں۔جاندار صرف اس زمین پر موجود نہیں، بلکہ اس زمین کے علاوہ بھی کائنات میں کئی اور زمینیں موجود ہیں جہاں زندگی موجود ہے۔

اللہ نے اس نظام کو صرف انسان تک محدود نہیں رکھا۔بلکہ اس نے لفظ ''دابة'' استعمال کیا ہے جس کے معنی ہر ذی روح یا چلنے پھرنے والے کے ہیں۔نیز ''دابة'' کے متعلق اس نے کہا ہے کہ اسی زمین میں ہی نہیں، بلکہ یہ تو ''اجرامِ فلکی'' میں بھی موجود ہیں،اور رب تو انسانوں کو ان سے کسی روز ملا دینے کا بھی اشارہ دے رہا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (سورہ الشوریٰ۔آیت 29)

اہل مغرب کے سائنسدانوں کے سامنے صرف زمین سے باہر دوسری دنیاؤں اور سیاروں کی تسخیر ہے اور مغرب کے سیاسی مدبرین کے نزدیک اس کا مقصد زمین سے باہر جدید دنیاؤں میں بھی اپنی استعماریت کی توسیع ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا قرآنی نظام جو کہ خود اس تسخیر کا حکم دیتا ہے، اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ وہ زمین پر بھی تمام انسانوں کا اجتماعی مفاد سوچتا ہے اور اس زمین سے باہر بھی اس کے پیش نظر تمام کائنات اور تسخیر شدہ دنیا کا مفاد عامہ ہے۔

ایسے حالات میں قرآنی نظام ریاست یہ سوچے گا کہ ان دوسرے سیاروں میں بسنے والے ''دابۃ'' کی پرورش کی ذمہ داری بھی اس کے فرائض میں شامل ہو چکی ہے۔ کیونکہ اللہ نے تو خود کو رب العالمین کہا ہے۔ تو با اختیار انسان جس زندگی کے حامل سیارے کو بھی تسخیر کرے گا، وہ بھی قرآنی ریاست کا ہی حصہ بن جائیگا اور ان مخلوقات کی پرورش ونشو ونما بھی نظام خداوندی کی ذمہ داری بن جائیگی۔

بہر حال یہ تو میں کروڑوں اربوں سال دور کی بات کر رہا ہوں۔ فی الحال تو ہمیں دوسری دنیاؤں کی فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہماری ذمہ داری میں ابھی صرف یہ کرہ ارض اور اس کی مخلوقات ہی شامل ہیں۔ اس لیے سب سے پہلی ذمہ داری اس زمین پر معاشی مساوات قائم کرنا ہے۔

Mohammad Hanif اس لیے میری آپ سے درخواست یہ ہے کہ آپ کا وہ نوٹ نامکمل ہوگا جب تک آپ اس میں دنیا سے غربت ختم کرنے کا قرانی فارمولہ نہ پیش کریں۔ جو موثر ترین اور قابل عمل بھی ہو۔۔۔ آپ کو ایسا فارمولا پیش کرنا پڑے گا۔ اگر آپ ایسا نہ کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر آ کے خیال میں دین اسلام تو پھر کوئی انسانی فلاحی منصوبہ پیش نہیں کر سکتا۔۔۔

دنیا سے غربت کا خاتمہ تو وہ پہلی اسلامی حکومت بھی نہ کر سکی تھی جس کی قیادت وقت کا نبی کر رھا تھا ۔۔۔۔۔۔
علامہ اقبال رح کا ایک شعر ھے ۔۔۔۔ فرمایا

ستیزہ کار رھا ھے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

یہ کشمکش تو ھمیشہ چلتی رھے گی ۔ نہ جانے آپ کسی سے اس کے ھتھیار چھین کر فتح کیوں چاھتے ھیں ۔ آپ کا انداز فکر تو یہ محسوس ھوتا ھے کہ اگر کسی نے چھری سے قتل کر دیا ، تو چھری پر ھی پابندی لگا دی جائے ۔ نہ چھری ھوگی اور نہ قتل ھوگا ۔۔۔۔۔۔

ارے میرے بھائی ۔۔۔۔۔ چھری بھی قائم رھے ۔ اور لوگوں کی اصلاح بھی ھو جائے ، کہ وہ اس سے پھل کاٹ لیا کریں ۔ قتل نہ کریں ۔

ارشاد باری تعالٰی ھے ۔۔۔۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (١٥٥) الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (١٥٦) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔
2/155

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے (155) ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ: "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے" (156) انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں ۔
ترجمہ جناب مودودی صاحب

یہ سب گردشیں ھیں ۔ کسی کو مال کی فراوانی دے دی ۔ کسی کو علم کی ۔ کسی کو ھنر کی ۔ اور پھر وہ کاریگر بڑی نفاست سے گردشیں دئے جا رھا ھے ۔ بلکل اس طرح جیسے ، دودھ کی گڑوی میں ھم مدانی چلاتے ھیں ۔ تاکہ دودھ کا اصل ست ، یعنی مکھن اوپر آ جائے ۔ بلکل اس ھی طرح ، وہ سعید روحیں اپنی نشوونما کر کے ، زندگی کی آگے کی منازل طے کرنے کے قابل ھو جائیں گی ۔

Mohammad Hanif کیونکہ ظاہر ہے جب ہر کسی کے پاس اپنی کمائی پوری پوری رکھنے کا حق آجائیگا تو یہاں تو ہزاروں کروڑ پتی،ارب پتی ہونگے، جن کی ملکیتیں آپ کے نزدیک عین قرانی ہیں ـــــــ تو پھر آخر دین اسلام اور قران دنیا سے غربت و افلاس ختم کرنے کے لیے کیا فارمولا پیش کرتے ہیں؟؟؟؟؟؟ یا یہ صرف نمازیں روزے ہی ادا کروانے آیا تھا؟؟؟

نہ جانے کیوں ، آپ نے گویا یہ طے کر رکھا ھے کہ مال صرف ظلم اور استبداد سے ھی حاصل ھوتا ھے ۔ اور معاشرے میں جو بھی صاحب حیثیت ھوگا ۔ وہ لازماً ظالم ، اور غاصب ھوگا ـــــــ

آپ طاقت کے زور پر لوگوں سے ان کا مال چھیننا چاھتے ھیں ۔ لیکن آپ اپنے موقف کے حق میں ایک بھی قرآنی دلیل پیش نہیں کر سکے ھیں ۔ جب کہ میں نے تو متعدد آیات قرانی پیش کر کے یہ ثابت کیا ھے کہ قرآن لوگوں کا مال جائز طور پر کھانے کو جرم قرار دیتا ھے ـــــــ قرآن تو مسلمان کو دعا ھی یہ سکھاتا ھے ـــــــ

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (٢٠١) أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ـــ 2/202

اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا (201) ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکاتے کچھ دیر نہیں لگتی ـــ ترجمہ جناب مودودی صاحب

وہ تو کہتا ھے کہ جو دنیا کا اندھا ھے ـــ وہ آخرت کا بھی اندھا ھے ۔ وہ مفلسی کو عذاب الٰہی قرار دیتا ھے ـــ
میرے بھائی ـــــ اصل بات مال کا حصول نہیں ھے ۔ اس کے لیے تو اس نے واضح اعلان کر رکھا ھے ـــفرمایا

مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (١٨) وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا (١٩) كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ـــ 17/20

جو کوئی دنیا چاہتا ہے تو ہم اسے سردست دنیا میں سے جس قدر چاہتے ہیں دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ذلیل و خوار ہوکر رہے گا (18) اورجو آخرت چاہتا ہے اوراس کے لیے مناسب کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہو گی (19) ہم ہر فریق کو اپنی پروردگاری بخششوں سے مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں

مومن ھو یا کافر ـــ ھر کسی کو ان طبعی قوانین کے مطابق چلنے کا پھل ملے گا ۔ اصل بات تو اس پھل کے حصول کے بعد اس کی تقسیم ھے ۔ یہاں مومن اور کافر کا فرق سامنے آتا ھے ـــ

ایک طرف وہ رب ھے جو انسان کی محنت کا صلہ اسے لازماً دینے کا وعدہ کرتا ھے ۔ اور اس میں وہ مومن اور کافر کی تفریق بھی نہیں کرتا ۔ اور دوسری طرف آپ ھیں کہ اس انسان کی محنت کا سارا ما حاصل ، اللہ کے نام پر ، زبردستی ھتھیا لینا چاھتے ھیں ـــ ذرا غور فرمائیں

Mohammad Hanif محترم حنیف صاحب آپ نے ایک آیت مبارکہ پیش کی ہے "مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ" ۔ یعنی اللہ تمہیں بھوک اور خوف سے آزمائے گا (آپ کا ترجمہ)۔۔۔۔۔یعنی آپ کے بقول اللہ تعالیٰ انسانوں کو آزماتا ہے۔ اور یہ لازمی چیزیں ہیں جو انسانی زندگی کا حصہ ہونگی۔ کیا آپ مجھے اس آیت قرانی کا مفہوم واضح کر سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے جنتی معاشرہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی ایک خوبی یہ بھی بتائی ہے کہ "ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون"۔(اور انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ غم و حزن"۔۔۔۔۔ یہ کس معاشرہ کی بات کی جارہی ہے؟ ذرا اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

.....

کیا واقعی میں نے کہا ھے کہ اللہ انسان کو آزماتا ھے ۔ اگر کہا ھے تو برائے مہربانی ریفرنس پیش کریں ۔۔۔۔۔ شکریہ

جہاں تک جنتی معاشرے کی بات ھے تو وہ صرف اس وقت قائم ھوگا جب

۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ .....

ویسے ایک سوال ھے برادر ۔۔۔۔ جو آیت آپ پیش فرما رھے ھیں ۔ کیا یہ صورتحال چاروں خلافائے راشدین کے دور میں بھی موجود تھی ؟؟؟؟؟؟؟؟؟ اور اگر نہ تھی ، اور یقیناً نہ تھی ۔ ورنہ چار میں سے تین خلفاء لاکھوں صحابہ کی موجودگی میں اتنی بے بسی سے شہید نہ کر دیے جاتے ۔۔ بھلا وہ دور پھر کیا کہلائے گا ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

اور پھر آپ کس جنتی دور کی بات کر رھے ھیں ؟؟؟؟؟؟؟

Comment 174,168a,b,167a,b جنتی معاشرہ کا قیام اور لاخوف ولاحزن کی کیفیت: کب کیوں اور کیسے؟

یہاں کمنٹ نمبر 174 میں حنیف صاحب نے جنتی معاشرہ کی خصوصیت پر میرے ایک سوال پر سوال کیا ہے کہ کیا یہ صورتحال خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی موجود تھی؟ وہ اس قدر بے دردی سے کیسے شہید کر دئے گئے؟

قارئین حیرت کی بات ہے کہ میں بات کر رہا ہوں معیشت سے متعلق۔ کہ انسان کو اس جنتی معاشرہ میں کسی قسم کی معاشی پریشانی اور بھوک و افلاس کی فکر نہیں ستائے گی۔ سب کو بہترین رزق یکساں طور پر میسر ہوگا۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا (سورہ البقرہ۔آیت 35)

اور جیسا کہ قرآن کی مذکورہ آیت فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورہ البقرہ۔آیت 38) بتا رہی ہے کہ انہیں نہ بھوک سے مارے جانے کا کوئی خوف ہوگا نہ کسی طرح کی کوئی معاشی پریشانی یا مستقبل کی فکر کھائے گی کہ آج روٹی مل گئی ہے، پتا نہیں کل ملے گی یا نہیں، یا میں نہ رہا تو میرے بچوں کا کیا بنے گا؟ وغیرہ۔

لیکن حنیف صاحب کو سلام ہے جنہوں نے آیت کا رخ معیشت سے موڑ کر کیسے اپنے شہر کراچی کے حالات کی جانب کر دیا جہاں ہر شخص اس ''خوف وحزن'' میں مبتلا رہتا ہے کہ گھر سے نکلا ہوں، نہ جانے واپس بھی جا پاؤں گا یا نہیں۔ بھائی صاحب بات اس خوف وحزن کی نہیں ہو رہی، بلکہ معاشی فکر اور پریشانیوں سے نجات کی خوشخبری اس عظیم الشان آیت مبارکہ میں دی جا رہی ہے جسے آپ دوسری جانب لے گئے ہیں۔

جہاں تک خلفائے راشدین کی شہادت کا تعلق ہے تو میں نے پہلے بھی ایک واقعہ اسی باب میں حضرت عمرؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عمرؓ سکون سے درخت کی چھاؤں تلے سوتا تھا۔ کیونکہ عمرؓ نے اپنی عوام سے انصاف کیا تھا۔ عمر کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی لیے اسے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ اپنے لیے بلٹ پروف گاڑیاں اور سکیورٹی پروٹوکول ساتھ رکھتا۔ اگر انہیں شہید کیا گیا تھا تو یہ بیرونی سازشوں کی وجہ سے تھا اور ایسا اچانک کیا گیا۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ امیر المومنین کی زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہے۔ وہ تو اچانک ابولولو فیروز نے آگے بڑھ کر چھریوں کے وار شروع کر دئے تو لوگوں کو پتا چلا۔

باقی رہے خلیفہ سوم عثمانؓ تو ان کے متعلق بھی آپ کی غلط فہمی دور کرتا چلوں کہ انہیں یا ان کی رعایا کو بھی کسی قسم کا معاشی خوف یا پریشانی لاحق نہیں تھی۔ وہ تو اپنے قتل کے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بھی مدینہ الرسول چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ امیر

معاویہؓ نے لکھ بھیجا تھا کہ باغیوں سے آپ کی جان کو خطرہ ہے، آپ فی الفور مدینہ چھوڑ کر یہاں شام آ جائیں، لیکن حضرت عثمانؓ نے نبی کا شہر چھوڑنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اور وہیں پرسکون ہو کر بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ بلوائی سبائی ٹولہ نے انکے گھر گھس کر انہیں پرسکون انداز میں قرآن پڑھتے ہوئے شہید کر ڈالا۔

تو یہ معاشی معاملہ نہیں جو آپ نے ''ولا خوف علیھم ولا یحزنون'' کی آیت سے منسلک کرتے ہوئے مجھ سے سوال کر ڈالا ہے۔ بلکہ یہ مضبوط ہوتے ہوئے قرآنی نظام کو توڑنے کے لیے ایرانی و رومی سازشیں تھیں جو انہیں شہید کیا گیا۔ اور پھر کیا کوئی تاریخ کے جھروکوں سے یہ بات ثابت کر سکتا ہے کہ فاروق اعظمؓ یا عثمانؓ اپنی جان کے خطرہ سے بہت پریشان رہتے تھے، راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ اپنے ساتھ محافظوں کا دستہ رکھتے تھے؟؟؟ کہ انہیں ''خوف وحزن'' کی تصویر سمجھا جائے؟

آگے کمنٹ نمبر 168a, 168b میں پھر ''لوگوں کا مال ناجائز کھانے سے ممانعت'' والی آیت کا رونا روتے نظر آ رہے ہیں۔ (پیچھے ان کی جانب سے اس آیت سے لیے جانے والے ان کے غلط مفہوم کا مدلل رد پیش کر چکا ہوں، دوبارہ ملاحظہ فرما لیجیے)۔

محترم کی جانب سے تضاد بیانی کا ایک عدد مزید نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

سورہ البقرہ کی ایک آیت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

وِمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّار (سورہ البقرہ۔آیت 201)

حنیف صاحب کا ترجمہ: اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے، اور آخرت میں بھی بھلائی دے۔ لیکن اگلی آیت میں دنیا کی خواہش کرنے والے کو جہنم کے عذاب کی وعید بھی سنا رہے ہیں۔ (ایک آیت کے غلط ترجمہ کے ذریعے)۔ ملاحظہ فرمائیں:

مَّن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاء لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلاهَا مَذْمُوماً مَّدْحُورا (سورہ بنی اسرائیل۔آیت 18)

حنیف صاحب سے سوال ہے کہ یہاں کس لفظ کا ترجمہ آپ نے ''دنیا'' کیا ہے؟؟؟ کیونکہ یہاں تو لفظ ''العاجلہ'' درج ہے۔

آیت کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ: ''جو بھی مفادِ عاجلہ (یعنی قریبی مفاد) چاہتا ہے، وقتی طور پر روپیہ اپنے پاس رکھ کر وقتی طور پر خوشحال ہو جانا چاہتا ہے، دوسروں کو دے کر انسانی فلاحی نظام کے قیام کے ذریعے اپنی اگلی نسلوں کی خوشحالی اور دوسروں کو دے کر اپنی ذات کی نشو ونما کے لیے اپنے موت کے بعد کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صورت میں مفادِ اخروی نہیں چاہتا، اسے پھر ذخیرہ اندوزی کی صورت میں مفادِ عاجلہ ہی مل جاتا ہے۔ اس کے لیے پھر اسی زندگی میں ہی خوشحالی ہے، لیکن اخروی حیات میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

قارئین حنیف صاحب نے اس لفظ ''العاجلہ'' کا ترجمہ اس کے بہتر متبادل (مفادِ عاجلہ یا قریبی مفاد) کرنے کی بجائے روایتی طور پر ''دنیا'' کر دیا ہے۔ یعنی جو دنیا چاہتا ہے۔ یوں یہ بات حنیف صاحب کی جانب سے اس سے قبل پیش کردہ آیت کے نظریہ سے ہی ٹکرا جاتی ہے۔ کہ پیچھے دعا مانگ رہے ہیں کہ مجھے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں عطا فرما، مگر آگے دنیا کی بھلائیوں کو جہنم کا عذاب قرار دے رہے ہیں۔

آگے بڑھیے۔ کمنٹ نمبر 167 میں دعویٰ فرما رہے ہیں کہ دنیا سے غربت کا خاتمہ تو وہ پہلی اسلامی حکومت بھی نہ کر سکی جس کی قیادت وقت کا نبی کر رہا تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ قرآنی نظام کا آغاز کس خطہ سے ہوا تھا؟ مسلمانوں نے مدینہ کے ایک چھوٹے سے علاقے میں اللہ کے نظام کی بنیاد رکھی جسے پھر خلافتِ راشدہ نے اپنے عروج پر پہنچایا۔

اب سورہ البقرہ کی آیت 155 جس کا حنیف صاحب نے ایک غلط ترجمہ پیش کیا ہے، اسکا درست مفہوم اصلاح کی غرض سے پیش خدمت ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفُ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمَوَالِ وَالأنفسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْ (سورہ البقرہ۔آیت 155)

درست مفہوم: دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا انسانی فلاحی معاشی نظام ربوبیت قائم کرنے کی اس کٹھن اور مشکل جدوجہد کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (یہ نظام قائم کرنا تو ایک بہت دشوار گزار اور بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے۔ سورہ البلد)۔ اس راہ میں تمہیں کڑے امتحانات سے گزرنا ہوگا۔ کیونکہ ٹکراؤ اور کشمکش کے بغیر تو انسان اپنی صلاحیتوں کا درست اندازہ کر ہی نہیں سکتا۔

یعنی اس دوران کہیں تمہیں جنگ وجدل کا سامنا ہوگا، قتال سے واسطہ پڑے گا، کہیں دیگر خطرات سامنے آئیں گے۔ کہیں سامانِ خوردونوش کی کمی واقع ہو جائیگی تو کہیں جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور ممکن ہے تمہاری املاک کو بھی کہیں نقصان پہنچے، تمہارے کھیت کھلیان اور باغات اجڑیں۔ لیکن یاد رکھو۔ ان سب مصائب سے گزرنے کے بعد جب قرآن کا یہ عظیم نظام قائم ہوگا تو اس سے ان لوگوں کو کامیابی کی بشارت ہے جو ہر حال میں، ہر مشکل میں ثابت قدم رہے اور اس نصب العین سے پسپائی اختیار نہیں کی۔

اللہ کا نظام تو ایسا ہے کہ جس کے قائم کرنے کی راہ میں دوران سفر ان لوگوں پر مصائب ومشکلات آتی ہیں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں۔ ہم نے تو خود کو اللہ تعالیٰ کا نظام قائم کرنے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ (انا للہ: ہم تو ہیں ہی اللہ بندے) پس ہمارا ہر ایک قدم اسی عظیم نصب العین کی جانب اٹھتا چلا جائیگا (وانا الیہ راجعون)۔ ہم رک نہیں سکتے۔ پسپا نہیں ہو سکتے۔ ہم کشتیاں جلا کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ پس اب جیت ہمارا مقدر ہوگی۔

اب اس سے اگلی آیت مبارکہ جو حنیف صاحب نے پیش نہیں کی، میں کیے دیتا ہوں۔ کیونکہ یہ ان ثابت قدم مومنین کی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے اور دین کے بالآخر انکی کوششوں سے قائم ہو جانے کی بشارت بھی دے رہی ہے۔

أُولَـٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (سورہ البقرہ۔ آیت 157)

یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے رب کے نزدیک ہزارہا تعریف وتحسین کی مستحق ہے۔ اور ان کے لیے سامانِ نشو ونما اور رزق کی فراوانیاں (رحمۃ) اور اللہ کا بے اندازہ کرم ہیں۔ اور ان کا اپنی منزل مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ (ھم المھتدون)۔

یہ تینوں آیات قرآنی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے کے دور سے متعلق ہیں جنہیں حنیف صاحب غلطی سے قرآنی نظام کے قیام کے بعد کے حالات پر محمول کر رہے ہیں جو کہ ایک غلط طرزِ عمل ہے کیونکہ قرآنی نظام کے قیام کے بعد کا احوال تو اللہ تعالیٰ ''لا خوف علیھم ولاھم یحزنون'' سے خوب واضح کر چکا ہے۔ جس کے بعد کسی بھی شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

جدید سرمایہ داریت کا بانی ایڈم سمتھ (سکاٹ لینڈ) وہمنوا، مولانا مودودی اور حنیف صاحب: ایک ہی سکہ کے ''تین رخ''

''دین جہاں بھی ہوگا، سرمایہ دار طبقہ (مترفین) اس کی مخالفت کرے گا (اور جسکی مخالفت اس طبقہ کی جانب سے نظر نہ آئے، سمجھو وہ دین ہی نہیں)'' (سورہ سباء۔ آیت 34)

ملکیتِ زمین کے متعلق حنیف صاحب اور مودودی صاحب کا مشترکہ موقف

(i) مودودی صاحب کا موقف: ''آجکل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک فقرہ یوں نکالا ہے کہ ''الارض للہ''۔اوراس پر قیاسات کا پورا ایک کریملن تعمیر کرڈالا ہے'' (مسئلہ ملکیتِ زمین ازمولانا مودودی)

(ii) حنیف صاحب کا موقف:

قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ھے کہ ساری کائنات ، اللہ کی ھے ـــ
لیکن ھمارے یہ دوست باقی سب کو چھوڑ کر صرف زمین پر کھڑے ھو گئے ـــ
کیونکہ یہ سوشلزم کا نعرہ ھے ـــ

اسی طرح ایڈم سمتھ کے ایک پیش رو (Mandevillee) نے بھی ایک نظریہ پیش کیا تھا کہ:

''غریبوں سے کام لینے کی کی ایک ہی شکل ہے کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انکی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا ہی پورا کیا جائے۔انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کردینا بہت بڑی حماقت ہے۔سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور مفلس رہے'' (Fable of the Bees by Mandevillee)۔

حنیف صاحب اس ظالمانہ نظریہ معیشت کی پوری پوری حمایت کچھ یوں کرتے نظر آرہے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

Mohammad Hanif .

ـــ
"چند لمحوں کے لیے مان لیتا ھوں ـ کہ سب برابر ھونے چاھیے ـ
چلیں ـ اس طرح فرض کریں ، سب کے سب کروڑ پتی ھوں گے ـ یا لکھ
پتی ھوں گے ـ یا کنگلے ھوں گے ـــــ یعنی سب ایک جیسی
پوزیشن کے حامل ھوں گے ـ

اب بتائیں ، کوئی میرے مکان کی تعمیر کے لیے ، گیارھویں منزل تک اینٹیں
کیوں ڈھوئے گا ؟؟
کوئی ، 50 ڈگری سینٹی گریڈ کی گرمی میں ، میرے گھر کے گیٹ اور
گرلیں کیوں ویلڈ کرے گا ؟؟؟
میرے شیو کیوں بنائے گا ؟؟
میرے بال کیوں کاٹے گا ؟؟
بس اتنا ھی سمجھا دیں ـ نظام کیسے چلے گا ؟؟
ـــ تاکہ میں بھی آپ کی بات سمجھ سکوں ـــ
بہت شکریہ ـ سلامت رھیں"۔

مولانا مودودی اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں اپنے تصوراتِ معیشت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطہ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصولوں پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجاویز کو پہلے قدم پر ہی لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ، اصول یا نصب العین کی حیثیت موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھیننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہ ہیں دیتا جن کے ذریعہ کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔ اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو جن ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں۔ انہیں ہاتھوں میں اگر سوداگری، کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمین پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو۔ مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے، نہ کہ اسلامی۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے، نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لیے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔'' (مسئلہ ملکیتِ زمین از مولانا مودودی۔ صفحہ 71)

اسلامی ریاست میں اسلامی حکمرانوں کا کردار مودودی صاحب کی سمجھ میں ساری عمر نہ آسکا۔ اور حنیف صاحب بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

Mohammad Hanif

آپ بس ایک بات کہے چلے جا رھے ھیں کہ جی زمین کسی کی ملکیت نہیں ھو سکتی ــ کیوں کہ وہ اللہ کی ملکیت ھے ــ

جب میں یہ سوال کرتا ھوں کہ کائنات کی وہ کون سے شئے ھے جو اللہ کی ملکیت نہیں ھے ــ تو تان صرف زمین پر ھی کیوں ٹوٹتی ھے ؟؟؟ تو جواب ندارد ــ

اب آپ ایک نئی بات لے آئے ھیں اسٹیٹ ــ

چلیے یہ بتا دیں کہ یہ کس بلا کا نام ھے ــ

کہاں سے آئے گی یہ اسٹیٹ ؟؟

کون بنائے گا یہ اسٹیٹ ؟؟؟

کون چلائے گا یہ اسٹیٹ ؟؟؟

کہیں خدا نہ خواستہ ، ھم ھی میں سے ایک گروہ تو نہیں ھوگا یہ اسٹیٹ ؟؟؟

اور اگر ھم ھی میں سے کچھ لوگ ھوں گے یہ اسٹیٹ ــ تو پھر وہ ھی بات ھوگی ــ لیبل روح افزاء کا اور اندر وھی شراب

جب اسٹیٹ کے تملک میں چلے جائے گی یہ ساری زمین ، لوگوں کی دولت تو پھر ھوا کیا ــ

یہ ھی نہ کہ ، مجھ اکیلے سے چھین کر ، ایک گروہ نے لے لی ــ

کیوں کہ اس نے اپنا نام اسٹیٹ رکھ دیا ھے ــ

اسلامی حکومت سے متعلق اس موقف میں نہ مودودی صاحب کوئی آیاتِ قرآنی پیش کر سکے، نہ حنیف صاحب۔ شاید اس لیے کہ خود حنیف صاحب فرما گئے ہیں کہ:

Mohammad Hanif

اسے کہتے ھیں تقلید ــــــ مکھی پر مکھی بٹھانا ــــــ کیونکہ عربی تو سیکھنی نہیں ــــــ بس کسی سابق محترم اکابرین نے جو کہہ دیا اس ھی کو دوھرائے چلے جانا ــــــ اس سوچ کے بغیر کے ممکن ھے ھمارے بڑے سے غلطی ھوئی ھو ــــــ

ایڈم سمتھ دنیا کا وہ پہلا شخص تھا جس نے ایک نئی اور پراسرار اصطلاح ''سیاسی معاشیات'' متعارف کروائی تھی۔یعنی معاشیات اور عالمی معاشی پالیسیوں کا دائرہ کار ہمیشہ طاقتور اقوام عالم کی سیاست کا مرہون منت ہے۔قرآنی اصطلاح ''انفاق'' کا یہودی مفہوم (Profit Oriented Investment) اخذ کرنے میں بھی حنیف صاحب سکاٹ لینڈ کے شہرہ آفاق ماہر معاشیات اور جدید سرمایہ داری نظام کے بانی ایڈم سمتھ کے نظریہ کو مشرف با اسلام کرتے نظر آتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

(i) ایڈم سمتھ کا موقف: ''جو قوم ایسی اشیاء تیار کرے جس سے دوسرے لوگوں کی ضروریات بڑھتی جائیں، اسکے پاس ان لوگوں کی دولت خود بخود کھنچی چلی آئے گی'' (دی ویلتھ آف نیشنز۔جلد چہارم۔باب دوم)

(ii) حنیف صاحب کا موقف:

Mohammad Hanif جن کے پاس مال کی فراوانی ھے وہ اپنا مال ایسے منصوبوں میں لگاتے چلے جائیں جس سے افرادی قوت کی مانگ بڑھتی چلی جائے ــ

وہ چاھتا ھے کہ معاشرے میں لوگوں کے روزگار کا بندوبست کرو ــ ایسا کچھ کرو کہ لوگ اپنے زور بازو سے اپنی روٹی کمائیں ــ اس کے لیے لازم ھے کہ معاشرے میں کاروبار کی بہتات ھو ــ رزق کمانے کے مواقع اتنی وافر مقدار میں دستیاب ھوں کہ کوئی کسی کا استحصال نہ کر سکے ــ

Mohammad Hanif

تو اپنے دور کے کسی نظریے سے متاثر ھو جانا ، یہ کوئی ، غیر فطری بات تو نہیں ــ

چنانچہ ، ھمارے بڑوں میں سے بھی کچھ اس نظریے سے متاثر ھو گئے ۔

اب فیصلہ قارئین خود کرلیں کہ حنیف صاحب کس سے متاثر ہیں۔الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

بلاتحدید ملکیت کے نظریہ پر ان تینوں کے تصورات:

مودودی صاحب کا موقف: ''مکانات، سواری، غرض کسی بھی چیز کے بارے میں قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں'' (مسئلہ ملکیتِ زمین از مولانا مودودی۔صفحہ 53)

سرمایہ داریت کے جدید ''مفکر'' ایڈم سمتھ اور اسکے ہمنواؤں (مالتھوس، ریکارڈو، بینتھم وغیرہ) کا موقف: ''کسی بھی فرد کی ذاتی ملکیت پر کوئی پابندی یا حد بندی درست نہیں۔ معاشی نظام خالصتاً مادہ پرست ہوتا ہے اور اس کے سامنے کسی قسم کا کوئی اخلاقی تصور نہیں ہوتا۔ غریبوں کی مدد بالکل بھی نہیں کرنی چاہیے، اگر انکی مدد کی جائے تو وہ آرام پسند ہو جائیں گے۔ اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو پرائیویٹ اداروں پر بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ غریبوں کو انکی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنا رزق خود تلاش کرتے پھریں۔ اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ جب بھوکے مریں گے تو خود محنت کی جانب آئیں گے۔ (ملخص ''دی ویلتھ آف نیشنز'' باب سوم، مانڈولے: فیبل آف دی بیز)

کیونکہ:

''بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہوتا ہے جو وحشی سے وحشی جانور کو بھی رام کر لیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لیے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ اور وہ ہے بھوک۔ بھوک ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں''۔

(Dessertation on the poor laws: By william Townsend.1885)

یہی وہ ترغیبات تھیں جن کی بناء پر اٹھارویں صدی میں صنعتکاروں نے مزدوروں کا خون چوسنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں لاکھوں مزدور سراپا احتجاج بن گئے اور اس کشمکش اور ظلم نے کارل مارکس، ہیگل اور اینجلز وغیرہ جیسے مصلحین کو جنم دیا جنکے دلوں میں سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکی اور پھر اشتراکیت کی بنیاد رکھی گئی۔

بہر حال مقصود یہ بتانا تھا کہ مذہبی پیشوائیت ہو، سرمایہ داریت ہو یا پھر ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے ہمنوا، یہ سب ہمیشہ ایک ہی تھالی کے بینگن رہے ہیں اور ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتے آئے ہیں۔ پس ان لوگوں کی اصلیت کا فیصلہ کرنے کے لیے نکتہ وہی ہے جو قرآن نے بتا دیا ہے یعنی ''دین جہاں بھی ہوگا، مترفین مفت خورے (سرمایہ دار و مذہبی پیشوائیت) اس کی مخالفت کریں گے۔ اور جسکی وہ حمایت کریں، سمجھو وہ دین ہی نہیں (مفہوم: سورہ سباء۔ آیت 34)

''ملکت ایمانھم'' اور حنیف صاحب کی قرآن میں معنوی تحریف

سورہ النحل کی ایک آیت کے بارے میں حنیف صاحب کا موقف ملاحظہ فرمائیں:

Mohammad Hanif مزید یہ کہ سورہ النحل کی جس آیت پر آپ نے بات کی ھے ــ میں اس سے نہیں سمجھ پایا کہ آپ کس پر اعتراض فرما رھے ھیں ـــــ کیا آپ کے خیال میں " ما ملکت ایمانھم " جو اس آیت مبارکہ میں کہا جا رھا ھے ، سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں نہیں جو دور نبوی ص ع میں موجود تھے ـــــ اگر آپ ایسا سمجھتے ھیں ـــــ تو ھم اس پر بھی بات کر لیتے ھیں ـــــ

مقصد صرف سچائی تک پہنچنا ھے ـــــ نہ جیت نہ ھار ـــــ نہ طنز نہ دشنام ـــــ

البتہ میں اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ھوں کہ کسب معاش کی صلاحیتں مختلف انسانوں میں مختلف ھوتی ھیں ـــــ

سورہ زخرف کی آیت مبارکہ 32 اس حوالے سے بلکل واضح ھے ــ یہ ھی تو بنیادی آیت ھے جس کی بنیاد پر میں نے اس موقف کو سمجھا کہ اگر خدا کا منشاء سب انسانوں کی معاشی برابری ھوتا ، تو وہ یہ تفرقہ رکھتا ھی کیوں ـــــ

جہاں تک لفظ " یجحدون " کی ھے ـــــ تو اس کے بنیادی معنی ، ایسی شئے سے انکار ھے ، جسے کوئی دل میں درست مانے ـــــ میری نظر میں اس بات کا مفہوم بے وجہ بحث و تکرار ھے ـــــ
جبکہ منکر کے معنی ، اس شئے کا انکار ھے جسے دل ھی نہ مانے ــ اس کی ضد " فرح " ھے ـــــ

چنانچہ آیت مبارکہ 16/71 میں یجحدون سے مراد ، ایسی سچائی پر بحث و تکرار ھے جسے ان کا اپنا دل اندر سے درست مانتا تھا ـــــ

Mohammad Hanif وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ يُرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ــ 16/71
جہاں کہا جا رھا ھے کہ جن لوگوں کو اللہ نے دوسروں پر رزق میں فضیلت دی تھی ، ان لوگوں نے اپنے عہد کے ان لوگوں کو جو ان کی ملکیت تھے ، اپنے اس رزق میں شریک نہیں کیا -

Mohammad Hanif میں نے مفہوم بیان کیا تھا
ــ آیت مبارکہ ــ ما ملکت ایمانھم کے الفاظ کے ساتھ اسے ، اس مخصوص دور سے مشروط کر رھی ھے ـــــ

Mohammad Hanif

اسے کہتے ھیں تقلید ـــــ مکھی پر مکھی بٹھانا ـــــ کیونکہ عربی تو سیکھنی نہیں ـــــ بس کسی سابق محترم اکابرین نے جو کہہ دیا اس ھی کو دوھرائے چلے جانا ـــــ اس سوچ کے بغیر کے ممکن ھے ھمارے بڑے سے غلطی ھوئی ھو ـــــ

اب اس آیت مبارکہ 16/71 ھی کو لے لیں ـــــ بھائی ـــــ کس لفظ کا معنی ملازمین لے رھے ھو ـــــ ذرا غور تو کر لو ـــــ یہ ساری آیت تو فعل ماضی کی ھے ـــــ اس دور کی ھے جب معاشرے میں غلام اور لونڈی ھوا کرتے تھے ـــــ کیا کہہ رھا ھے قرآن ؟؟؟؟؟؟؟؟؟ خدا کا خوف کرو بھائی ـــــ اپنے کسی خودساختہ عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے اس طرح قرآن کی توھین نہ کرو ـــــ دیکھیں کیا کہہ رھا ھے قرآن ـــ فرمایا ـــ

وَاللَّـهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّـهِ يَجْحَدُونَ ـــ 16/71

غور فرمائیں ـــ لفظ " فضل " پر ـــــ جب عربی کے کسی لفظ پر صرف زبر ھوں ، تو وہ فعل ماضی کہلاتا ھے ـــ اس کا معنی ھوتا ھے ـــ تھا ـــ مثلاً ـــ ایک لفظ ھے " ضرب " اب اگر اس کے تینوں حروف پر زبر ھو ـــ تو اس کے معنی چوٹ ماری ھوگا ـــــ چوٹ مارنا نہیں ـــــ پھر اس آیت مبارکہ میں لفظ " ما ملکت ایمانھم " استعمال ھوا ھے ـــ یہ فعل ماضی ھے ـــ آج کون ھے جسے آپ ما ملکت ـ کہیں گے ؟؟؟؟ کیا آپ بھی اس دور میں لونڈی اور غلام کے قائل ھیں ؟؟؟؟؟

جن معنوں میں آپ ماتحت یا ملازمین لے رھے ھیں ـ قرآن انہیں ـ ـــــ " عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ " کہتا ھے ـــــ 24/32

Comments:29,44,52,53a,53b,

فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''ما ملکت ایمانکم'' سے مراد ماتحت ملازمین لینا درست نہیں، بلکہ یہ آیت صیغہ ماضی میں ہے اور اس سے مراد صرف دورِ رسالت سے قبل کے غلام اور لونڈیاں ہیں جنہیں بعد میں غلامی کے خاتمہ پر اسلامی معاشرہ کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ Comment no:53a میں حنیف صاحب نے آیت کا ترجمہ لکھتے وقت عربی کے صیغہ متکلم (فضل بعضکم) کا ترجمہ ''ھم'' کر دیا ہے۔ نہ جانے انہوں نے ایسا دانستہ طور پر کیا یا انجانے میں، مگر آیت میں ایک بہت بڑی تحریف کے مرتکب ہو گئے۔ یعنی ''بعضکم'' کے لفظ سے اللہ صیغہ متکلم میں بات کر رہا ہے، یعنی مخاطب میں۔ مگر حنیف صاحب اسے متکلم سے بدل کر صیغہ غائب کے معنی میں پیش فرما رہے ہیں۔

یہ عربی گرامر کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آیت کا مفہوم غلط کرنے والی بات ہے۔ کیونکہ ''بعضکم'' کے (کم) کی موجودگی میں ''فضّل'' کا ترجمہ فعل ماضی میں ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھئے یہ کچھ یوں بن جاتا ہے:

''اللہ نے تم لوگوں میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی تھی''۔ (غلط ترجمہ)

درست مطلب آیت کا یہی ہوگا کہ اللہ نے تم میں سے بعض لوگوں کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں ہر جگہ ماضی کے جملہ کو فعل ماضی میں استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ سیاق وسباق اور عربی گرامر کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض الفاظ جو ماضی کے لیے استعمال ہوتے ہیں، وہی حال کے لیے بھی مستعمل ہیں۔

اسکے بعد حنیف صاحب نے ''اپنے عہد کے لوگوں کو'' خود اپنے پاس سے ہی جوڑ کر آیت کا حصہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ ایسا کوئی لفظ آیت میں موجود ہی نہیں۔ دراصل حنیف صاحب یونی کوڈ اردو ویب سائٹ پر موجود مختلف ملاؤں (مودودی، احمد علی، اشرف تھانوی، حنیف جالندھری وغیرہ) کے تراجم قرآن اٹھاتے ہیں اور ویسے ہی فیس بک پر پیسٹ کر دیتے ہیں۔ خود ترجمہ اور آیت کی مطابقت چیک کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ اب روایتی تراجم سارے ہی غلط اور خلاف قرآن ہیں، لیکن حنیف صاحب کو شاید اس بات کا شعور نہیں اور یہ ہر جگہ انہی روایتی ملاؤں کے تراجم استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح حنیف صاحب نے ''ملکت ایمانھم'' کو بھی فعل ماضی میں گھسیڑ دیا ہے۔ اس فعل ماضی کے مطابق اگر اس لفظ (ملکت) کا ترجمہ کریں تو پھر معاذ اللہ صحابہ کرامؓ کا عمل ہی خلافِ قرآن قرار پاتا ہے کہ انہوں نے غلام لونڈیاں رکھی ہوئی

تھیں۔یعنی جہاں اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ما ملکت ایمانکم کو آزاد کردو تو اس سے مراد کیا یہ لی جائے کہ غلام لونڈیاں انکی ملکیت میں بدستور رہتے جنہیں آزاد کرنے کا اللہ نے حکم دیا۔۔۔؟؟؟

حنیف صاحب نے صرف اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے آیاتِ قرآنی میں اس قدر توڑ مروڑ سے کام لیا ہے جو قابل مذمت ہے۔

اب اس لفظ ''ما ملکت ایمانکم'' کے درست پس منظر اور مفہوم پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

ما ملکت ایمانکم

لفظ ما ملکت ایمانکم کے لغوی معانی ہیں ''تمہارے دائیں ہاتھ جن کے مالک ہوئے''، یعنی وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں۔تابع ہدایات ہوں۔باب اول کی ایک صراحت کو ذہن میں لائیں۔محنت دو طرح کی ہوتی ہے۔جسمانی اور فکری محنت۔جسمانی محنت کو فکری محنت کی ہدایات کے تابع کام کرنا ہوتا ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں۔قرآن میں یہ مرکب اصطلاح متعدد معانی میں استعمال ہوئی ہے مثلاً:

(i) ماتحت ملازمین کے لیے: ایسے لوگوں کے لیے جو کسی کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں، یعنی کسی سکیم کو بروئے کار لانے کے لیے سربراہ کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔گھریلو ملازمین، نوکر چاکر وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔

وَاعْبُدُواْ اللّهَ وَلاَ تُشْرِكُواْ بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ و مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً (سورہ النساء۔آیت 36)

وَاللّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُواْ بِرَآدِّي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاء أَفَبِنِعْمَةِ اللّهِ يَجْحَدُونَ (سورہ النحل۔آیت 71)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ مِن قَبْلِ صَلاَةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلاَةِ الْعِشَاء ثَلاَثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلاَ عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوَّافُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمُ الآيَاتِ وَاللّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (سورہ النور۔آیت 58)

ضَرَبَ لَكُم مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ هَل لَّكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنفُسَكُمْ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (سورہ الروم۔آیت 28)

(ii) منکوحہ عورتوں کے لیے: یعنی ایسی عورتیں جو نکاح میں آ چکی ہیں إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (سورہ احزاب۔آیت 52)۔سورہ النساء میں محرم عورتوں کی فہرست گنوانے کے بعد حکم آیا ہے کہ:

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم (سورہ النساء۔آیت 24)

تو اس میں اگر محصنات کے معنی پاکدامن عورتیں لیے جائیں تو اسکا مطلب ہوگا کہ تم پر تمام پاکدامن عورتیں حرام ہیں سوائے انکے جو تمہارے نکاح میں آ جائیں۔اور اگر محصنات کے معنی خاوند والیاں ہوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ تم پر تمام شادی شدہ عورتیں حرام ہیں سوائے ان لونڈیوں کے جو اس سے قبل تمہارے ہاں آ چکی ہوں، اگر چہ انکے شوہر پہلے سے کہیں موجود ہوں۔

لیکن سورہ ممتحنہ میں ہے کہ اگر کفار مکہ کی مومن عورتیں تمہارے پاس آ جائیں تو انہیں کفار کو واپس مت کرو۔صرف انکا خرچ کردہ مال انہیں دے دو، اور ان سے نکاح کر لو۔(سورہ الممتحنہ۔آیت 10)۔بس یہی وہ واحد قسم ہے ان شوہر دار عورتوں کی جن سے انکے خاوند ہوتے ہوئے بھی نکاح کی اجازت دی گئی تھی۔یہی وجہ ہے کہ سورہ النساء کی درج بالا آیت کی رو سے ملکت ایمانھم سے مراد یہ عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن سے اس طرح نکاح کیا گیا کہ وہ اپنے کافر شوہروں سے جان چھڑوا کر مسلمانوں کے پاس آئی ہوں۔

(iii) لونڈیوں کے معنی میں: یہی لفظ لونڈیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے:

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ (سورہ المومنون۔آیت 6)

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ (سورہ المعارج۔آیت 30)

فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ (سورہ احزاب۔آیت 50)

لونڈیوں کے معاملہ میں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل خطہِ عرب میں غلام لونڈیوں کا رواج تھا۔لیکن جب ان میں سے اکثر لوگ مسلمان ہوئے تو انکے گھروں میں لونڈیاں تو اسی طرح موجود رہیں، کیونکہ معاشرہ کا رواج تھا۔اگر ان لونڈیوں کو فوری طور پر گھروں سے نکال دیا جاتا تو معاشرہ میں بہت سی اخلاقی برائیاں جنم لیتیں۔اسی لیے

انہیں اسی طرح مسلمانوں کے گھروں میں رہنے دیا گیا۔یہی وہ پہلے سے موجود لونڈیاں ہیں جن کے لیے قرآن نے ماملکت ایمانھم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

یہ غلام لونڈیاں جنگی قیدی ہوتے تھے۔سورہ محمد میں انکے متعلق واضح طور پر حکم موجود ہے کہ انہیں بطور فدیہ یا بطور احسان رہا کردیا جائے۔اس حکم کے بعد جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج بالکل ختم ہوگیا تھا۔

المختصر قرآن میں جہاں جہاں ملکت ایمانھم کے الفاظ لونڈیوں کے لیے آئے ہیں،وہ انہی لونڈیوں کے لیے ہیں جو ظہورِ اسلام اور پھر نزول قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے،اور انہیں آہستہ آہستہ جزوِ معاشرہ بنا دیا گیا،اور آگے سے پھر غلام لونڈی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔جو لوگ اب بھی ملکت ایمانھم سے غلام لونڈی رکھنے کا جواز پیش کرتے ہیں،وہ قرآن کے ایک واضح حکم میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔

قرآن میں ملکت ایمانھم کے متعلق ہدایات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی بھی دور میں کوئی ایسی قوم اسلام میں داخل ہوتی ہے جن کے ہاں غلام لونڈیوں کا رواج ہو تو یہ احکامات ان کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔

''ایمانھم'' صیغہ جمع ہے،جس کا واحد ''یمین'' ہے۔کچھ وضاحت اس لفظ سے متعلق بھی پیش خدمت ہے:

یمین کے معنی ہیں قوت،طاقت،قسم۔لغت تاج اور محیط میں لکھا ہے کہ عرب کے ہاں جب اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر رکھ کر قسم کھائی جاتی تھی تو اسے بھی یمین کہا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بھی نکاح کے متعلق ایک آیت یوں بیان ہوئی ہے:

عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ (سورہ النساء۔آیت 4)

یعنی تمہارے عہدو پیماں بندھے اور مستحکم ہوئے۔

یعنی بات یوں ہوئی کہ قرآن کریم میں یہ لفظ صرف غلام لونڈیوں کے لیے استعمال نہیں ہوا،بلکہ سیاق وسباق کے حوالہ سے اس کے متعدد مفاہیم کتاب اللہ نے لیے ہیں۔

Mohammad Hanif .

برادر پاور صاحب کو ضرور سمجھا دیں کہ ـــــ ایسے واقعات نہ کوٹ کیا کریں ـــ جن کی کوئی سند نہیں ـــــ اگر ایسے واقعات ماننے ہیں ۔ تو پھر بے چارے امام بخاری علہ رحمہ پر ، بڑے بڑے ایٹم بم کیوں برسائے جاتے ہیں ـــــــ

Comment (بغیر سند واقعات پیش نہ کیے جائیں، ورنہ بخاری پر ایٹم بم کیوں برسائے جاتے ہیں؟

حنیف صاحب کا مسلک ہے کہ کوئی چاہے کتنا ہی دشمنِ اسلام کیوں نہ ہو، اس سے حسنِ ظن رکھا جائے۔ یہ عقیدہ ایسا ہی ہے جیسے مسیحی حضرت عیسیٰ سے یہ غیر منطقی قول منسوب کرتے ہیں کہ ''اگر کوئی تمہارے ایک گال پہ تھپڑ مارے تو دوسرا گال اس کے آگے کر دو''۔ جناب ایسے کام نہیں چلتا۔ غلط بات کو غلط کہنا چاہیے اور اچھائی کی تعریف کے ساتھ ساتھ برائی پہ تنقید بھی کرنی چاہیے۔ کسی دین، فلسفہ نے اس کام سے منع نہیں کیا۔ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' اسے ہی کہتے ہیں کہ آپ کسی کے غلط کام کو غلط کہیں۔

مگر حنیف صاحب کا مسلک سب سے جداگانہ ہوتا ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ بخاری پر تنقید نہ کی جائے، بلکہ بزرگ ہونے کے ناطے ان سے حسنِ ظن رکھا جائے۔ ان محدثین کی کتب میں جو کچھ بھی خلافِ قرآن موجود ہے، وہ انکا لکھا ہوا نہیں، بلکہ انکی کتب میں بعد والوں نے شامل کر دیا ہے (یہ الگ بات ہے کہ آج تک کوئی اس امر کے ثبوت پیش نہیں کر سکا کہ بخاری کے مرنے کے بعد یہ کام کب اور کیسے ہوا، کس نے تحریف کی اور کون کونسی روایات بعد والے دشمنانِ اسلام نے شامل کیں)۔ یہ صرف ایک حسین تخیل ہے جو حنیف صاحب اور انکی فکر کے لوگوں کے ذہنوں میں جگہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کا کوئی ٹھوس ثبوت یہ آج تک نہیں دے سکے۔ نہ دے سکتے ہیں۔

بخاری مسلم اور دیگر کتبِ روایات پہ تنقید صرف اور صرف ان میں موجود خلافِ قرآن مواد اور رسول اللہ سمیت صحابہ و ازواج مطہراتؓ اور قرآن کریم کی بے حرمتی اور توہین پر مبنی روایات کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ تمام مواد انہی محدثین کے ناموں سے ہم تک پہنچا ہے۔ اگر یہ تحریف بعد میں کی گئی ہوتی تو اس کا صرف خیال ظاہر کرتے رہنے کی بجائے آپ لوگ اس بات کے ثبوت ہمیں فراہم کر چکے ہوتے۔

البتہ ہم اسکے ثبوت میں کئی شواہد پیش کر چکے ہیں۔ خود بڑے بڑے ایرانی شیعی دانشور بھی آج اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کے معاشی نظام کو روکنے اور سلطنتِ فارس کی شکست کا انتقام لینے کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے قرآن سے انتقام لیا۔ یہ انتقام کیسا تھا؟ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ آج ہر باشعور انسان جو احادیث کی حالتِ زار دیکھتا ہے، سمجھ جاتا ہے۔ تمام اکابر محدثین کا ایرانی النسل ہونا اور روایات میں جگہ جگہ نفوسِ مقدسہ کے خلاف سری و اعلانیہ بغض کا مظاہرہ، انکی (خصوصاً حضرت عائشہؓ) کی توہین، رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے کے باوجود روایات کی تدوین، اور دیگر

حالات وواقعات اس ایرانی سازش پر گواہ ہیں۔

ہزاروں سال پہ محیط سلطنتِ فارس کے عرب قوم کے ہاتھوں زوال پر ایرانی غم وغصہ کی آگ میں جل بھن رہے تھے۔انکا خون کھول رہا تھا کہ کب انہیں اسلام سے شکست کا بدلہ لینے کا موقع ملے اور وہ وار کریں۔اسلام نے ایران کی وسیع سلطنت کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا تھا۔ملک فتح ہو چکا تھا،اس سپر پاور کی ساری دولت فاتحین اٹھا کر لے گئے اور مدینہ میں خلافت کے قدموں میں ڈھیر کر دی گئی۔ایران کا شہنشاہ یزدگر دفرار ہو چکا تھا اور اپنی جان بچانے کے لیے ایک پن چکی میں چھپا بیٹھا تھا جہاں ایک کسان نے اسے ڈاکو سمجھ کر مار ڈالا۔

اسکے قتل سے پہلے ایران کے چند اہل اساورہ (سونے کے کنگن پہننے والے درباری) اسے ملنے گئے اور پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟ شہنشاہ نے جواب دیا کہ میں حیران ہوں کہ ان بھوکے ننگے عربوں نے ہم پر فتح کیسے پالی؟ تم لوگ جاؤ اور انکے شہروں میں رہائش اختیار کرو۔ان کے ساتھ گھل مل کر رہو اور دیکھو کہ یہ لوگ اپنی زندگی کیسے گزارتے ہیں؟ انکے اسلام کا بغور مطالعہ کرو۔انہیں باور کرواؤ کہ وہ ایمان لانا چاہتے ہیں،لیکن پہلے اسلام کا مطالعہ کریں گے۔وہاں رہ کر ہماری شکست کی وجوہات تلاش کرو۔اور پھر اس کا توڑ کرو۔ان سے بدلہ لو۔

ایران کے حجت اللہ موسوی نے اپنی کتاب ''میزان الفارس'' میں انکشاف کیا ہے:

''ساسانی بادشاہت کے بیس فدائین جنگِ قادسیہ اور مدائن کی جنگ کے دوران موجود تھے۔ان میں سے پندرہ لوگ زندہ بچے۔ان لوگوں نے سمرقند، بخارا میں خاقانِ چین کی پناہ میں جمع ہو کر کچھ منصوبہ بندی کی جو یوں تھی:

(1) مفتوحہ ایرانی سلطنت کے ہزاروں باشندے عرب ریاست کے اہم شہروں مدینہ، مکہ، بصرہ، بغداد اور دمشق وصنعا وغیرہ میں رہائش اختیار کریں۔وہاں وہ مقامی امراء کی خدمت میں حاضر ہوں اور اسلام لے آئیں۔(یمنی یہودی عبداللہ بن سبا اور ایرانی گورنر ہرمزان سرِفہرست نام ہیں)۔

(2) انہیں اسلامی ریاست کی جاسوسی کا مشن دیا جائے اور یہ وہاں کے حالات سے فدائین کی ہماری کمیٹی کو آگاہ کرتے رہیں جو فارسی زبان میں اہلِ اساورہ کہلاتے ہیں۔دربار نے انہیں اعزازی طور پر سونے کے کنگن دیئے ہوئے تھے۔

(3) ان دراندازوں (Infiltrators) کے لیے عربی زبان میں مہارت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

(4) ساتھ ہی یہ لوگ تاریخ عرب، روم اور فارس کی معاشرت سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔اس مقصد کے لیے زیادہ تر

ہنر مند افراد چنے گئے۔ ماہرین ریاضیات، سنار، بڑھئی، لوہار، ماہرینِ طب اور دیگر چالاک اور مکار لوگ۔

(5) ان خصوصیات کی بناء پر بظاہر مسلمان لیکن اندر سے مجوسی جاسوسوں نے مکہ، مدینہ، مصر، عراق، شام اور کوفہ و بصرہ میں بیٹھ کر اپنے اپنے شعبوں میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ حکومت کے حساس اداروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کیے۔ یہ لوگ اس مقصد میں کامیاب رہے۔

چین میں بیٹھ کر انہوں نے جو منصوبہ بنایا، وہ قابلِ داد ہے۔ انکے اصل محاذ دو تھے۔ ایک مسلم حکومت کی مرکزیت کو کمزور کرنا (یعنی خلفائے اسلام کا پے در پے قتل)۔ دوسرا مشن نظریاتی تھا۔ کہ مسلمانوں کو انکی الہامی کتاب قرآن سے دور کرنے کی تدابیر کی جائیں۔ ہماری سلطنتوں کا بیڑہ غرق دراصل اسی کتاب کی تعلیم نے کیا ہے۔ یہ قرآن ختم کر دو۔ اگر ختم نہیں کر سکتے تو کچھ ایسا کرو کہ مسلمان اس قرآن کو چھوڑ دیں۔

بزرسمر قندی جو شہنشاہِ ایران خسرو پرویز کا مشیرِ خاص تھا۔ اساورہ کمیٹی کا صدر تھا۔ اسکا نائب برزبان دونوں جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی تھے اور عالمی سیاست کے بھی ماہر تھے۔

یہ جذبہ لے کر ایرانی دانشور مسلمانوں میں آ کر گھل مل کر رہنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ عربوں سے اپنی شکست کا بدلہ لیا جا سکے۔

ایران کا شکست خوردہ گورنر ہرمزان جب زنجیروں میں جکڑا ہوا فاروقِ اعظمؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو ہرمزان سے امیر المومنین نے سوال کیا کہ ہرمزان کیا بات ہے کہ پہلے ہمیشہ تم لوگ عربوں کو پسپا کر دیتے تھے، لیکن اس بار شکست کھا گئے۔ اور حالت یہ ہے کہ عرب لوگ تمہارے پورے ایران کو فتح کر رہے ہیں اور تمہارا بادشاہ یزدگرد جان بچانے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔؟

ہرمزان نے جواب دیا کہ پہلے عرب اکیلے لڑتے تھے۔ لیکن اب انکے ساتھ انکا خدا بھی لڑا۔ دیکھیں ایرانیوں کی نگاہیں اسلام کی مرکزی قوت تک کیسے خوبی سے پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے اسلام کی اصل قوت کا راز کیسے پا لیا اور ہرمزان نے کیسے دو لفظوں میں اسے بیان کر ڈالا۔ بہت چالاک قوم تھی جس سے عرب سیدھے سادھے ہونے کی وجہ سے مار کھا گئے۔ اور بات بھی ٹھیک ہے۔ رب کا فرمان بھی ہے کہ:

أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ انفال۔آیت 19)

بے شک اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ الروم۔آیت 47)

اور مومنین کی فتح میں انکی مدد کرنا ہم پہ واجب ہے۔

ہرمزان نے جو یہ کہا تھا کہ اس بار عربوں کا خدا انکے ساتھ تھا، تو اسکا مطلب یہ نہیں تھا کہ خدا بھی تلوار اٹھا کر زمین پہ اترا اور عرب فوج میں شامل ہوگیا تھا۔ بلکہ اسکی بات کا مطلب یہ تھا کہ اس دور میں مسلمان اس خدا کی کتاب کا نظام نافذ کیے ہوئے تھے۔جسکا نتیجہ دنیاوی کامیابی کی صورت برآمد ہوتا تھا۔پس ایرانیوں نے طے کیا کہ اس کتاب کو مسلمانوں سے دور کیا جائے۔

خود علامہ اقبال نے اسے عجمی سازش کہہ کر پکارا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ فتح ایران کے بعد ایران مشرف با اسلام نہیں ہوا، بلکہ اسلام کو عجمی رنگ میں رنگ دیا گیا۔ بلکہ ڈبو دیا گیا۔کاش ایران فتح نہ ہوا ہوتا۔

دشمنوں سے کبھی گلہ نہیں ہوتا۔دشمن کا کام ہی دشمنی ہے۔ایرانیوں کو مسلمانوں سے چوٹ پہنچی تھی۔انہوں نے اسکا بدلہ تو لینا ہی تھا۔گلہ تو اپنوں سے ہے جو انکی لکھی ہوئی کتابوں کو ہزار سال سے صحائفِ آسمانی سمجھے بیٹھے ہیں، اور جب کوئی اس جانب توجہ دلاتا ہے تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

پرانی کہاوت ہے کہ ایک لکڑہارا کسی درخت کو کاٹ رہا تھا تو ساتھ ایک درخت نے اسے پوچھا کہ تم چپ کیوں ہو؟ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ تو وہ درخت بولا کہ میں احتجاج کیا کروں؟ مجھے لکڑہارے سے کیا شکوہ؟ دکھ اس بات کا نہیں کہ لکڑہارے کے کلہاڑے نے مجھے کاٹ کے رکھ دیا۔ بلکہ غم اور گلہ تو اس بات کا ہے کہ لکڑہارے کے کلہاڑے کے دستے میں جو لکڑی ہے، وہ میری ہی شاخوں کا ایک حصہ تھی۔

اسی طرح امین احمد المصری نے بھی اپنی کتاب ''الفجر الاسلام'' میں اس سازش سے پردہ اٹھایا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

> ایرانیوں کی اکثریت مسلمان ہوگئی تھی۔انہوں نے عربی سیکھ لی۔حتیٰ کہ دوسری ہی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو عربوں کی طرح بہترین عربی بول سکتے تھے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تمام باتوں میں عربوں کے برابر ہوگئے تھے۔ان کے عقائد عربوں جیسے نہیں تھے۔انکی تمنائیں، جذبات، رجحانات عربوں کی طرح نہیں تھے۔نہ انکی عقل عربوں جیسی تھی۔انہوں نے اسلام کو قبول تو کیا، لیکن اسلام کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔وہ اپنے پرانے دین کے جملہ عقائد سے الگ نہیں ہوئے تھے۔اپنے پرانے دین کے عقائد میں ہی وہ جوان اور بوڑھے ہوئے تھے۔انہوں نے عربی تو سیکھی، مگر اپنی قوم کے اشعار، عقائد، امثال اور حکم کو نہیں بھلا سکے۔اسلام میں ان اثرات کا واضح ترین نمونہ مذہبِ تشیع اور اہل تصوف کے ہاں

ملتا ہے۔عربی ادب اس کے بعد ایرانی ضرب امثال،کہانیوں،احکامات اور ایرانی تصورات وعقائد میں بری طرح ڈوب گیا۔

(الفجر الاسلام۔ازامین احمد مصری۔صفحہ 310)

پھر ایران کا ایک مشہور دانشور قاضی نور اللہ شوستری کہتا ہے کہ اصل قرآن تو ہم نے چوری کرلیا۔اب مسلمانوں کے پاس صرف ثوابوں والی کتاب رہ گئی ہے۔فارس کا جلال الدین رومی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔کہتا ہے:

ماذ قرآن مغذ رابرداشتم

استخواں راپیش سگاں انداختم

یعنی ہم نے قرآن سے مغز قسم کی چیز نکال لی ہے، بقایا ہڈیاں کتوں (مسلمانوں) کے آگے پھینک دی ہیں، کہ انہیں چاٹتے رہو۔

آئمہ ومحدثین کا اس سازش میں کردار

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے کہ:

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ

(سورہ النور۔آیت 12)

جب تم لوگوں نے یہ بے بنیاد بات سنی تھی تو مومن مرد وعورتوں نے اپنے دلوں میں کیوں نہ نیک گمان کیا کہ یہ تو صاف بہتان اور جھوٹ ہے؟

کیا یہ سوال ہم محدثین وفقیہ حضرات سے کرسکتے ہیں؟ جنکی جمع شدہ روایات کے مجموعوں میں ہزاروں کی تعداد میں جھوٹ موجود ہیں؟

سابقہ اقوام کے تجربات کی بناء پہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ سب سے پہلے قرآن کو ہی مٹایا جائے۔اسے کہیں طرح تلف کر دیا جائے۔لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا۔قرآن میں زیادتی یا نقص ممکن نہ تھا کیونکہ قرآن میں نقب لگانے کے تمام راستے اللہ نے یہ کہہ کر بند کر دئے تھے کہ ''ہم ہی اس کتاب کے نازل کرنے والے ہیں اور ہم ہی اسکی حفاظت کریں گے'' (سورہ الحجر۔آیت 9)۔

اس لیے انتقام لینے کے لیے دوسری ترکیب سوچی گئی کہ انکے خالص دودھ میں تھوڑا سا دہی ملا کر سارا دودھ خراب کر دیا جائے۔یعنی کسی طرح کوئی ایسی چیز تیار کی جائے جو قرآن کا متبادل ہوسکے۔اور مسلمان اس کی جانب لپک پڑیں اور قرآن کو

بھول جائیں۔یوں قرآن کا معاشی نظام اوردین انکی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ورنہ یہ مستقبل میں بھی سرمایہ داریت کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔پس ہوشیار اورزیرک دشمن نے منصوبہ تیار کرلیا۔

شیر کے ہاتھوں انسانی جان بچانے کے لیے اسکے آگے بھیڑ بکری ڈالی جاتی ہے تا کہ وہ اس بکری کی جانب لپک کر انسانی جان کو چھوڑ دے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ایرانی اماموں،فقیہوں اورمحدثین کی ایک فوج تیار کی گئی جنہوں نے قرآن کا بدل تیار کرنے کا کام بڑی عرق ریزی اورمحنت سے سرانجام دیا۔یہ ایک ایسا انتقام تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ انہوں نے ایسی ایسی کتابیں تیارکیں جن میں ایرانی مذاہب،فلسفہ جات،قدیم تصورات ونظریات اورغیر اسلامی نظریات کو اقوالِ رسول کا نام دیا گیا اورانکی اسناد تیار کر کے انہیں دیدہ زیب بنایا گیا کہ پڑھنے والے دیکھیں کہ مقدس ہستیوں کے ذریعہ یہ قصے سلسلہ بہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک جا پہنچتے ہیں۔یعنی رسول اللہ ﷺ کا قول ہیں۔پس مسلمانوں کے لیے یہ مقدس ٹھہریں۔خلافت کا تیاپانچہ تو وہ پہلے ہی رشدوہدایت کے میناروں (خلفاءراشدین) کوشہید کر کے کر چکے تھے۔اب روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔اس لیے اب ملوکیت کا دوردورہ تھا جسے صرف اپنے اقتدارکوطول دینے سے غرض تھی۔کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔پس یہ سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔جس کسی نے بھی قال الرسول اوکما قال کا نعرہ بلند کیا۔لوگ اسکے اردگرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔یہ بھی نہ سوچا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے،اسکی تحقیق ہی کر لی جائے۔تحقیق کوتو ملوکیت کے کارندے مذہبی پیشوائیت پہلے ہی حرام قرار دے چکے تھے۔

محدثین کی عزت وتکریم عوام کے دلوں میں بڑھتی چلی گئی،اسے دیکھ کرکئی دنیاوی عزت وشہرت کے خواہشمند لالچی لوگوں نے بھی حدیث کا پیشہ اختیار کرلیا اوراپنے پاس سے ہی روایات گھڑ کر سنانے لگ پڑے۔اس کام کے لیے من پسند اسناد ترتیب دینا بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔یوں احادیث کی روایت کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی اورمسلمان اس سیلاب میں ڈوب گئے۔ اس کام میں سب سے بڑی رکاوٹ حضرت عمر فاروقؓ کی ذات تھی جنہوں نے ہمیشہ احادیث جمع کرنے سے سختی سے منع کیا اوراحادیث کے مجموعے کہیں مل پانے پرنذرِآتش بھی کیے تھے۔اس لیے پہلے حضرت عمرؓ کوراستے سے ہٹایا گیا۔ان سے بھی ایرانیوں کی دشمنی عروج پہ تھی۔کیونکہ ایران انہی کی حکومت میں انکی دوراندیشی اوربصیرت کی وجہ سے فتح ہو پایا تھا۔ان کے قاتل ابولولوفیروز کوایران میں بابا شجاع (بہادر) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔وہاں اس ملعون کا فرضی مقبرہ بھی زیارت

گاہِ خاص و عام ہے۔ (The Mirage in Iran: Page)

ایران کے مشہور مورخ حسین کاظم زادہ نے بھی ایرانی سازش کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

جس دن سے سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ دوم کی جانب سے ایران کو فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا۔ ایرانی اپنے دلوں میں کینہ و انتقام کا جذبہ پالتے رہے۔ کینہ و انتقام کا یہ جذبہ کبھی کبھی شدت سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ لیکن شیعہ فرقہ کی بنیاد پڑنے پر یہ مکمل طور پر بے نقاب ہو گیا۔ ارباب علم و اطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد و ظہور میں اعتقادی مسائل اور نظری و نقلی اختلافات کے علاوہ ایک سیاسی مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر ننگے پاؤں پھرنے والے بادیہ نشین عربوں نے ان کی مملکت پہ قبضہ کیا ہے۔ اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کیا ہے۔ ہزاروں بے گناہ انسانوں کا قتل کیا ہے۔

(تجلیاتِ روح ایرانی در ادوارِ تاریخی از حسین کاظم زادہ)

مزید لکھتا ہے کہ:

ہمارے دانشمند بزرگوں کو نہ تو اولادِ فاطمہ سے کوئی عشق تھا نہ خاندان بنو امیہ سے کوئی دشمنی۔ نہ عباسؓ سے یاری تھی نہ علیؓ سے رشتہ داری۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عرب حکومت کا تختہ الٹ جائے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت و حکومت کو پھر سے بحال کیا جا سکے۔ چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علیؓ کے بعد ختم ہو گئی تھی اور امویوں کی خالص عربی حکومت اسلامی مرکزی حکومت تسلیم کر لی گئی تھی۔ اس طرح عرب عجم پر بری طرح مسلط ہو گیا تھا۔ پس ہمارے لیے واحد چارہ یہی تھا کہ ہاشمی بزرگوں کو اپنے ساتھ ملا کر انہیں امویوں کے خلاف بھڑکائیں۔ ہمارے بزرگوں نے یہی کیا۔ دنیائے اسلام میں ایران اول و آخر وہ واحد مثالی ملک ہے جس نے ملتِ اسلامیہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے نفاق و افتراق اور منافرت کی روش اختیار کی۔ ایران سے وحدتِ اسلامی کو ہمیشہ خطرہ رہا ہے۔ ایران کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول برحق ہے جو امیر لشکر ابو عبیدہ بن الجراحؓ سے منقول ہے:

”تم ایک ایسی سرزمین کی جانب جا رہے ہو جو مکر و فریب اور خیانت سے بھری ہوئی ہے۔ جس میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو شر کی ماہر اور خیر سے نابلد ہے۔“

ایرانی مجوسی قوم کی کاریگری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی کہ انہوں نے قرآن کے غیر متبدل احکامات کو ”عملِ رسول“ سے بدل دیا۔ اللہ کا حکم ہے کہ شادی کی عمر بلوغت کی ہے۔ جبکہ ان ایرانیوں نے چھ سال کی معصوم بچی سے نبی کا نکاح کروا کر

خلافِ قرآن عمل کروایا۔اور مسلمان آج تک اسے مانتے اور پڑھتے چلے آرہے ہیں۔انکے دارالعلوموں میں باقاعدہ ان خرافات کا ختم کرویا جاتا ہے۔اور یہ بیچارے اسے دین سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

یہ مختصر تاریخ اور ایرانی مفکرین کے اقوال شہادت کے طور پر صرف اس لیے پیش کیے گئے کہ یہ جو ذہنیت ہمارے ہاں پائی جاتی ہے کہ امام بخاری کا قصور نہیں، یہ بعد کے دشمنان کی کاروائیاں ہیں، بالکل غلط ہے۔اور اس کا کوئی ثبوت بھی آج تک کوئی پیش نہیں کرسکتا۔بیشک امام بخاری کے بعد بھی ان سب کتبِ احادیث میں بہت سی تحریفات ہوتی رہنے کا امکان بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔مگر امام بخاری کو بھی بالکل بری الذمہ قرار دینا بیوقوفی ہے۔جسکا ثبوت ایرانی سازش کی مختصر سی تاریخ اور ایرانی مفکرین کے اقوال واعترافات ہیں جو آج وہ کررہے ہیں۔

بہرحال سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہمیں اس بات پہ اپنی توانائیاں ضائع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ خلافِ قرآن مواد خود محدثین نے ہی شامل کیا تھا یا پھر انکی وفات کے بعد یہ عالمی استعماری عناصر کی کاروائی ہے۔

ہمارا مرکزِ نگاہ یہی اصول ہونا چاہیے کہ اسلام کے نام سے جو بھی خارج از قرآن مواد سامنے آئے گا، اسے عقلِ سلیم اور قرآنی اصولوں کے مطابق پرکھا جائیگا۔اور قرآن سے مطابقت کی بناء پر قبول اور عدم مطابقت پہ رد کیا جائیگا۔اگر یہ اصول سامنے رکھا جائے تو دشواریاں ہرگز بھی پیدا نہ ہوں اور بہت سے لمبے چوڑے بکھیڑوں سے امت کی جان چھوٹ جائے۔

اسی طرح اگر کوئی واقعہ ایسا ہے جو قرآنی تعلیم سے عین مطابقت رکھتا اور قرآنی اصولوں کا ترجمان ہے اور یہ امر ثابت بھی کردیا جاتا ہے تو پھر میرے خیال سے ایسا واقعہ راویوں اور کتب کی اسناد کا محتاج نہیں رہتا۔یہ اصول بالکل اس اصول کی مانند ہے کہ کوئی حکم یا واقعہ اگر خلافِ قرآن ثابت ہوجائے تو اسکی سند میں خواہ کیسے ہی بڑے بڑے نام موجود کیوں ہوں اور چاہے کسی بھی بڑی سے بڑی مستند کتاب میں پایا جاتا ہو، غلط قرار دے کر مسترد کیا جائیگا۔

Mohammad Hanif ..... Muhammad Shoaib

میں چاھوں گا کہ آپ اس پیج کی گفتگو کو دیکھیں ـــــــ تاکہ بہت سارے وہ سوالات ، جو صرف کسی کے رویوں کے وجہ سے آپ کے ذھن میں بسے ھیں ان کا جواب دیا جا سکے ـــــ

July 10 at 9:20pm · Like

حنیف صاحب سے یہاں جو غلطی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے محمد شعیب نامی شخص کو طالبِ علم سمجھ اور علم کا متلاشی سمجھ لیا ہے اور انہیں شکوہ ہے کہ کسی (القرآنک پاور) کے رویوں کی بناء پر انکے دلوں میں شبہات پیدا ہوئے ہیں اور وہ منکرین قرآن کو گالیاں دینے لگ پڑے ہیں۔

حنیف صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ محمد شعیب ہرگز بھی قرآنی طالب علم نہیں ہے۔ اور اسے کوئی باشعور انسان اور عقلِ سلیم رکھنے والا سمجھنا بھی پرلے درجے کی حماقت ہے۔ میں اسے بہت عرصہ سے جانتا اور سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے اس کے متعلق میری طرف سے بیان کردہ حقائق آپ اور دیگر قارئین کو طبعًا ناگوار گزریں، لیکن یہ حقیقت ہے جو بیان کر رہا ہوں۔

محمد شعیب نہ خود علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ دوسروں کو کچھ سکھا سکتا ہے۔ عجیب وغریب ذہنیت کا حامل یہ شخص سیکھنے سکھانے نہیں، بلکہ فیس بک پر محض ''ٹائم پاس'' کرنے کی غرض سے بیٹھتا ہے۔ اور اپنے برخلاف موقف رکھنے والوں پہ جذباتی طنز، تنقید بلا دلیل کرتے جانا اور بسا اوقات تمام اخلاقی حدود کو پار کرتے ہوئے شرمناک گالی گلوچ پہ اتر آنا اسکا من پسند پیشہ ہے۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ کسی بڑے چھوٹے کی اسکی نظروں میں عزت نہیں۔ میں نے اسے اپنی عمر سے بیس تیس برس بڑے لوگوں کی علمی گفتگو کے جواب میں ننگی گالیاں تک دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ کسی کا لحاظ نہیں رکھتا۔ آپ بھی کبھی اسکے سامنے کسی قدیم روایتی اسلامی تصور کو رد کیجیے جس کا یہ دیگر مسلمانوں کی طرح قائل ہو، پھر دیکھئے نظارہ۔

اس سے علمی گفتگو کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں میں تحقیق کرنے کا رجحان ہی نہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ مطالعہ کو وسعت دینا اسکی دینی ذمہ داری ہے۔ ورنہ جیسے یہاں فیس بک پر ہر فکر کا آدمی اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتا نظر آتا ہے، بحث ومباحثہ، نوٹس، مضامین، کتب اور علمی مکالمے سامنے آتے رہتے ہیں تو محمد شعیب جیسے لوگ تحقیق کیوں نہیں کرتے؟ اس نے کبھی خود سے حقائق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جن علما و منکرین سے اسے شکایت ہے، انکی کتب کیوں نہیں پڑھتا؟ ہر وہ شخص جس سے آپ کو اختلاف ہے، اسے تنقید کا نشانہ بنانے سے قبل اسے ایک بار پڑھ لینا چاہیے۔ لیکن کچھ لوگ تحقیق وغیرہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے۔ فطری طور پہ تنقیدی ذہنیت کے حامل ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دوسروں پہ نکتہ چینی کرنا ایک

آسان اور دلچسپ مشغلہ سمجھ کر اپنا لیتے ہیں۔

کسی مصور نے ایک بار ایک تصویر بنائی اور بنا کر بیچ چوراہے کے رکھ دی۔اور نیچے لکھ دیا کہ اس میں کوئی نقص ہو تو نشاندہی کریں۔شام کو وہ واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اسکی تصویر سینکڑوں نشانات سے بھری پڑی ہے۔اسے اس قدر تنقید دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔اس نے پھر سے نیچے ایک نیا فقرہ لکھ دیا کہ ''اس تصویر میں جن نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے، براہِ کرم انکی تصحیح بھی کر دی جائے۔اگلے روز وہ وہاں گیا تو کسی قسم کی تصحیح نظر نہیں آئی۔

دوسروں پہ نکتہ چینی کرنا بہت آسان کام ہے،لیکن انسان کے شعور اور عقل کا اندازہ تو تب ہی ہوتا ہے جب وہ نکتہ چینی کے بعد مدلل اور مفصل انداز میں مسائل کا حل پیش کرے۔یا اپنے موقف کا دلائل سے دفاع کرے۔جیسے میں نے حنیف صاحب کو معاشی معاملات میں مفاد پرستی کے جذبہ کا شکار ہو کر سہو کرتے دیکھا تو اپنے موقف کو اس کتاب کے ذریعہ دلائلِ قرآنی سے ثابت کیا۔اس بات کا فیصلہ بھی قارئین کریں گے کہ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔

قرآن بھی ہر مسلمان کو دینی معاملات میں عقل وشعور کے استعمال کے ذریعہ تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔لیکن ہمارے ہاں صدیوں سے عقل وخرد کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔مسلمانوں کی اکثریت دین میں عقل وشعور کے استعمال کو حرام سمجھتی ہے۔لیکن دورِ حاضر کے تقاضے یہ بتا رہے ہیں کہ تفکر وتدبر آج انتہائی ناگزیر ہو چکا ہے۔کاش کہ مسلمان اسکی اہمیت کو سمجھ کر اس پہ عمل پیرا ہو پائیں۔کیونکہ:

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

حقائق سامنے آنے کے بعد ردعمل کیا ہونا چاہیے؟

کتاب یہاں اختتام پذیر ہو چکی۔آخر میں میں محترم حنیف صاحب کو انکا ایک عزم یاد دلانا چاہوں گا جسکا اظہار وہ اکثر کرتے نظر آتے ہیں۔

Mohammad Hanif

اس ھی لیے التماس ھے کہ بات باھمی احترام اور رواداری کے جذبہ کے تحت ھو ـــــــ اور پھر سوال اپنی انا یا ھار جیت کا تو ھے ھی نہیں ۔ چاھتا ھوں کہ جیت ، کتاب اللہ کی ھو ـــــــ اللہ مجھے توفیق دے ۔ اور زعم علم ، اور خماری علم سے محفوظ فرمائے ـــــــ

Mohammad Hanif

ایک بات میں اور کہنا چاھتا ھوں ـ میرا ھرگز یہ دعویٰ نہیں ھے کہ میرا نکتہ نظر بلکل درست ھے یا حرف آخر ھے ـ مجھے بہت خوشی ھوگی اگر ھم اس موضوع پر سنجیدہ گفتگو کر سکیں ـ اور اس کے لیے باھمی احترام ، اور آداب ـ گفتگو کا خیال رکھنا ھوگا ـ ذاتیات کی بات نہیں ھوگی ـ اور اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ھوئے ، قرآن کریم کی متعلقہ آیات لگانی ھوں گی ـ صرف اپنا نظریہ ھی بیان کرنا کافی نہیں ھوگا ـــــــــ

چونکہ میرا مطمع نظر ، سیکھنا ھے ـ اس لیے جب تک گفتگو ، تعمیری ھوگی ، باوجود نکتہ نظر کے اختلاف کے ، باھمی احترام اور رواداری کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گا ، میں آپ سے مکالمہ جاری رکھوں گا ـ لیکن اگر کسی مرحلے پر بات ، ذاتیات پر آ جائے گی ـ یا کہیں باھمی احترام اور آداب گفتگو کو فراموش کر دیا جائے گا ، تو میں السلام علیکم کہہ کر ، رخصت ھو جاوں گا ـ

اللہ کریم ھم سب کی راھنمائی فرمائے ـــــــ سلامت رھیں

میں چاھتا ھوں کہ میرے محترم احباب ، صرف نظریہ ھی نہ پیش کریں ـ مجھے دلیل سے قائل کریں ـــ میں قائل ھونا چاھتا ھوں ـ لیکن دلیل سے ـــــــــ

Mohammad Hanif جہاں تک میرے کسی موقف سے اختلاف کی بات ھے ، تو یہ ھی تو میں چاھتا ھوں کہ ھم ایک دوسرے کی مدد کریں ـ

میرے موقف سے اختلاف آپ کا اور دوسرے دوستوں کا حق ھے ـ لیکن میری التماس ھوگی کہ بات صرف موقف سے اختلاف کے اظہار تک ھی محدود نہ رھے ـ

بلکہ اپنا نکتہ نظر بھی پیش کیا جائے ،

تاکہ درست بات سامنے آ جائے اور اگر کسی کا موقف درست نہ ھو تو وہ اپنی اصلاح کر سکے ـــــــــ

اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا ـــــــــ
سلامت رھیں

میں ھرگز ھرگز ، کسی کو ھرانے کا نظریہ نہیں رکھتا ـ ساری گفتگو کا مقصد صرف اور صرف سچ اور حق کو سامنے لانا ھے ـ

یہ ھی وجہ تھی کہ میں نے آپ کی ثالث والی تجویز پر معذرت کی ـ

کیوں کہ میں کسی سے جیتنا نہیں چاہتا ـــــــــ بلکہ چاھتا ھوں کہ ھم کتاب اللہ کو کسی اور کی عینک سے نہیں ، بلکہ اپنے شعور اور عقل سے سمجھیں ـ

ممکن ھے ، میرا نکتہ نظر درست نہ ھو ـ

لیکن میرے نکتہ نظر کو غلط ثابت کرنے کے لیے ، قرآن کا حوالہ اور عقل کی بارگاہ سے دلیل کی ضرورت ھوگی ـ

اور یقین کریں ، قرآن کریم کی ایک آیت بھی سامنے آ جائے ، تو خاکسار رجوع کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں کرے گا ـــــــــ

قرآنی حقائق اب تک کی پیش رفت میں نہایت تفصیل سے سامنے آ چکے۔ میں نے قرآنی نظامِ معیشت کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ہر ایک معاملہ میں قرآن کریم سے ٹھوس اور نا قابلِ تردید حوالہ جات پیش کیے۔ چنانچہ پرامید ہوں کہ تمام قارئین یہ کتاب پڑھ کر نہایت خوش اور مطمئن ہونگے۔ یہی توقع مجھے حنیف صاحب سے ہے کہ وہ بھی اس کتاب کے ذریعہ نا قابلِ تردید قرآنی حقائق سامنے آجانے کے بعد اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرلیں گے۔ انہیں کرنا بھی چاہیے کیونکہ وہ غلطی پہ تھے اور انکی غلطیاں ثابت کرنے کے لیے مجھے اس مضمون کا پورا ایک باب مختص کرنا پڑا۔ اب چونکہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو چکا ہے اس لیے امید ہے کہ محترم حنیف صاحب اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے سابقہ سرمایہ دارانہ موقف سے رجوع فرمالیں گے۔ حنیف صاحب خود بارہا اپنا یہ نظریہ پیش کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ ہماری یا انکی انا کا نہیں، بلکہ کتاب اللہ کی عزت وتکریم کا مسئلہ ہے۔ جیت کسی انسان کی نہیں، بلکہ صرف کتاب اللہ کی ہونی چاہیے۔ اور اس بات کا فیصلہ بھی قارئین کریں گے کہ میں اپنی اس کاوش میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔

اگرچہ حنیف صاحب کی جانب سے اچھے ردعمل کی توقع ہے۔ لیکن اگر روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا گیا تو پھر وہ جان لیں کہ کتابِ ہذا کا حصہ دوم پیش کرنے میں بھی مجھے کوئی عذر لاحق نہ ہوگا۔ کیونکہ میں تو ایک مخلص، پرعزم اور مکمل طور پر Devoted انسان ہوں اور خدا کے دین کے اس دشمن (سرمایہ داریت) اور اسکے ایجنٹوں کا علمی تعاقب ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ انشاءاللہ۔

آپ سب کا مخلص

القرآنک پاور

منتخب کلام

بندہ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام ِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار ِ حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھاگیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم ِ جہاں کا اورہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

(حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ)

خلق ِ خدا کی گھات میں رند وفقیہہ و میروپیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

(''فرشتوں کا نظام سرمایہ داری کے خلاف احتجاج'' فرشتوں کا گیت ۔بال جبریل از علامہ اقبال)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا ء کے درودیوار ہلادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ ء گندم کو جلا دو

(''فرشتوں کے احتجاج پر خدا کا جواب''۔بال جبریل از علامہ اقبال)

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ ِ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات
(لینن کا شکوہ۔بال جبریل از علامہ اقبال)

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوز نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کر عطا جدتِ کردار
جو حوف ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار
(ضربِ کلیم از علامہ اقبال)

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھردی موتیوں سے خوشہِ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں،میری نہیں
(بال جبریل از علامہ اقبال)

دنیا کی تاریخ گواہ ہے
عدل بنا جمہور نہ ہوگا
عدل ہوا تو دیس ہمارا
کبھی بھی چکنا چور نہ ہوگا
عدل بنا کمزور ادارے
عدل بنا کمزور اکائیاں
عدل بنا بے بس ہر شہری
عدل بنا ہر سمت دہائیاں
دنیا کی تاریخ میں سوچو
کب کوئی منصف قید ہوا ہے؟
آمر کی اپنی ہی انا سے
عدل یہاں ناپید ہوا ہے
عدل کے ایوانوں میں سن لو
اصلی منصف پھر آئیں گے
روٹی کپڑا اور گھر اپنا
لوگوں کو ہم دلوائیں گے
آٹا بجلی پانی ایندھن
سب کو سستے دام ملے گا
بے روزگاروں کو ہر ممکن
روزگار اور کام ملے گا
ریاست ہوگی ماں کے جیسی
ہر شہری سے پیا ر کرے گی
فوج لگے گی سب کو اچھی
جب سرحد کے پار رہے گی
جاؤ جاؤ سب سے کہہ دو
محمد علی جناح نے لوگو

دیکھا تھا جو سپنا سب کا
ساری دنیا پر اب ہوگا
سایہ ایک اور ایک ہی رب کا
وہ رب سچا ،وہ رب سانجھا
وہ ہر مذہب ہر دھرم کا رب ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی
ہر انساں کے کرم کا رب ہے
سانجھا مالک ،سانجھا خالق
اسکے در پہ سب حاصل ہے
عدم تشدد اسکا رستہ
امن ہمارا مستقبل ہے
ظالم اور غاصب کی دشمن
جنتا اب سے عیش کرے گی
مظلوموں کی آخر
جاری جدو جہد رہے گی
رستہ تھوڑا ہی باقی ہے
دیکھو دیکھو وہ منزل ہے
ظالم ڈر کے بھاگ رہا ہے
جیت ہمارا مستقبل ہے
جیت ہمارا مستقبل ہے۔

(کل آج اور کل۔از چوہدری اعتزاز احسن سابق صدسپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن)

رہیں گے نہ ظالم جو جاگے غریب
نصر من اللہ وفتح قریب
مرے نوجوانو ، کرو کچھ تو غور
مسلط ہیں ہم پہ یہ دنیا کے چور

لٹیروں کے ہاتھوں میں ملت کی ڈور
کب آئے گا امن و شرافت کا دور
اٹھو گر بنانا ہے اپنا نصیب

جو چاہیں کہ بنجر یہ دھرتی رہے
چمن پہ خزاں راج کرتی رہے
تجوری وڈیروں کی بھرتی رہے
لٹیروں کی قسمت سنورتی رہے
اب ان کا ہے یومِ حساب عنقریب
نصر من اللہ وفتح قریب

دیارِ بدی کو اجاڑے چلو
برائی کے پرچم اکھاڑے چلو
مقدر عدو کا بگاڑے چلو
گرا دیجیے ہر ستم کی صلیب
نصر من اللہ وفتح قریب

ہیں ہم انقلابِ وفا کے امین
اللہ پہ بھروسہ نبی ﷺ پہ یقین
حکومت سے شاہوں سے ڈرتے نہیں
ہمارے لیے ہی ہے فتحِ مبین
لکھی جاچکی ہے شکستِ رقیب
نصر من اللہ وفتح قریب

سیاست کے افکار بدلیں گے ہم
قیادت کا معیار بدلیں گے ہم

روایات و کردار بدلیں گے ہم
اس امت کے سالار بدلیں گے ہم
بڑھاؤ قدم اب ہے منزل قریب
نصر من اللہ وفتح قریب

بدلتے ہیں بہروپ بہروپیے
لبادوں میں لپٹے ہوئے بھیڑئے
حقیقت کو دھوکے کو پہچانئے
جلاتے ہیں ہم آندھیوں میں دئے
سحر کے اجالوں کے ہیں ہم نقیب
نصر من اللہ وفتح قریب

یہ کیا سلطنت کیسی سرکار ہے
فقط جھوٹے نعروں کی بھرمار ہے
امیروں کی دولت کا انبار ہے۔غریبوں
کا جینا بھی دشوار ہے
الٹ دیجئے یہ نظامِ عجیب
نصر من اللہ وفتح قریب

نہ بادِ مخالف سے گھبرائیں گے
قدم انقلابی بڑھے جائیں گے
تلاطم سے طوفاں سے ٹکرائیں گے
قہر بن کے دشمن پہ چھاجائیں گے
فتح بن چکی ہے ہمارا نصیب
نصر من اللہ وفتح قریب

اے افضال وہ دن ضرور آئے گا
کہ مظلوم و مجبور مسکائے گا
ستم گر کا تختہ الٹ جائیگا
علم کملی والے کا لہرائے گا
دعائیں سنے گا اللہ مجیب
نصر من اللہ وفتح قریب
(محمد افضال)

کب ان کے ستم سے کبھی لاچار ہوئے ہیں
پہلے بھی ستم ہم پہ کئی بار ہوئے ہیں
تم ظلم غریبوں پہ ذرا سوچ کے کرنا
اب ہاتھ قلم کار کے تلوار ہوئے ہیں
مزدور کے ہاتھوں میں ہے قوموں کا مقدر
سب ان کے سبب صاحب ِ دستار ہوئے ہیں
سب کچھ انہیں حاصل نہیں قدرت کی طرف سے
حق مار کے لوگوں کا یہ ''زردار'' ہوئے ہیں
کل ان کا تکبر اسی مٹی میں ملے گا
یہ آج جو دولت کے پرستار ہوئے ہیں
اس درد کی دولت کو یہاں کون خریدے
اک ہم ہی فقط اسکے خریدار ہوئے ہیں
رسوا ہوئے دنیا میں وہ تاریخ کے ہاتھوں
جو لوگ مراتب کے طلبگار ہوئے ہیں
یہ ظلم و ستم ان کا نئی بات نہیں ہے
ہم پر ہی مہربان وہ ہر بار ہوئے ہیں
(ڈاکٹر طاہر شبیر)

جس جواں کے سینے میں زلزلے نہیں ہوتے
اس جواں کے لہجے میں دبدبے نہیں ہوتے
اک ذرا کرو ہمت دنیا بھر کے مظلومو
ظالموں میں دیکھا ہے حوصلے نہیں ہوتے
جنگ لڑنا پڑتی ہے اپنے زور ِ بازو پر
زندگی کے میداں میں معجزے نہیں ہوتے
اپنی اپنی محنت کا پھل سبھی کو ملتا ہے
آسماں سے قسمت کے فیصلے نہیں ہوتے
جتنے چاہیں دولت کے ڈھیر بھی لگالیں وہ
بے ضمیر لوگوں کے مرتبے نہیں ہوتے
یا وہ پکڑے جاتے ہیں جو کہ کچھ نہیں کرتے
یا وہ جن کے اوپر تک رابطے نہیں ہوتے
جو درخت خالی ہوں پھول اور پتوں سے
ان پہ پنچھیوں کے بھی گھونسلے نہیں ہوتے
بہہ رہا ہے اتنا خوں شہر میں کہ لگتا ہے
جنگلوں میں اب شائد بھیڑیے نہیں ہوتے
جب سے ہجر سے خالدؔ کر لیا ہے سمجھوتہ
تب سے میری آنکھوں میں رتجگے نہیں ہوتے

لہو کے چشمے رگوں سے مری ابلتے ہیں
کوئی تو دیکھے جو اس دل میں روگ پلتے ہیں
اجالے اتنے بھی سستے نہیں رہے اب تو
ہمارے خون ِ جگر سے چراغ جلتے ہیں
بہک جو جاتے ہیں جانے وہ کون ہوتے ہیں
ذرا سی پی لیں تو ہم لوگ پھر سنبھلتے ہیں

گداز دل پہ ہی اترے وحی محبت کی
کٹھور دل میں یہ ارمان کب مچلتے ہیں
شبانہ روز کی محنت کی بس ضرورت ہے
وطن کے کھیت تو لعل و گہر اگلتے ہیں
کہیں بھی ہوتا نہیں شائبہ حقیقت کا
عقیدے جھوٹ کی بیساکھیوں سے چلتے ہیں
جو اب بھی سمجھیں روایت کو معتبر خالدؔ
یہی وہ لوگ ہیں قرآں کو جو بدلتے ہیں

تنہا کہیں رہنے کی اجازت نہیں دیتا
جی بھر کے مجھے رونے کی فرصت نہیں دیتا
مرعوب سا رہتا ہے یہ دل سامنے اس کے
بزدل ہے بہت اذن ِ بغاوت نہیں دیتا
فاتح بنے اپنے ہی وطن کا جو سپاہی
سرحد پہ وہ پھر داد شجاعت نہیں دیتا
آجائے جو پیغام اجل لے کے فرشتہ
انسان کو پھر توبہ کی مہلت نہیں دیتا
بندوں کا بنایا ہوا آئین کہیں بھی
کمزور کو جینے کی ضمانت نہیں دیتا
پتھر سے بنے جاتے ہیں ہم لوگ بھی خالدؔ
دکھ جیسا ہو ، جتنا ہو،اذیت نہیں دیتا

الفاظ کی مہمیز سے گھائل نہیں ہوتے
جو اپنے لئے حور شمائل نہیں ہوتے

ہر ایک ہی رہبر نے نگاہوں کو چرایا
اتنے تو غریبوں کے مسائل نہیں ہوتے
سمجھاتے ہیں پھر انکو زمانے کے حوادث
جو لوگ کسی بات سے قائل نہیں ہوتے
وہ جن کو خدا مان کے پوجا تھا ہمیشہ
وہ سنگ مری راہ میں حائل نہیں ہوتے
لاکھوں میں کوئی ایک ہی جچتا ہے نظر میں
ہم یوں ہی کسی پر کبھی مائل نہیں ہوتے

مکر وفریب جھوٹ سے واقف نہیں ہیں ہم
صد شکر ہے کسی کے مخالف نہیں ہیں ہم
لمبی قطار دیکھ کے گھبرائیں کس لیے؟
آٹے کے اور چینی کے صارف نہیں ہیں ہم
کیا فکر ہے جو قد سے بھی آگے نکل گیا
سائے کو بڑھتا دیکھ کے خائف نہیں ہیں ہم
کس زعم میں کریں گے قیادت عوام کی
جب اپنے آس پاس سے واقف نہیں ہیں ہم
لوگوں کو ہم عذاب سے کیوں باخبر کریں
بیگار میں لیے ہوئے ہاتف نہیں ہیں ہم
میدان ِ کارزار میں اتریں گے شان سے
اغیار کی سپاہ سے خائف نہیں ہیں ہم
خالدؔ نہ تیرگی ہو تو ہے روشنی فضول
یوں تیرگی کے اتنے مخالف نہیں ہیں ہم

میں قتیلِ جرمِ معاش ہوں ،میری زندگانی ہے معجزہ
غمِ روزوشب سے نجات دے، مجھے اور دے کوئی مشغلہ
گو مریضِ جلب مفاد ہوں،مرا مسئلہ نہیں شاعری
کوئی ایسا کام بتا مجھے،رہے ہر طرف مرا تذکرہ
نہ تو پہلے عشق جنون تھا،نہ ہی آج عشق جنون ہے
جہاں جان جانے کا خوف ہو،کرے کوئی ایسا نہ تجربہ
جسے سن کے روح پھڑک اٹھے،مرا جسم و جان مہک اٹھے
کوئی راگ ایسا الاپ دے،کوئی گیت چھیڑ دے مطربہ
رگِ جان سے بھی قریب تھا، مرا ہم نفس حبیب تھا
کبھی وہ جو میرا رقیب تھا، وہی آج دیتا ہے حوصلہ
مرے دیس کے سبھی رہنما مریں اجتماعی یہ موت سب
انہیں رونے والا نہ ہوکوئی،انہیں پیش آئے یوں حادثہ
یہ بساط جو ہے بچھی ہوئی، ہے شکست خوردہ نظام کی
اسے چل پڑے ہیں لپیٹنے،کہیں لگنے والا ہے قہقہہ